کتاب العروج
تہذیب کے قرآنی سفر کا ایک چشم کشا تذکرہ
راشد شاز

کتاب العروج

تہذیب کے قرآنی سفر کا ایک چشم کشا تذکرہ

کتاب العروج

تہذیب کے قرآنی سفر کا ایک چشم کشا تذکرہ

راشد شاز

ملّی پبلی کیشنز، نئی دہلی-۲۵

سالِ اشاعت ۲۰۱۲ء

ISBN 978-81-87856-28-3

نامِ کتاب : کتاب العروج
مصنف : راشد شاز
اشاعت اول : ۲۰۱۲ء
قیمت : پانچ سو روپئے (-/Rs. 500)
مطبع : باسکو سوسائٹی فار پرنٹنگ، نئی دہلی، ۲۵
ڈیزائننگ : دلشاد حسن

ناشر
ملّی پبلی کیشنز
ملی ٹائمز بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵
Milli Times Building, Abul Fazl Enclave,
Jamia Nagar, New Delhi-25
Tel:. +91-11-26945499, 26946246
Fax: +91-11-26945499
Email:millitimes@gmail.com
www.barizmedia.com

فہرست

"ایک نئی ابتدا بالکل ہی نئے انقلابی اقدامات کی طالب ہے۔ غور وفکر کے پرانے سانچے جب تک نہیں ٹوٹتے ایک نئے شاکلے کی تشکیل نہیں ہوسکتی۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ آج جب ہمارے علمی التباسات اور منہجی انحرافات پر کوئی ہزار سال کا عرصہ بیت چکا ہے نئے اقدامات کے لیے کم سے کم شرط ایک نئے دماغ کی تیاری ہے جو یقینا پرانی کتابوں کے مطالعہ سے تیار نہیں ہوسکتا۔ یہ نیا دماغ تشریح وتعبیر کے گھسے پٹے طریقوں کے بجائے قرآن مجید کو ایک نشانِ ہدایت کے طور پر کچھ اس طرح برتنے کا اہل ہوگا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی شاہراہ وحی کی تجلّیوں سے جگمگا اٹھے۔ آیات احکام کے ساتھ ساتھ آیات اکتشاف بھی اس کی توجہ کا محور ہوگا، گویا پوری کتابِ ہدایت کو ایک وحدت رسالہ کے طور پر برتنے کی طرح ڈالی جائے گی اور اس طرح جعلوا القرآن عضین کی موجودہ صورت حال کا خاتمہ ہوسکے گا۔"

پیش لفظ

زندگی امکانات کا ایک لامحدود سمندر ہے۔ اب یہ فرد پر منحصر ہے کہ وہ اپنی محدود زندگی کو لامحدود امکانات سے کس حد تک مزین اور مرصع کرنے کی توفیق پاتا ہے۔ ہر شخص اپنے آپ میں ایک امکانی بادشاہ ہوتا ہے، لیکن بادشاہ صرف وہی لوگ ہو پاتے ہیں جن پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور جن پر یہ حقیقت منکشف نہیں ہو پاتی وہ بادشاہ کے ابرو واشارے پر اپنی زندگی گزار دیتے ہیں اور اس کی مصاحبی کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں جب بعض سیاہ زادوں اور غلام زادوں کو اپنے اندرون میں خوابیدہ بادشاہ کا ادراک ہوا اور وہ چشم زدن میں غلام سے بادشاہ بن بیٹھے۔ گویا دنیا میں بڑی سے بڑی تبدیلی خواہ وہ فرد کی سطح پر ہو یا اقوام وملل کی سطح پر، یہ بنیادی طور پر ہمارے طرز فکر کی رہین منت ہوتی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں جن لوگوں نے اقوامِ عالم پر حکومت کی ہے، انھوں نے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ فرد کے قلب ونظر پر کچھ اس طرح پہرہ بٹھا دیا جائے کہ وہ اپنی اصل قیمت اور قوت سے ہی ناآگاہ رہے۔ روایتی بادشاہت نے اگر خود کو شمس وقمر کے خانوادے سے بتایا یا الوہیت کا دعویٰ کیا تو چرچ نے خدا کے نمائندے کی حیثیت سے قلب ونظر پر پہرہ بٹھانے کی کوشش کی اور یہی کام مشائخیت نے کبھی آلِ بیت کے حوالے سے اور کبھی راست مشاہدۂ حق کے دعویٰ کے ذریعہ انجام دینے کی کوشش کی۔ اسلام کی دعوت بنیادی طور پر قلب ونظر کی آزادی کی دعوت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد ایک ایسی حریت فکری سے عبارت ہے، جسے قرآن **ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم** سے تعبیر کرتا ہے۔

خیال قوت کا لامحدود خزانہ ہے۔ انقلاب کا پہلا بیج اور ایجاد واختراع کا پہلا موہوم خاکہ عالم خیال میں ہی وجود میں آتا ہے۔ خیالوں میں گم خاموش بیٹھا ایک نئی ترکیب کا متلاشی اپنی خاموشی سے جو اتھل پتھل پیدا کرسکتا ہے اس کا مقابلہ

نعرۂ انقلاب بلند کرنے والے بے ہنگم مظاہرین نہیں کرسکتے۔ ترکیبوں کی اختراع یا کسی نئے خیال کی تعمیر عجب نہیں کہ ایک فجر جدید کا عنوان بن جائے اور شاید اسی لیے مروّجہ نظام فرد کو اس بات کی فرصت اور اجازت کم ہی دیتا ہے کہ وہ نئے خیال کی آسائش کا لطف لے سکے۔ یہ تو تھی خیالِ محض کی بات جس کی ذرا سی الٹ پھیر غلام کو بادشاہ کے منصب پر فائز کرسکتی ہے۔ مجرد خیال یا غور وفکر سے آگے بلکہ اس سے اہم تر ایک اور شئی ہے جسے ہم دائرۂ خیال یا دائرۂ فکر کا نام دیتے ہیں یعنی غور وفکر کا وہ ڈھانچہ جو فرد کو کائنات میں ایک معنویت عطا کرتا ہے۔ یہ دائرۂ فکر جتنا توانا ہوگا اور اس کی بنیاد جس قدر علم و آگہی پر استوار ہوگی اسی قدر فرد کے نمو اور اس کے ارتقاء کے امکانات وا ہوتے جائیں گے۔ قرآن مجید نے غور وفکر کے اس ڈھانچے کے لیے **الدین** کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اپنے ماننے والوں پر یہ حقیقت واضح کردی ہے کہ خدا کے نزدیک الاسلام یعنی والہانہ اور غیر مشروط سپردگی کے علاوہ کوئی اور طریقۂ زندگی قابل قبول نہیں ہے۔ اسے دینِ حق کہئے یا دینِ قیم یہ جب تک اپنی اصل حالت پر قائم رہا متبعین محمدؐ اس اعتماد سے سرشار رہے کہ وہ آخری نبی کی امت کی حیثیت سے اب تاریخ کے آخری لمحہ تک امینِ کائنات اور اقوامِ عالم کی سیادت کے منصب پر فائز ہیں۔ انھیں صاف محسوس ہوتا تھا کہ تاریخ کی لگام ان کے ہاتھوں میں تھما دی گئی ہے اور اس سفر میں وحیٔ ربانی کی تجلیاں مستقل ان کی رہنمائی کررہی ہیں۔

نزولِ قرآن نے جس عقلی دائرۂ فکر کی تشکیل کی تھی اس کا منطقی لازمہ تھا کہ آنے والے دنوں میں انسانی تہذیب تسخیر و اکتشاف کی غلغلہ انگیزیوں سے گونج اٹھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اکتشافی تحریک کے اس ربانی قافلے نے فارس وروم کی قدیم تہذیبوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ہند اور یونان کے قدیم علوم بلکہ کہہ لیجئے کہ انسانی تہذیب کی کل جمع پونجی تحلیل و تجزیہ کی میز پر لے آئی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے عالمِ اسلام کا وسیع وعریض خطہ اکتشافی تمدن کی ضوفشانیوں سے جگمگا اٹھا۔ حرفت و زراعت، سفر وحضر، بحر و بر، دور پر اسرار آسمانوں اور سطح سمندر کے مہیب سناٹوں میں گویا ہر طرف اکتشافی تمدن نے اپنی کمندیں کچھ اس طرح ڈالیں کہ انسانی تہذیب ایک مسرت آمیز طربناکیوں سے سرشار نظر آنے لگیں۔ اس دوران عالم اسلام اپنے داخلی سیاسی خلفشار، فقہی نزاعات اور مسلکی خانہ جنگیوں سے دوچار بھی ہوا، لیکن اکتشافی قافلے کو قرآنی دائرۂ فکر کے قیام سے جو ایک بار مہمیز مل چکی تھی سو وہ رو کے نہ رکتا تھا۔ اموی اور عباسی سلطنتیں تاراج ہوئیں۔ مسلمانوں کی سیاسی وحدت عباسی بغداد، فاطمیین کے قاہرہ اور اندلس کے امویوں میں منقسم ہوگئی۔ پھر آگے چل کر ترکوں، صفویوں اور مغلوں نے اپنے اپنے دائرۂ اثر میں عالم اسلامی کو منقسم کرڈالا، لیکن تب بھی اس چراغِ خموش میں اتنی تابانی باقی تھی کہ اس پر ایک مدت تک دنیا کو اصل روشنی کا گمان ہوتا رہا۔ سترہویں صدی کے آخر تک صورت حال یہ تھی کہ مسلمان اپنے تمام التباسِ فکر و نظر کے باوجود ویانا کے دروازوں پر دستک دیتے اور جرمنی، ہنگری اور اندرونِ یورپ کی دوسری ریاستیں ترکوں کی ہیبت سے لرزہ براندام رہتیں۔ ایک طرف زوال پذیر سیاسی جاہ وحشم کی یہ جلوہ سامانیاں تھیں اور دوسری طرف ایک اساطیری، غیر عقلی اور غیر قرآنی دائرۂ فکر رفتہ رفتہ ہمیں اپنے نرغے میں لے رہی تھی۔ ۱۵۸۰ء میں جب علمائے اسلام کے فتاویٰ اور

عوام کے اصرار پر استنبول میں دنیا کی سب سے بڑی رصدگاہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں ڈھائی جارہی تھی تو گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ عالمِ اسلام میں اکتشافی ذہن کی موت واقع ہو چکی ہے۔

یہی وہ لمحہ تھا جب خدا اور انفس و آفاق کے مابین اس توازن کے ادراک سے ہم غافل ہو گئے جس کی بنا پر قرآن نے مسلم ذہن کی تعمیر کی تھی اور جس کے سبب ہمیں کائنات کسی ناقابل فہم خلقِ باطل کے بجائے ایک سوچا سمجھا مانوس سا منصوبہ لگتا جس میں رنگ بھرنا ہمارا کارِ منصبی تھا۔ اکتشافی ذہن سے اساطیری ذہن کی طرف ہماری مراجعت کچھ اس طرح دبے پاؤں ہوئی کہ ہمارے بڑے بڑوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہو پایا۔ جب علومِ شرعی کے حوالے سے کوئی ڈیڑھ سو سے پانچ سو آیات کو آیاتِ احکام کے طور پر تعلیم و تعلّم کے لیے منتخب کیا جا رہا تھا اور بقیہ قرآن یا آیات اکتشاف ہمارے محور و مرکز سے معطل کی جا رہی تھیں، اس وقت شاید کسی کو یہ اندازہ نہ رہا ہو کہ آنے والے دنوں میں آیاتِ اکتشاف کی معطلی ہم پر ایک اساطیری اور غیر عقلی طرز فکر کا دروازہ کھول دے گی۔ علم شرعی کا تصور فی نفسہٖ ایک بحرانی تاریخ کا پیدا کردہ تھا۔ کسے پتہ تھا کہ علم کی ثنویت آنے والے دنوں میں ایک دائمی اور تقدیسی حیثیت حاصل کر لے گی۔ اپنے عہد میں شافعی اور مالکی حلقے اوزاعی، ثوری اور طبری حلقوں سے مختلف نہ تھے، پھر کسی کے ذہن میں یہ بات کیسے آتی کہ آنے والے دنوں میں دوسرے ائمہ کے حلقے یا ان کا مدرسہ فکر تو تاریخ کے صفحات میں گم ہو جائیں گے، البتہ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی خیموں کو دائمی فقہی حوالوں کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ اسی طرح جو لوگ قوارع القرآن اور مجرب آیات کے حوالے سے قرآن کے اصل پیغام اور اس کی جلالت پر پہرے بٹھا رہے تھے اس کی اصل سنگینی کا اندازہ کرنا بھی ان ایام میں مشکل تھا جب اکتشافی ذہن کا سفر ان تمام مزاحمتوں کے باوجود جاری تھا۔ آگے چل کر تعویذ و طلسم نے ہمارے عقلی طرزِ فکر کو اس حد تک پراگندہ کر دیا کہ عثمانی خلفاء نے دافع بلیات اور حفاظت کی خاطر اپنے ملبوسات پر قرآن مجید نقش کروانا عین دینی عمل جانا۔ آیاتِ قرآنی کے طلسماتی خواص کی عمومی اشاعت اور مقبولیت سے عالم اسلام کا کوئی خطہ خالی نہ رہا۔ البتہ جب ختم بخاری کی ہر تقریب دشمن کے حملوں کو پسپا کرنے میں ناکام رہی تو ہمیں اندازہ ہوا کہ زمین ہمارے پیروں سے نکل چکی ہے اور ایک اساطیری طرز فکر نے پوری طرح ہمیں اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ حاملینِ قرآن کے ہاتھوں انکارِ قرآن کے اس سنگین جرم کے بعد منصب سیادت سے ہماری معطلی فطری تھی۔

دوسری طرف صقلیہ اور اندلس کے دریچوں سے آنے والا اکتشافی طرز فکر عیسائی یورپ کو مسلسل ایک انبساط انگیز کیفیت سے دوچار کر رہا تھا۔ دسویں صدی سے لے کر سولھویں صدی تک علومِ عربیہ یعنی اکتشافی علوم کی کتابیں مسلسل لاطینی اور دوسری مقامی یوروپی زبانوں میں ترجمہ ہو رہی تھیں۔ مسلمانوں کے علم و تمدن نے عیسائی یوروپ کی کچھ اس طرح تقلیب کی کہ اکتشافی علوم تو کجا وہاں مذہب اور مطالعہ مذہب کے طور طریقے بھی یکسر بدل کر رہ گئے۔ پروٹسٹنٹ تحریک کے نتیجہ میں چرچ کو بالآخر اصلاح کا آغاز کرنا پڑا۔ ایک بار جب فکر و نظر کے پرانے ڈھانچے پر سوالیہ نشان لگ گیا تو آنے

والے دنوں میں مختلف قسم کی فکری اور سیاسی تحریکوں حتیٰ کہ بائبیل کے طالب علمانہ اور تنقیدی مطالعہ کی گنجائش بھی پیدا ہوگئی۔ گویا یہ کہہ لیجئے کہ مشرق میں جب اکتشافی قافلہ مست خرامی کا شکار تھا، اسی دوران عربی کتابوں کے لاطینی ترجموں نے مغرب کو ایک طربناک کیفیت سے دوچار کر رکھا تھا۔ اٹھارویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد تو صورت حال کچھ ایسی ہوگئی گویا ہر طرف سے

آ رہی ہو دمادم صدائے کن فیکوں

یہی وہ عہد ہے جب منصبِ سیاست سے خود ہمارے ہاتھوں ہماری معطلی عمل میں آئی اور ہمارے غیاب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مغرب نے اپنی مفروضہ تاریخی عظمت وسطوت اور نسلی برتری کا اسطورہ تراشا اور یہی وہ عہد ہے جب سرمایہ داری کے ہاتھوں اکتشافی تحریک کے استحصال کا عمل شروع ہوا۔ مکروہ استعمارانہ عزائم نے مغرب کو نئی تاریخ لکھنے پر مجبور کیا۔ نئے سماجی اور عمرانی علوم وضع کیے گئے جن کا مقصدِ وحید مغرب کی سفید فام اقوام کی تہذیبی برتری اور ان کے تہذیبی مشن کے تبلیغ و توسیع کو جواز فراہم کرنا تھا۔ انیسویں صدی کا یہ پروپیگنڈہ اتنا پرشور اور ہنگامہ خیز تھا کہ اس ہنگامے میں کسی متبادل نقطہ نظر کے سننے اور سمجھنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مغل ہند سے لے کر خلافت عثمانی کی وسیع وعریض سرزمین اس موجِ بلاخیز کی زد میں تھی۔ مزاحمت کی تحریک میں جو لوگ اصحابِ سیف کی حیثیت سے سامنے آئے ان کے پاس اتنا موقع کہاں تھا کہ وہ علمی دلائل و براہین کی نئی جوت جگاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد عالم اسلام کے مغرّب (Westernized) اہل دانش یہ سمجھنے لگے کہ جدید دنیا جیسی کہ وہ ہے اسے مغرب نے بنایا ہے۔ مغرب ہی تہذیب کا فطری اور ازلی امام ہے، جس کی اتباع میں اقوام مشرق کی فلاح کا راز پوشیدہ ہے۔ بیسویں صدی کے آتے آتے نہ صرف یہ کہ علامتی عثمانی خلافت دنیا کے نقشہ سے غائب ہوگئی بلکہ مغرب کی دانش گاہوں نے ہر طرف شرق وغرب میں ایک ایسی صورت حال کو جنم دیا جسے knowledge blindness کا نام دیا جاسکتا ہے۔ آگے چل کر اس صورت حال کو عوامی ذرائع ابلاغ کے ہاتھوں کچھ ایسا استحکام حاصل ہوا کہ مشرق ومغرب ہر طرف ناآگہی کی ایک عمومی کیفیت پیدا ہوگئی۔ media blindness کے اس عمومی ماحول میں اب دنیا پوری طرح سرمایہ داروں کے شکنجہ میں تھی۔ خود مغرب کے باسی اصل صورت حال سے ناواقف سرمایہ داروں اور کارپوریٹ کی پیدا کردہ مصنوعی صورت حال پر اصل کا گمان کرتے رہے، تاآنکہ اکیسویں صدی کی ابتداء میں social media کے جھٹپٹے میں سرمایہ دارانہ نظام کے مکروہ رخ کا عام لوگوں کو کسی قدر اندازہ ہونے لگا۔

گزشتہ ڈیڑھ دو صدیوں سے جب سے دنیا پر مغرب کی مکمل اجارہ داری قائم ہوئی ہے، ایک قسم کی عمومی ناآگہی ہمارا مقدر بن گئی ہے۔ ہمارے متجددین اور مغرّب زدہ علماء یہ کہتے نہیں تھکتے کہ جدید تہذیب کی چمک دمک بلکہ یہ کہہ لیجئے کہ نئی سائنس کا ظہور اہل مغرب کی رہین منت ہے۔ روایتی علماء بھی اس مفروضہ کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں نہیں کہ مدت سے ان کا محورِ فکر وعمل چند فروعی اور نزاعی معاملات رہے ہیں، پھر انھیں اس نئی ناآگہی اور مبنی بر پروپیگنڈہ علوم کی اصل حقیقت کا ادراک

کیسے ہو۔ خود مغرب میں سرمایہ داری کے ہاتھوں فرد پر تعذیب کے شکنجے مسلسل سخت ہوتے رہے ہیں۔ ایک بھرپور نشاط افزا زندگی اور حریتِ فکر و نظر کی بحثیں ماضی کا فسانہ بن چکی ہیں۔ زندگی معنویت سے کچھ اس طرح خالی ہوئی کہ اہل مغرب ایک طرح کے احساسِ مابعدیت کے تلے زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سب کچھ ختم ہو چکا ہو۔ تہذیب جو کبھی یہاں خیمہ زن تھی اب رختِ سفر باندھ چکی ہو اور ہمارے حصے میں ایک ویران خرابے کے علاوہ اور کچھ نہ آیا ہو۔

یہ عہد تاریک جس میں آج ہم جینے پر مجبور ہیں، اس کا الزام صرف مغرب کے سر نہیں دیا جا سکتا۔ دسویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک مغرب نے تاریخ کا سفر ہماری اتباع اور شاگردی میں طے کیا۔ سترہویں صدی میں وہ حریف کے طور پر سامنے آیا۔ اٹھارویں صدی تک قوت کا توازن کسی حد تک قائم رہا، البتہ انیسویں صدی میں منصب سیادت سے ہماری مراجعت کے سبب خود اہل مغرب کے لیے وہ فکری اور نظری سہارا باقی نہ رہا، جس کے حوالے سے اب تک تاریخ کا سمتِ سفر متعین ہوتا آیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے زوال اور غیاب کے سبب ساری دنیا ایک طرح کی ہلا مارنے والی بے سمتی کا شکار ہو گئی۔ آج اس بات پر کسے یقین آئے گا کہ تہذیب کا سائنسی قالب جس کے دم سے جدید دنیا کی چمک دمک قائم ہے، ہمارے اکتشافی طرز فکر کی پیداوار ہے، جس کی جڑیں کہیں اور نہیں بلکہ عین وحی ربانی کے صفحات میں پائی جاتی ہیں۔

اٹھارویں صدی میں جب ایمینوئل کانٹ نے مغرب میں پہلی مرتبہ Weltanschauung کی اصطلاح استعمال کی تو کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہوئی کہ اس سے پہلے اہل مغرب فلسفہ زندگی کے کسی تصور سے نابلد تھے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جب ۱۸۳۲ء میں پہلی مرتبہ ولیم ویول نے اکتشافی علماء کے لیے سائنٹسٹ کی اصطلاح وضع کی تو مشرق و مغرب ہر جگہ یہ سمجھا جانے لگا کہ Scientist کا وجود فی نفسہ مغرب الاصل ہے اور اسے مغرب کی جدید سائنسی تہذیب نے جنم دیا ہے۔ جب تک اکتشافی علوم کے لیے علوم عربیہ کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی یہ تاثر عام تھا کہ سائنسی تہذیب کا عربوں یا مسلمانوں سے رشتہ گہرا ہے، البتہ جب اکتشافی علماء کے لیے سائنٹسٹ یا سائنس داں کی اصطلاح چل نکلی تو ہمارے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ ہماری فکر و تہذیب سے اس نئی مخلوق سائنٹسٹ کا بھی کبھی کوئی تعلق رہا ہے۔

یہ کتاب کوئی دانشورانہ تاریخ نہیں، گو کہ اس کو پڑھتے ہوئے ایک نئی دانشورانہ تاریخ کی ضرورت کا احساس شدید تر ہو سکتا ہے۔ اختصاصِ فن کے اس ماحول میں جہاں اہلِ دانش کی تمام تر توجہ اپنے مخصوص فن تک محدود ہوتی ہے، ایک ایسی تاریخ جو نزول قرآن کے بعد تہذیب کے جملہ ابعاد کو متصور کر سکے کچھ آسان نہیں۔ یہ کام فی نفسہ بڑا اہم ہے جو ہمارے تقدیسی اور تجدیدی دونوں قسم کے علماء کے لیے چشم کشا ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کتاب میں ہم نے عہد بہ عہد کے مختلف وثیقہ ہائے جات اور تاریخی حوالوں کے ذریعہ یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جب تک ہم اکتشافی طرز فکر کے حامل رہے، اقوام عالم کی بلا شرکت غیرے قیادت و سیادت ہمارے ہاتھوں میں رہی، البتہ جب اساطیری طرزِ فکر نے ہمیں آلیا تو ہمارے لیے ممکن نہ رہا کہ اس اکرام و فضیلت پر تا دیر اپنا قبضہ برقرار رکھ پاتے۔ قرآن مجید تو آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے

لیکن تقدیس وتکریم کے پردے میں ہم نے اس کی معطلی کا پختہ انتظام کررکھا ہے۔ ہمارے اردگرد مذہبی زندگی کی بساط کچھ اس طرح سجائی گئی ہے جس نے عملاً مذہب کے لبادے میں دین کی نفی اور قرآن کے انکار کا ماحول قائم کررکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ مذہبی زندگی کی چہل پہل اور تجدید و اصلاح کے فلک شگاف نعروں کے باوجود ہم پر ایک نئی صبح طلوع نہیں ہوتی۔ سمت سفر کی درستگی کے لیے لازم ہے کہ ہم سب کچھ از سرنو شروع کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ ایک نئی ابتداء کے لیے مروّجہ فہم دین کے از سرنو محاکمہ کی ضرورت پیش آئے گی اور یہ کام اس وقت تک بکمالِ احتیاط انجام نہیں پا سکتا جب تک کہ خود قرآن مجید کو اس دانشورانہ مناقشے کی کمان نہ سونپ دی جائے۔

راشد شاز

یکم جنوری ۲۰۱۲ء، علی گڑھ

ملحوظہ

اس کتاب کا پہلا باب ادراک دوم سے ماخوذ ہے۔ اس کے بغیر اکتشافی تحریک کے مالہ وما علیہ کو سمجھنا مشکل تھا۔ کتاب کا مصور اور رنگین ہونا بھی دراصل اس مجبوری کے تحت ہے کہ جو پینٹنگ اور وثائق یہاں معرض بحث ہیں ان کی ایک جھلک دیکھے بغیر نہ تو تفہیم کا حق ادا ہو سکتا تھا اور نہ ہی قاری میں اعتماد کی وہ کیفیت پیدا ہو پاتی جو ان وثائق کے بچشم خود ملاحظہ سے ہو سکتی ہے۔
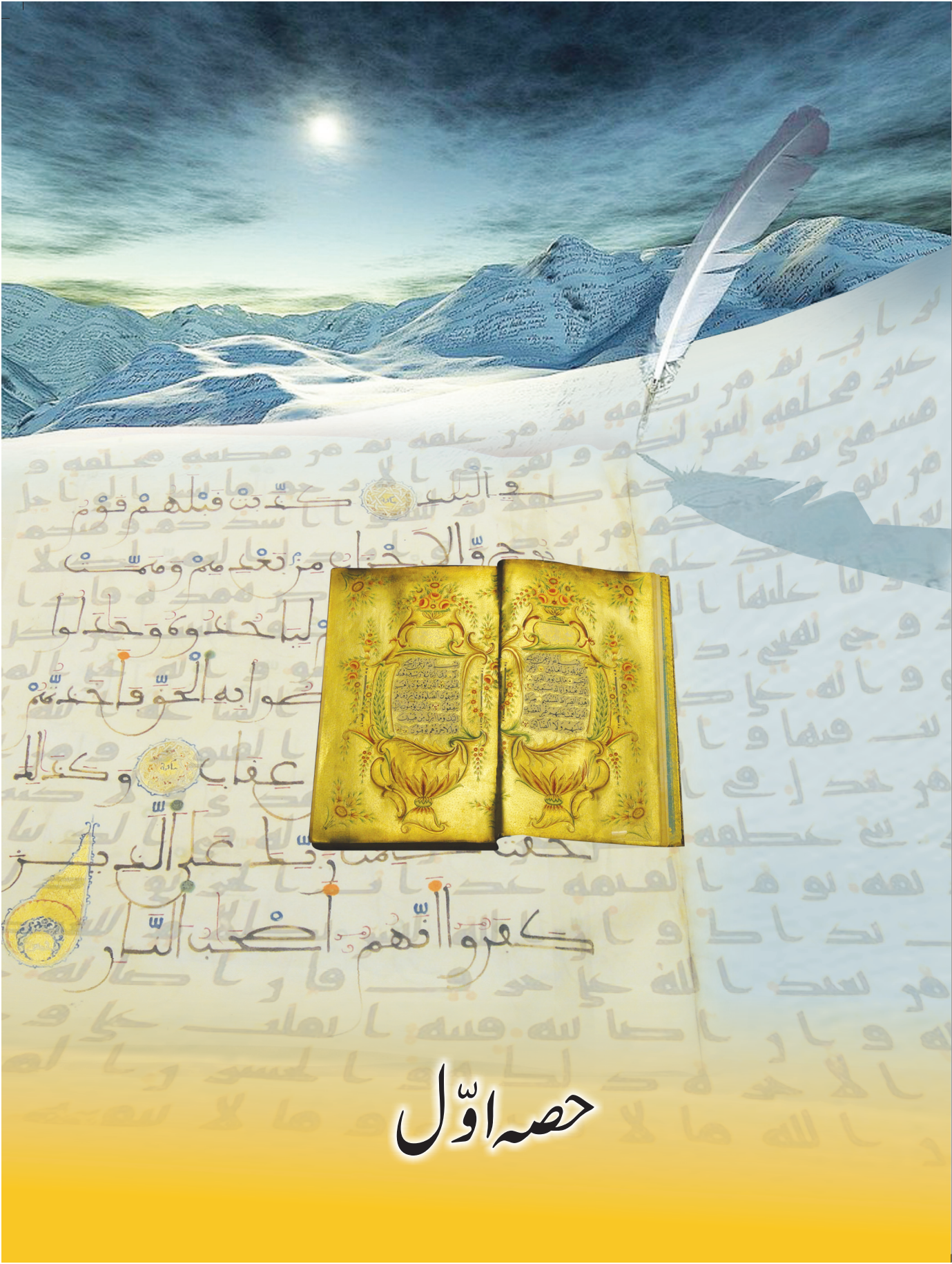
حصہ اوّل

قرآن مجید صرف اوامر اور نواہی کی کتاب نہیں بلکہ بنیادی طور پر انسانی ذہن کو خود اعتمادی اور خدا اعتمادی سے متصف کرنے والی ایک ایسی شاہِ کلید ہے جس سے امکانات کے تمام دروازے کھل سکتے ہیں۔ آج مغرب ہی کیا ساری دنیا میں علم وفن کے جو مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں ان سب کی اساس اسی قرآنی دائرۂ فکر میں پائی جاتی ہے جس نے کائنات پر غور وفکر کو ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت دی اور پھر تمام علوم حاضرہ اور متقدمہ سے اکتساب کا فن سکھایا۔ انفس و آفاق پر غور وفکر کی یہ دعوت ایک ایسے وحی آمیز عقلی رویے سے عبارت ہے جس سے غیاب پیمبری میں رہتی دنیا تک رشد وہدایت کا کام لیا جاتا رہے گا۔

الہامی تصورِ حیات کے جلو میں

{ وما او تیتم من العلم الا قلیلا }

مکہ سے کوئی دو میل دور غارِ حرا کی تنہائی میں محمدؐ بن عبداللہ ان عظیم سوالات سے نبرد آزما تھے جو ازل سے قدسی نفسوں کی توجہ کے محور و مرکز رہے ہیں۔ خدا کیا ہے؟ اس کائنات کی ابتداء کیسے ہوئی؟ اور کون ہے وہ ہستی جس کے وجود سے مکاں اور لا مکاں کی تخلیق عبارت ہے؟ یہ کیسا بھید ہے جس کی سریت کا انکشاف اس کی سریت میں مزید اضافہ کرتا جاتا ہے۔ خدا کا تجربہ اگر خلاقانہ ہو تو وہ انسان کو تسخیر کائنات کے فریضہ پر آمادہ کرتا ہے۔ اور اگر مقلدانہ ہو تو انسانی ذہن { وجدنا ابآنا کذالک یفعلون } کے پیدا کردہ توہمات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور یہی تجربہ اگر تکبر و غرور کے آمیزے سے تشکیل پائے تو بغاوت اور سرکشی کو جنم دیتا ہے۔ دیکھا جائے تو انسانی تاریخ کا تمام عروج و زوال اسی ایک نکتہ کی تشریح و توضیح سے عبارت ہے۔ دنیا کے تمام تصورِ حیات اور کائنات کے سلسلے میں تمام انسانی مفروضوں کی ابتداء اور انتہاء اسی ایک نکتہ پر آکر مرکوز ہو جاتی ہے۔

محمدؐ بن عبداللہ خانوادۂ براہیمی کی ہاشمی شاخ کے ایک ممتاز فرد تھے۔ ان کے قبیلہ قریش کو متولیانِ کعبہ کی حیثیت سے روحانی پیشواؤں کا مقام حاصل تھا۔ کعبہ کی دیکھ ریکھ اور معیاری انتظام و انصرام کے سبب مکہ کو ایک تجارتی منڈی کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ روحانی اور تجارتی سیر و سیاحت کی یکجائی کے سبب اطراف و اکناف کی دولت مکہ میں کھنچی چلی آتی تھی۔ خدا اہالیانِ مکہ کے حسی تجربے کا اب حصہ رہا ہو یا نہیں البتہ یہ بات ہر خاص و عام پر عیاں تھی کہ دینِ براہیمی کی تجارت اور اس کی فنکارانہ ترغیب و تحریص نے وادیِ غیر ذی ذرع میں رہنے والوں پر آسائش کے وافر امکانات وا کر دیئے ہیں۔

محمدؐ اہل مکہ کے اس مکروہ کاروبارِ مذہب سے سخت متنفر تھے جہاں دین براہیمی کی باقیات کے نام پر بے مغز رسوم اور توہمات کا ایک طویل سلسلہ جاری تھا۔ یہ خیال عام تھا کہ دینِ براہیمی کی اساس کھوئی گئی ہے اور یہ کہ دین کے نام پر مکہ کی یہ چمک دمک کاروبارِ دین داری سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن زید بن عمرو جو کعبہ کی دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اہل قریش سے یوں مخاطب ہوئے: ''اے قریش! اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے تم میں سے ایک شخص بھی ابراہیم کے دین پر عامل نہیں ہے سوائے میرے۔ پھر وہ تاسف بھرے انداز میں یوں گویا ہوئے بار الہا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیری عبادت کا صحیح طریقہ کیا ہے تو میں ضرور اسی طرح تیری عبادت کرتا لیکن افسوس کہ میں اس بات سے آگاہ نہیں۔''[۱]

تصور توحید کے پس پشت چلے جانے کے سبب اہالیانِ مکہ اور دیگر قبائل عرب بدترین قسم کے توہمات سے دوچار تھے۔ اہم معاملات میں وہ اپنے دل و دماغ کے بجائے خشب و حجر کے تراشیدہ بتوں سے رہنمائی کے طالب ہوتے اور پھر جو اشارے حاصل ہوتے اس کے مطابق عمل کرتے۔[۲] اس توہم پرستی نے اہل مکہ کو ایک ایسی بند گلی میں پہنچا دیا تھا جہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل دکھائی نہ دیتی تھی۔ {وجدنا ابآنا کذالک یفعلون} کی گونج میں ان کی تخلیقی صلاحیتیں اور تحلیل و تجزیہ کی قوت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔

جب دین مذہب یا تجارت بن جائے اور مذہب سے مادّی منفعت کا کام لیا جانے لگے تو پھر حق و باطل کا تراشیدہ معیار بھی ڈانواڈول ہونے لگتا ہے۔ اہل مکہ حلت و حرمت کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ جب چاہا اپنی منفعت کے لیے حرام مہینوں کو مؤخر یا مقدم کرنے کا اعلان کر ڈالا اور اس طرح روایتی دین داری یا سنن معروف کے قدموں سے بھی ثبات کا پتھر کھینچ ڈالا۔ مکی سرمایہ داری اور قرشی پیشوائی استحصال کی اس معراج پر جا پہنچی تھی جہاں غیر شعوری طور پر وہ خود اپنی بنیادوں پر تیشہ چلا رہی تھی۔ روحانی پیشوائی ہو یا استحصالی سرمایہ داری اس کی مثال ایک ایسی مخلوق کی ہے جس کی طلب ایک مرحلے میں اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اُسے زندہ رہنے کے لیے خود اپنے آپ کو نوالۂ تر بنانا پڑتا ہے۔ یہی وہ بند گلی تھی جس میں ماقبل اسلام کا انسانی قافلہ پھنس کر رہ گیا تھا۔

بند گلی کے عمومی احساس نے قیافہ شناسوں اور مستقبل بینوں کے لیے اشارات وامکانات کی ایک نئی دنیا روشن کر دی تھی۔ خبر گرم تھی کہ نئے نبی کی آمد کا زمانہ اب قریب آ پہنچا ہے۔ بعض حضرات رسول موعود کی تلاش میں مختلف علاقوں میں پھرتے رہے۔ پھر اس امید پر کہ شاید مستقبل کے نبی کا ظہور مکہ میں ہو وہ مکہ لوٹ آئے۔ ان میں سے ہی ایک زید بن عمرو تھے جو بعثت محمدؐ ی سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ اس کے علاوہ عثمان بن حریث، عبید اور ورقہ بن نوفل راہ حنیف کے متلاشیوں کی حیثیت سے مکہ میں معروف تھے۔ گو یا ایک عمومی بے چینی اس بات کا اشارہ تھی کہ اب وہ لمحہ آ پہنچا ہے جب پردۂ غیب سے وہ سب کچھ ظاہر ہو جس کے بارے میں عرصہ ہائے دراز سے اہل فکر و نظر سرگوشی کیا کرتے تھے۔

یہ وہی ایام تھے جب محمدؐ بن عبداللہ غار حرا میں ان سوالات سے نبرد آزما تھے جو کبھی ابوالانبیاء ابراہیمؑ کی ہم کلامی کا موضوع رہا تھا۔ ابراہیم کو آفتاب کے طلوع و غروب، اس کی قوت و حرارت اور اس کی سریت پر اس غیر مرئی قوت کا گمان ہوتا جس نے اس مہیب کائنات کو رنگ و بو عطا کر رکھا تھا۔ لیکن پھر بہت جلد ابراہیم کی ہم کلامی اور تلاش حق کی مساعی نے اس راز سے پردہ اٹھا دیا کہ قوت کی ان علامتوں کے آگے سجدہ ریز ہو جانا فکر و نظر کی موت ہے۔ ابراہیم کی ہم کلامی کی طرح محمدؐ کی خلوت نشینی بھی ایک مسرت انگیز اور انقلاب آفریں تجربے سے دوچار ہوئی۔ حراء میں جو کچھ ہوا اس نے آنے والے دنوں میں دنیا کی تاریخ بدل دی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک رات جب محمدؐ غارِ حراء میں سوئے تھے وہ ایک طرب انگیز تجربے سے دوچار ہوئے، نہ تو یہ خواب تھا اور نہ ہی عالم بیداری بلکہ ایک ایسا تجربہ تھا جس کے واقعی بیان سے انسانی زبان عاجز ہے۔ بقول محمد رسولؐ اللہ: ''میں سویا ہوا تھا کہ جبرئیل میرے پاس حریری رومال میں لپٹی ایک کتاب لائے اور کہا کہ اسے پڑھیے۔'' جبرئیل کی اس اچانک آمد سے آپؐ خوفزدہ ہو گئے سو جبرئیل نے ایک ہاتھ آپؐ کے سینے پر اور دوسرا پیٹھ پر رکھا اور دعا کی: **الھم احطط وزرہ واشرح صدرہ وطھر قلبہ**۔ پھر آپ کو بشارت دی کہ اے محمدؐ مبارک ہو کہ آپ اس امت کے نبی ہیں: **لا تخف یا محمد! جبرئیل رسول اللہ جبرئیل رسول اللہ الی انبیائہٖ و رسلہٖ فایقن بکرامۃ اللہ فانک رسول اللہ**ﷺ پھر آپ کو یہ آیات پڑھائیں: {**اقراء باسم ربک الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقراء و ربک الاکرم الذی علم بالقلم**}۔

سورہ علق کی ان آیات میں اگر ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی تسلی دی جارہی تھی کہ آپ کا رب اکرم ہے جس نے انسان کو قلم کا استعارہ عطا کیا اور اسے وہ کچھ بتایا جس کا اسے علم نہ تھا تو دوسری طرف اس بات کا اشارہ بھی کہ اب لذت گوشہ نشینی کے دن ہوا ہو چکے۔

جبرئیل تو واپس چلے گئے البتہ وہ محمد رسول اللہ پر اس مسرّت انگیز اور مہیب تجربے کا لافانی نقوش چھوڑ گئے۔ آپؐ کو ایسا محسوس ہوا جیسے جبرئیل نے یہ تحریر آپ کے سینے میں لکھ دی ہو۔ حراء کے اس تجربہ نے محمدؐ بن عبداللہ کو اب محمد رسول اللہ

کے منصب پر فائز کر دیا تھا۔ اب ان کے کاندھوں پر اقوام وملل کو راہ یاب کرنے کی ذمہ داری آ پڑی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس تجربے کے بعد آپؐ دوبارہ غارِ حراء کی طرف تشریف نہیں لے گئے۔

الہامی دائرۂ فکر کی تشکیل

نئی وحی کی آمد ایک نئے دائرۂ فکر سے عبارت تھی۔ انسان اور خدا، کائنات اور اس کی ابتداء و انتہا سے متعلق تمام تر سوالوں کا مکشوف و مربوط مکالمہ اب آئندہ تیئس ۲۳ سالوں تک قرآنی وحی کی شکل میں جاری رہنا تھا۔ قرآن مجید نے ان پر اسرار اور مہیب سوالوں سے سرّیت کی نقاب یکسر تو نہیں الٹی ہاں یہ ضرور کیا کہ انسان کو اس مہیب سرّیت سے بڑی حد تک ہم آہنگ اور مربوط کر دیا۔ اب کائنات پر اسرار خوف و دہشت کا استعارہ نہیں رہ گئی تھی جس کے مظاہر کے آگے سجدہ ریزی کی ضرورت محسوس ہو بلکہ یہ سب کچھ اس خالق کی عظیم صناعی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ گویا اب تک جو لوگ فطرت کی پرستش میں مبتلا تھے وہی لوگ اس پر اسرار کائنات کو خدائے واحد کے تخلیقی استعارے کے طور پر دیکھنے اور برتنے کی کوشش کرنے لگے کہ اب کائنات کوئی معمہ نہیں بلکہ خالق کل کا تعمیر کردہ ایک ایسا زمان و مکان تھا جس کے اندر رنگ بھرنے کا بنیادی فریضہ حاملین وحی کو انجام دینا تھا۔

اکتشافی ذہن کی تشکیل

نئے مسلم ذہن کی بنیاد نہ تو محض عقل پر رکھی گئی اور نہ ہی اسے کسی اساطیری طرزِ فکر کا خوگر بنایا گیا بلکہ سچ پوچھئے تو عقل کے ہاتھ میں وحی کی کتاب سر تھما دی گئی۔ اس طرح وحی ربانی کے جلو میں مطالعۂ فطرت کے ذریعے علم و آگہی کا ایک نیا علم وجود میں آ گیا۔ وحی کا سِرّ یا رازِ کائنات کے منکشف ہوجانے سے پہلی نسل کے مسلمان غیر معمولی اعتماد سے سرشار نظر آئے۔ انھیں فی الواقع ایسا محسوس ہوا گویا قرآن مجید نے مستقبل کی کمان ان کے ہاتھوں میں تھما دی ہو۔ اور یہ کہ وہ غیابِ پیمبر میں بھی بتمام کمال مستقبل کے انسانی قافلے کی منزل نوائی کے اہل ہیں۔

نئے دائرۂ فکر کی بنیاد وحی، انفس اور آفاق کے ارکان ثلاثہ پر رکھی گئی۔ اس تکون سے محض سِرّیت کے حجاب کو چاک کرنا مقصود نہ تھا بلکہ انسان کو اس مہیب کائنات میں اپنے مقام سے آگاہ کرنا تھا اور یہ بتانا بھی کہ کائنات کا بھید یکسر ناقابل فہم نہیں۔ قرآنی ذہن کے ابعاد نرے سائنسی طرزِ فکر میں متشکّل نہیں ہو سکتے۔ آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ اشیاء کی ماہیت کا محض ایک ڈائمنشن ہے، سو جہاں انسان کا مشاہدہ اس کا ساتھ نہ دے سکے وہاں حقیقتِ نفس الامر کی تلاش کے لیے وحی ربّانی کے اشارات ہماری دستگیری کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم حقیقتِ نفس الامر کا تمام تر ابعاد کے ساتھ ادراک کر سکتے ہیں کہ ابعاد اربعہ کے حاملین کے لیے ان ابعاد سے ماوراء حقائق کا حصول ممکن نہیں۔ ہاں ہم اتنا ضرور کر
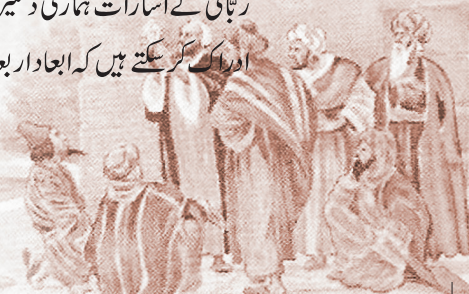
سکتے ہیں کہ آیاتِ کائنات میں ان عظیم تخلیقی استعاروں کو پڑھ سکیں جو عقل محض کے حاملین کے لیے بالعموم ممکن نہیں۔ رہے وہ لوگ جو کائنات کی مہیب وسعت پر غور وفکر سے عاجز ہیں اور جن کا چشم تصور اور وجدان کائنات میں ہر لحہ برپا معرکۂ {کن فیکون} سے ناآگاہ ہے تو یہ دراصل وہ لوگ ہیں جن کے پاس قلوب ہیں لیکن فہم سے خالی، آنکھیں ہیں مگر بصیرت سے خالی، کان ہیں مگر سماعت سے محروم۔ یہ لوگ دراصل چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ اس سے بھی گئے گزرے {أولئک هم الغافلون} (اعراف:۱۷۹)۔ وحی ربانی نے ہانکے پکارے قلب ونظر کے استعمال کی دعوت دی اور اس فریضہ میں کوتاہی برتنے والوں کو دردناک انجام سے متنبہ کیا: {والذین سعوا فی آیاتنا معجزین أولئک اصحاب الجحیم} (حج:۵۱)۔ ایسا اس لیے بھی کہ کائنات کے اسرار و رموز سے منہ موڑ کر زندگی جینے والوں کو دنیا ایک تنگ وتاریک گھاٹی کی شکل میں نظر آتی ہے۔ آیات اللہ کی تفہیم سے دور ہونا گویا تسخیری اور اکتشافی صلاحیتوں سے محروم ہو جانا ہے۔ جو قوم اس صریح کافرانہ رویّے کو اپنا شعار بنالیتی ہے اسے دنیا میں ذلت کا عذاب تو جھیلنا ہی پڑتا ہے آخرت میں بھی کم سوادی اس کا مقدر بن جاتی ہے {ومن کان فی هذه اعمیٰ فهو فی الآخرة اعمیٰ}۔

نئے مسلم ذہن کے لیے کائنات اب کوئی عقدۂ لاینحل نہیں بلکہ ایک انتہائی پیچیدہ اور منصوبہ بند تخلیقی عمل سے عبارت تھا۔ وحی ربانی خاص طور پر اولو الالباب یا اولو النهی کو خطاب کرتی جنھیں انفس وآفاق میں آیاتِ ربی کی جلوہ سامانیوں کا مشاہدہ کرنا تھا۔ ینظرون، یتفکرون، یسمعون، یتدبّرون، یتذکرون، یعقلون، یفقهون، یعلمون اور ان جیسے ہم معنیٰ الفاظ کی تکرار اور اس عمل پر اصرار نے اس بات کو یقینی بنایا کہ اب انسانی معاشرے میں وجدنا آبائنا کذالک یفعلون کی بند دماغی پر ہمیشہ کے لیے مُہرِ استرداد لگ جائے۔ نئے دائرۂ فکر میں عقل چونکہ وحی کی ضد نہیں بلکہ اس کی معاون ومشیر تھی اور رہنما بھی، سو بشارت دی گئی کہ جوں جوں عقل ترقی کرتی جائے گی وحی کا منجانب اللہ ہونا اور اس کی صداقت پر یقین واثق ہوتا جائے گا: {سنریهم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسهم۔۔۔ الخ} (فصلت:۵۳) اس آیت میں مستقبل کا صیغہ اس بات کا صریح اشارہ ہے کہ عقل کے ذریعہ خدا کی آیات کی عقدہ کشائی ماضی اور حال سے کہیں زیادہ مستقبل میں ہوگی۔ آج جو چیزیں اہل مشاہدہ کے لیے محض اپنی آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہیں کیا عجب آنے والے دنوں میں مشاہدہ کے نئے وسائل اسے ممکن بنا دیں۔ قرآن مجید کا نزول گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب غور وفکر کا وہ انقلابی منہج انسانوں کی دسترس میں ہے جس کا برتنا ان کے لیے اگر ایک طرف ایک عقلی رویّے کی تشکیل میں مہمیز ہو سکتا ہے تو دوسری طرف خود اس کتاب کے برحق ہونے پر ان کے ایقان میں اضافے کا سبب بھی، جیسا کہ ارشاد ہے: {کتٰب انزلنه الیک مبرک لیدبروا آیٰته ولیتذکر اولو الالباب} (صٓ:۲۹)۔

قرآنی دائرۂ فکر اور الکتاب

ایک مختصر سی تمہیدی دعا کے بعد قرآن مجید کی ابتداء کتاب فطرت پر غور و فکر کی دعوت سے ہوتی ہے۔ قرآن اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ جو کوئی بھی خالی الذہن ہو کر صدق دلی سے کتاب فطرت کا مطالعہ کرے گا ہدایت اس کے حصے میں آئے گی کہ ہدایت تو ہے ہی متقیوں کے لیے۔ یہ متقی بے سوچے سمجھے اندھے عقائد پر ایمان لانے والے نہیں بلکہ آیات کائنات کے گہرے شعور سے متصف ہوتے ہیں۔ یہ لوگ غیر مرئی حقائق پر ایمان لاتے، صلوٰۃ قائم کرتے اور جو کچھ خدا نے انھیں دے رکھا اس میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں قرآن **{اولئک هم المفلحون}** سے خطاب کرتا ہے۔ ان ابتدائی آیات کے بعد آگے جو کچھ بھی ہے اس کی حیثیت دراصل کتابِ فطرت کی کلید کی ہے۔ البتہ قرآن کو محض سائنسی اشاروں کی کتاب سمجھنا اس کی واقعی حیثیت کا صحیح تعین نہیں کہ قرآن مجید کی منزل تسخیر واکتشاف سے کہیں آگے اس لازوال مسرت کا حصول ہے جس کا صحیح اندازہ ابدیتِ بلا حدود میں داخلے کے بغیر نہیں کیا جاسکتا اور جسے قرآن لِقائے ربی کے مسرت انگیز امکان سے تعبیر کرتا ہے۔ البتہ علم الکتاب میں ہماری دسترس یا اسرار فطرت سے آگہی ہمیں انسان، خدا، کائنات اور ان جیسے بے شمار اسرار و رموز کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔ قوانین فطرت سے آگہی اور اس کی تسخیر عام انسان کے لیے بھی اسی طرح ممکن ہے جس طرح دربار سلیمان میں علم الکتاب رکھنے والے اس شخص کے لیے تھی جس نے چشم زدن میں طیّ الارض یا (Teleportation) کے ذریعہ ملکہ سبا کا تخت آنِ واحد میں حاضر کر دکھایا تھا۔ بحث کو سمیٹتے ہوئے مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ نیچرل سائنس یا علم الکتاب ایک ایسے عقلی رویے کا منطقی نتیجہ ہے جو کائنات کو خدا کی عظیم نشانیوں کے طور پر دیکھتا اور اسے کمال شکر و احتیاط کے ساتھ برتنے کا خود کو سزاوار سمجھتا ہے، اور جو اس نکتہ سے بھی ناآگاہ نہیں کہ ؎

اسی روز شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

قرآن مجید صرف اوامر اور نواہی کی کتاب نہیں بلکہ بنیادی طور پر انسانی ذہن کو خود اعتمادی اور خدا اعتمادی سے متصف کرنے والی ایک ایسی شاہِ کلید ہے جس سے امکانات کے تمام دروازے کھل سکتے ہیں۔ قرآن مجید کا طالب علم جب ان آیات سے گزرتا ہے **{وسخر لکم مافی السموات ومافی الارض جمیعا منه ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون}** (الجاثیہ: ۱۳) یا **{سخر لکم الشمس والقمر دائبین}** (ابراہیم: ۳۳) یا **{انا جعلنا ماعلی الارض زینة لها لنبلوهم ایهم احسن عملا}** (کہف: ۷) تو وہ ایسے اعتماد سے سرشار ہوتا ہے جس کا حال چھپائے نہیں چھپتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے **{الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبهم ویتفکرون فی خلق السماوات والارض ربنا ماخلقت هذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار}** (آل عمران: ۱۹۱)۔ بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، رات اور دن کے آنے جانے میں اور ان جہازوں میں جن کی سمندر میں روانی انسانوں کی

منفعت کے لیے ہے اور اس بارش میں جو اللہ آسمان سے نازل کرتا ہے جس سے مردہ زمین میں جان پڑ جاتی ہے اور مختلف قسم کے حیوانات میں جو زمین میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہواؤں کی تبدیلی اور ابر میں جو زمین و آسمان کے مابین مسخر کئے گئے ہیں دراصل ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں (البقرہ: ۱۶۴)۔ ارض وسماوات اور ما بینھما پر غور وفکر کی دعوت دراصل سرالاسرار سے آگہی کا ایک وسیلہ ہے۔ انسان اگر اپنی آنکھیں کھلی رکھے اور دل و دماغ تعصّبات سے آلودہ نہ ہوں تو وحیٔ ربانی کی تجلیاں غیاب محمدیؐ میں بھی کفایت کرتی رہیں گی۔ ایسا اس لیے کہ آخری پیغمبر کی عدم موجودگی میں بھی انفس و آفاق میں پھیلی خدا کی نشانیاں سلیم الطبع قلوب سے یہ کہتی رہیں گی:

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس سے رنگ برنگے پھل پیدا ہوتے ہیں اور پہاڑوں کی وہ دھاریاں جو سفید، سرخ اور سیاہ کے مختلف آمیزے ہوتے ہیں اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں صرف اہل علم ہی اس سے خشیت کرتے ہیں۔'' (فاطر: ۲۸،۲۷)

انفس و آفاق پر غور وفکر کی یہ دعوت ایک ایسے وحی آمیز عقلی رویے سے عبارت ہے جس سے غیاب پیمبری میں رہتی دنیا تک رشد و ہدایت کا کام لیا جاتا رہے گا۔

اکتشافی علوم کا ارتقاء

وحی ربانی نے کتاب فطرت پر غور وفکر کی ریت کیا قائم کی، اس طرز فکر نے بہت جلد مسلم ذہن کو تحلیل و تجزیے اور تسخیر و اکتشاف کی راہ پر ڈال دیا۔ اب تک استقرائی منہج (inductive) کو انسانی علوم کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے تجربے اور مشاہدے کو بنیادی اہمیت دی اور اس طرح علم کا منہج بڑی حد تک استخراجی (deductive) ہو گیا۔ غور وفکر کے سانچے میں یہ فی نفسہٖ اتنی بڑی تبدیلی تھی جس نے بہت جلد انسانی تہذیب کی ہیئت بدل کر رکھ دی۔ دین مبین کی فطری اٹھان جن خطوط پر ہوئی تھی اس کے سبب متبعین محمدؐ کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ کتاب فطرت سے آنکھیں بند کر پاتے۔ روزِ اول سے متبعین محمدؐ اس بات سے آگاہ تھے کہ کعبۂ مشرّفہ صرف ان کا قبلۂ نماز ہی نہیں بلکہ وحدت ملی کا علامیہ بھی ہے۔ سو یہ سوال اہمیت اختیار کر گیا کہ مختلف بلاد و امصار میں تعین قبلہ کے لیے صحیح طریقۂ کار کیا ہو؟ فلکیات کا گہرا علم بالکل اولین مرحلے میں مسلمانوں کی دینی ضرورت بن گیا۔ پھر یہ کہ مختلف بلاد و امصار میں نمازوں کے نظام الاوقات کا تعین جغرافیہ کی وسیع معلومات اور فن نقشہ نگاری میں مہارت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ قرآن مجید میں شمس و قمر کی گردش جن مقاصد کے تابع بتائی گئی ان میں ایک مقصد {لتعلموا عدد السنین و الحساب} بھی تھا (یونس: ۵)۔ گویا متبعین محمدؐ مذہبی طور پر اس بات کے مکلف بنائے گئے کہ وہ شمس و قمر کی اس گردش سے اپنے تقویمِ عمل کی ترتیب میں مدد لیں۔ اس پس منظر میں نماز پنجگانہ

کے اوقات کی تحدید، سمت قبلہ کا تعین اور صومِ رمضان کے لیے قمری کلینڈر کی ترتیب، یہ ایسے عملی اور فوری مسائل تھے جنھوں نے مسلمانوں کو فی الفور مشاہدۂ کائنات کی طرف متوجہ کیا۔

وحدت قبلہ کا تقاضا تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان خواہ وہ کسی بھی خطّۂ ارضی میں رہتے ہوں پنج وقتہ نمازوں میں اپنا رخ کعبہ مشرفہ کی طرف کریں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دور دراز علاقوں سے تعین قبلہ کی گتھی کیسے سلجھائی جائے؟ ابتدائی ایام میں کبھی ستاروں کی مدد سے سمت قبلہ کے تعین کی کوشش کی گئی تو کبھی طلوع آفتاب سے اس کا اندازہ لگانے کی کوشش ہوئی۔ بعض علمائے فلکیات بڑے دقیق مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ کعبہ کو مرکز مان کر مختلف بلاد و امصار کو بارہ جغرافیائی خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے[۵] لیکن یہ سارے تخمینے قطعیت کے احساس سے خالی تھے۔ مسلمان جب فقہی اختلاف کے گرداب میں پھنس گئے تو اختلاف قبلہ نے ایک مسلسل نزاع کی حیثیت اختیار کر لی۔ کوئی کہتا کہ رسول اللہ جب مکہ سے مدینہ آئے تھے تو انھوں نے جنوب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تھی اسی سنت پر اسپین اور وسط ایشیا کے ابتدائی مسلمانوں نے بھی عمل کیا تھا سو ہمیں چاہئے کہ تعین قبلہ کی موشگافیوں میں پڑنے کے بجائے دور دراز علاقوں میں ہم جنوب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کریں۔ کوئی اس موقف کو خلاف عقل بتاتا کہ جب رسول اللہ نے مدینہ میں جنوب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تھی تب مکہ واقعتاً جنوب میں واقع تھا سو اس سنت کو تعین قبلہ کے لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ کوئی کہتا کہ حج کے لیے کارواں جس سمت کو جاتے ہیں اسے ہی سمت قبلہ سمجھا جانا چاہئے، تو کوئی کہتا کہ ان علاقوں کی پرانی مسجدیں جس رخ پر بنی ہیں وہی ہمارے لیے کافی ہیں، تو بعض اس خیال کی پرزور حمایت کرتے کہ علوم فلکیات کے ماہرین نے جو تحقیقات کی ہیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ روایتی اور غیر روایتی فہم کے ٹکراؤ نے ایک ہی مسجد میں دو قبلوں کی طرح ڈال دی[۶] صورتِ حال کی اس نزاکت نے علمائے فلکیات کو اس مسئلہ کا قطعی حل نکالنے پر مجبور کیا۔ غور و فکر کا سلسلہ مسلسل جاری رہا یہاں تک کہ البیرونی کی شہرہ آفاق کتاب تحدید الاماکن نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس مسئلہ کو فیصل کر دیا[۷] اس نے Spherical Trigonometry کی مدد سے افغانستان کے ایک شہر سے تعین قبلہ کی کامیاب کوشش کی[۸] اور پھر ان اصولوں پر کسی بھی جگہ سے سمت قبلہ کا تعین دشوار نہ رہا۔
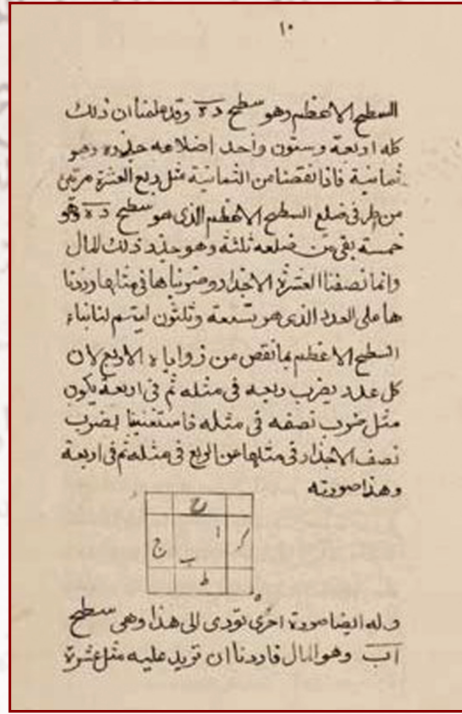
الخوارزمی کی کتاب الجبر و المقابلۃ کا ایک صفحہ

عہد رسولؐ میں جب حضرت بلال کو اذان کی ذمہ داری تفویض کی گئی تھی تو اس کی وجہ ان کی آواز کی بلند آہنگی اور لہجہ کی وجد آفرینی تھی۔ بعد کے دنوں میں بالخصوص دور دراز کے بلاد وامصار میں مؤذن کے تقرر کے لیے یہ بھی دیکھا جانے لگا کہ وہ اوقات نماز کا صحیح فہم رکھتا ہو، اسے گردش قمر کے مختلف منازل کا علم ہوتا کہ وہ رات کی تاریکی میں بھی وقت کا صحیح اندازہ لگا سکے[۹] رفتہ رفتہ یہ مؤذن اپنے کارِ منصبی میں اس حد تک ترقی کر گئے کہ انھوں نے اوقات کے تعین کے لیے فلکیاتی آلات ایجاد کر ڈالے۔ علم التقویم پر کتابیں تصنیف کیں اور مختلف شہروں کے لیے الگ الگ اوقات صلوٰۃ کی جدولیں تیار کر ڈالیں[۱۰] سمت قبلہ کے تعین اور تحدید اوقات صلوٰۃ کی ضرورتوں نے علم المیقات کے نام سے ایک نئی فلکیاتی سائنس کو جنم دیا[۱۱] آج ہماری مسجدوں میں اوقاتِ صلوٰۃ کا جو چارٹ ماضی کی علامت کے طور پر لٹکا دکھائی دیتا ہے اس کی جڑیں اسی علم المیقات میں پائی جاتی ہیں۔ تب ایٹومک گھڑیوں کا رواج نہ تھا اور تحدید وقت انتہائی پیچیدہ[۱۲] علم تھا جس میں ذرا سی بے احتیاطی حساب کتاب کے سارے گوشوارے الٹ کر رکھ دیتی تھی۔ اگر فلکیات بنیادی دینی ضرورت نہ ہوتی اور مسلمان اس کام کو فرض عین کی حیثیت سے انجام نہ دیتے تو شاید جدید دنیا جیسی کہ وہ آج ہے وجود میں نہ آتی۔

الخوارزمی نے جب اپنی مشہور زمانہ کتاب **الجبر و المقابلة** تصنیف کی تو اس کے پیش نظر بھی ایک فرض عین کی ادائیگی تھی۔ آیت وراثت کے اطلاقی پہلو بعض اوقات بڑی دقیق پیچیدگیوں کو جنم دیتے جن کے حل کی مروجہ ریاضی میں تاب نہ تھی[۱۳] کہا جاتا ہے کہ خود خلیفۂ وقت نے اس سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ تقسیم وراثت کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ایک ایسی کتاب مرتب کرے جس سے اس پیچیدہ مسئلہ کو منصفانہ انداز سے حل کیا جا سکے۔ خوارزمی نے اپنی اس کتاب کے ابتدائیے میں اس امید کا اظہار کیا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف سے وراثت کی تقسیم حتیٰ کہ زمینوں کی پیمائش، نہروں کی کھدائی اور اس قسم کے دیگر امور میں جیومیٹرائی تقویم کا کام آسان ہو جائے گا اور خدا اسے اس محنت کے عوض بہترین صلہ عطا کرے گا[۱۴] کچھ اسی جذبے کا اظہار البتانی نے کتاب **الزیج الصابی** کے ابتدائیہ میں کیا ہے۔ بقول البتانی: فلکیات کا علم تمام علوم میں ممتاز ہے جس سے روح کو بالیدگی، دل کو خوشی اور عقل کو جلا ملتی ہے، غور وفکر کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ روز وشب کی گردش، شمس وقمر کے بدلتے مقامات اور ان کا گہن اور اپنے اپنے مدار میں ان کا مستقل محوِ سفر رہنا انسانی ذہن کو خدا کی وحدانیت، اس کی عظمت، حکمت اور جلال و جبرت کا احساس دلاتا ہے[۱۵]

ظہور اسلام کے بعد جو لوگ تسخیر واکتشاف کی ایک نئی دنیا کے قیام کے لیے سرگرداں رہے وہ سب کے سب اس احساس سے سرشار تھے کہ وہ دراصل ایک مذہبی فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض تو باقاعدہ مذہبی عہدوں پر فائز تھے اور معاشرے میں تقویٰ شعاری کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ یہ صورت حال آخر آخر تک قائم رہی۔ مثال کے طور پر ابن نفیس (متوفی ۱۲۸۸ء) جس نے ابن سینا کے **القانون فی الطب** کا تنقیدی محاکمہ لکھا اور جس کی

دورانِ خون کی بعض دریافتوں نے دنیائے طب کو انقلاب انگیز تبدیلی سے دوچار کیا، وہ فقۂ شافعی کے اساطین میں سے تھے۔ اسی طرح نصیر الدین طوسی (متوفی ۱۲۷۴ء) جن کا Tusi-Couple (**الصغیرۃ والکبیرۃ**) بطلیموسی نظریات کے رد میں سنگ میل سمجھا جاتا ہے اور جس نے آنے والے دنوں میں ایک متبادل نظام کائنات کے تخیل کا راستہ ہموار کیا، ان کا شمار اپنے عہد کے کبار اسمٰعیلی علماء میں ہوتا تھا[۱۸]۔ کچھ یہی حال ان کے شاگرد رشید قطب الدین شیرازی (متوفی ۱۳۱۱ء) کا ہے، جو مراغہ کی رصدگاہ سے وابستہ رہے، جنھوں نے نہ صرف یہ کہ طوسی کے تذکرہ پر شرحیں لکھیں بلکہ اس فن پر بعض طبع زاد کتابوں کا اضافہ بھی کیا۔ شیرازی ان تمام تر علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مقامی عدالتوں میں قاضی کے منصب پر بھی فائز رہے۔ یہاں تک کہ ان کے قلم سے **جامع اصول الحدیث**، **شرح السُنۃ** اور **فتح المنان فی تفسیر القرآن** جیسی وقیع کتابیں بھی نکلیں۔ نظام الدین نیشاپوری (متوفی ۱۳۲۸ء) جو اپنی سائنسی تالیف **شرح التذکرہ** اور **شرح المجسطی** کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں وہ بیک وقت **غرائب القرآن و رغائب الفرقان** کے مصنف بھی ہیں۔ ابن شاطر جن کی تحریروں سے مغرب میں نئے نظام کائنات کی بحث شروع ہوئی اور جس کے سرقے سے کوپرنکس کو مغرب میں جدید دنیا کا بانی مبانی سمجھا گیا ان کی بابت تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ وہ دمشق کی مسجد اموی میں موقیت کے عہدے پر مامور تھے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن کے التباس فکری اور آزادخیالی کا چرچا ہوتا رہا ہے جس میں ابن رشد کا نام سرِفہرست ہے وہ بھی اشبیلیہ اور قرطبہ میں عہدۂ قضاۃ سے وابستہ تھے۔ گویا ظہور اسلام سے سولہویں صدی عیسوی تک تحریک تسخیر و اکتشاف بنیادی طور پر ایک مذہبی تحریک تھی جس کی کمان اہلِ مذاہب کے ہاتھوں میں تھی۔ اپنے تمام تر التباس فکری کے باوجود جس سے مسلم فکر کے دھارے ابتدائی صدیوں میں مختلف سمتوں میں بہنے لگے تھے اکتشافی علوم کی دینی حیثیت مشکوک نہیں ہوئی تھی۔ البتہ سولہویں صدی عیسوی کے آخر آخر تک ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قلب ونظر میں کسی نامحسوس، تقلیب انگیز تبدیلی کے لیے فضا ہموار ہو رہی ہو۔ ان عوامل کا تفصیلی محاکمہ تو ہم اگلے باب میں کریں گے۔ البتہ یہاں چند ضروری اشارات پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا۔

عبدالملک کی سیاسی اصلاحات

عبدالملک کے عہد میں جب اسلامی ریاست ایک عرب امپائر کی صورت میں متشکل ہو رہی تھی بعض ایسے واقعات پیش آئے جس نے آنے والے دنوں میں ہمارے تہذیبی سفر پر فکری التباسات کی ایک دھند قائم کر دی۔ عبدالملک خود اپنے عہد میں گو کہ نزاعی حکمراں رہے اور ایک طویل عرصہ تک سرزمین حجاز میں ان کی حکمرانی قائم نہ ہو سکی جہاں ابن زبیر منصب خلافت پر متمکن تھے۔ لیکن بعد کے دنوں میں تاریخ کی کتابوں میں انھیں قبولیت عامہ مل گئی[۱۹]۔ عبدالملک نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے جو مختلف اقدامات کئے اس میں ایک اہم قدم یہ تھا کہ انھوں نے پہلی بار اپنے انتظامی دفاتر
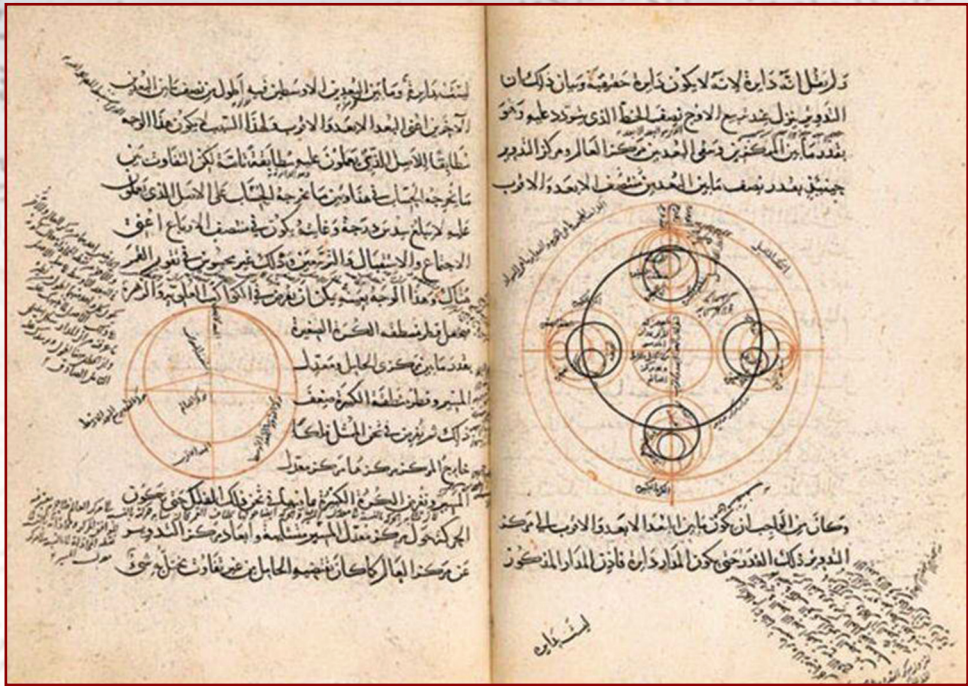
ناصرالدین طوسی کی تذکرۃ فی علم الھیئۃ

اور حساب کتاب کے گوشواروں کو عربی میں منتقل کرنے کے احکامات صادر کیے[۱۸] اس طرح گویا آنے والے دنوں میں عرب بیوروکریسی کی راہ ہموار ہوئی۔ اس عہد میں ایک دوسرا بڑا واقعہ یہ ہوا کہ بازنطینی حکمراں جسٹینین ثانی، جو تثلیث کا پرزور مبلغ تھا اور جسے یہ بات گراں گزرتی تھی کہ مسلم ریاست اپنے سرکاری خطوط کی پیشانی پر قل ھو اللہ احد لکھے اس نے عبدالملک کو یہ دھمکی دی کہ اگر اس نے اپنے موقف پر اصرار جاری رکھا تو وہ سکوں پر رسول اللہؐ کے سلسلے میں ایسے الفاظ کندہ کرادے گا جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوں گے[۱۹] کہا جاتا ہے کہ عہد عبدالملک تک سونے اور چاندی کے سکے یا تو بازنطینی ٹکسال کے ڈھلے ہوتے تھے یا پھر ساسانی ریاست کے باقیات کے طور پر ان کی تصدیق شدہ مہروں کے سبب معتبر سمجھے جاتے تھے۔ روزمرہ کا لین دین ان ہی سکوں کے ذریعے انجام پاتا تھا۔ بازنطینی دھمکی نے عبدالملک کو فوری اقدام پر آمادہ کیا اور یہ بات طئے پائی کہ مسلم ریاست اب اپنی ٹکسال کا اہتمام خود کرے گی۔ عربوں کے لیے یہ میدان خاصا نیا تھا۔ خالد بن یزید جو الکیمی سے دلچسپی کے لیے معروف تھے[۲۰] مشاورت کے لیے طلب کیے گئے اور پھر اس فن پر باقاعدہ مہارت کے لیے جدوجہد شروع ہوگئی۔ یہ دو عوامل ایسے تھے جنھوں نے اجنبی ماٰخذ سے فنی کتب کے ترجموں کی راہ ہموار کردی۔

مسلم ریاست کے لیے ٹکسال کا قیام اپنی نوعیت کا ایک انوکھا تجربہ تھا سو یہ عین فطری تھا کہ وہ اس بابت مروجہ فنّی معلومات کے تجمیع اور تحلیل و تجزیہ کا اہتمام کرتی۔ دوسری طرف دیوانِ محصولات کو عربی قالب مل جانے سے نئے عرب ملازمین کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ نظام مالیات و محصولات کی تہذیب و تنظیم کے سلسلے میں اس فن کی مروجہ کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کروائیں۔ اس طرح مفتوحہ علاقوں میں جو کچھ علمی یا فنّی سرمایہ موجود تھا اس کے ترجمے کی ضرورت کا احساس تیز تر ہوتا گیا۔ مسلمانوں کا ابتداء سے ہی یہ رویہ تھا کہ وہ مفتوحہ علاقوں کو تاراج کرنے کے بجائے ان کے انتظامی ڈھانچے میں اصلاح کو پسند کرتے اور بسا اوقات مقامی گورنروں اور عاملوں کو بشرط وفاداری اپنے عہدوں پر برقرار رکھتے۔ یہ احساس عام تھا کہ فکر و فن کسی قوم کی اجارہ داری نہیں یہ انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہے سو اسے قبول کرنے میں کسی تکلّف کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ **الحکمۃ ضالۃ المومن** کی اس فضا میں اجنبی مآخذ سے ترجموں کو بنظرِ استحسان دیکھے جانے کا وافر فکری جواز موجود تھا۔ اگر ہمارے مترجمین صرف ترجمے پر اکتفا کرتے تو اکتساب و استفادے کی ایک صحت مند روایت قائم ہونے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہ آتی۔ پھر وہ کتابیں جن کی تصنیف پر پانچ سات صدیوں کا عرصہ گزر رہا تھا اور جن کی علمی غلطیاں ہر خاص و عام پر واضح تھیں انھیں بآسانی از کارِ رفتہ سمجھ کر مسترد کر دیا جاتا۔ لیکن ہوا یہ کہ مترجمین نے اہل یونان کی جن فنّی کتابوں کے ترجمے کیے انھیں مروجہ معلومات کی روشنی میں تصحیح و تجدید کا سزاوار بھی قرار دے ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان از کار رفتہ کتابوں کا اپنا اصل مقام متعین نہ ہو سکا اور انھیں علم و فن کے لازوال ماخذ کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ اس قبیل کی ایک بہترین مثال **المجسطی** کا وہ ترجمہ ہے جو حجاج بن مطر کے ہاتھوں انجام پایا تھا۔ مترجم نے یہاں صرف ترجمے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے علم کی حد تک بطلیموس کی اس کتاب کو جدید اور مستند معلومات سے مزین کرنے کی بھی کوشش کی[۲۱]۔ فنّی کتابوں کی جدید کاری نے اہل یونان کی علمی عظمت کا طلسم قائم کرنے میں بنیادی رول ادا کیا۔ پھر آگے چل کر عباسی بغداد میں جب تحریک ترجمہ نے ایک علمی تحریک کی شکل اختیار کر لی اور ہر قسم کا رطب و یابس ترجمے کی میز پر آ گیا جن میں فلسفہ و فلکیات کی کتابیں بھی تھیں تو عام قاری کے لیے یہ خاصا مشکل ہو گیا کہ ان فرسودہ علوم کے دفتر سے کارآمد خیالات کو الگ کرے۔ اہل یونان کی کن مسلمہ باتوں کو صحیح مان لے اور کن باتوں کو گمراہ کن قرار دے۔ سچ تو یہ ہے کہ ارسطاطالیسی نظام فکر نے مسلم ذہن کو خاصے عرصے تک فکری تشتت سے دوچار کیے رکھا۔ رد و قبول اور تحلیل و تجزیہ میں کئی صدیاں ضائع ہو گئیں۔ فلکیاتی اور سائنسی التباساتِ یونانی سے تو انھیں نجات بھی مل گئی البتہ تفسیر و تاویل کے منہج میں کلامی ذہن کی کارفرمائیوں سے آج بھی مسلم فکر جاں بلب ہے۔ اس تکلیف دہ صورت حال کا محاکمہ تو اگلے باب میں آئے گا یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عہد اُموی اور عباسی میں تقریباً تین سو برسوں تک مترجمین کے ہاتھوں جو کچھ انجام پاتا رہا وہ صرف ترجمے کا سیدھا سا عمل نہ تھا جیسا کہ مغرب میں یہ خیال عام ہے کہ اہل یونان کے ترجموں سے مسلمانوں نے اپنی تہذیب کا چراغ روشن کیا[۲۲] اور پھر جب یہ روشنی یورپ کو منتقل ہو گئی تو مشرق میں علم و حکمت کا آفتاب

غروب ہوگیا۔ ہمارے خیال میں تحریک ترجمہ ہماری فکری تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جو زبردست فکری بحران اور ذہنی تشتت سے عبارت ہے۔ یہ ایک ایسا انوکھا علمی معرکہ ہے جس میں فاتح اور مفتوح کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ارسطاطالیسی نظام فکر کو کبھی بھی قبولیت تامّہ حاصل نہیں ہوسکا۔ ترجمے کی روایت ابھی پوری طرح مستحکم بھی نہ ہو پائی تھی کہ مسلم علماء کے قلم سے یونانی مفکرین کی کتابوں پر شبہات وارد کئے جانے لگے یہاں تک کہ جلد ہی کتب شکوک کی ایک نئی روایت قائم ہوگئی۔ مثال کے طور پر ابوبکر ذکریا الرازی نے **کتاب الشکوک علی جالینوس** مرتب کی اور ابن الہیثم نے **الشکوک علی بطلیموس** لکھی۔[۲۳] اس قبیل کی ایک اور کتاب **الاستدراک علی بطلیموس** ہے جس کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ کسی اندلسی مصنف کی تصنیف ہے۔[۲۴] ابوعبید الجزجانی (متوفی ۱۰۷۰ء) نے بطلیموس کے تصور **الفلک المُعَدِّل المَسِیر** (Equant) کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔[۲۵] گویا ہند، یونان اور فارس کی کتابوں سے ترجمہ ہوکر جو کچھ آیا تھا اسے مِن وعَن قبول کرنے کے بجائے تحلیل وتجزیہ کی کسوٹی پر پرکھا گیا اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ابوالبرکات البغدادی (متوفی ۱۰۲۳ء) اور فخر الدین الرازی (متوفی ۱۲۰۹ء) جیسے متکلمین اگر ارسطو کے سخت ناقد رہے[۲۶] تو ابوبکر ذکریا الرازی اور البیرونی جیسے سائنسدانوں نے بھی ارسطو کے تصور تخلیق کائنات اور نظریۂ تغیر وتبدل کو کبھی بھی لائق اعتناء نہ سمجھا۔ بارہویں صدی عیسوی کی ابتداء میں ابوالفتح عبدالرحمٰن الخازنی کی تصنیف کتاب **میزان الحکمة** نے نہ صرف یہ کہ ارسطاطالیسی نظریہ کائنات کی اینٹ سے اینٹ بجادی بلکہ پہلی بار دنیا کے سامنے مرکز کشش ثقل کا وہ نظریہ پیش کیا جس نے آنے والی نسلوں کے لیے سائنسی فتوحات کے دروازے کھول دیئے۔ لیکن ان علمی فتوحات کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ بھی ہے کہ اہل

برجندی کی شرح التذکرۃ کا ایک صفحہ

یونان کی علمی عظمت کے طلسم سے نکلنے میں مسلمانوں کی کئی صدیاں ضائع ہوگئیں اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان ابتدائی صدیوں میں جب مسلم اہل فکر اہل یونان کی کتابوں سے اشتغال کرتے رہے اور یہ کتابیں اپنی تمام تر فنی فرسودگی اور از کار رفتہ معلومات کے باوجود علمی مناقشے کا حوالہ بنی رہیں قرآنی دائرۂ فکر میں کسی راست اکتشافی تحریک کا ڈول نہ ڈالا جا سکا۔ لہٰذا نزول قرآن کے سبب سپردہ نفوس کی جو خواب آسا اکتشافی دنیا وجود میں آنا چاہئے تھی، چشم فلک اس کا نظارہ دیکھنے سے محروم رہ گئی۔

یونانی طلسمِ علمی کو چاک کرنے میں مسلم اہل فکر پر کیا گزری اور کس طرح وہ صدیوں ذہنی تشتت سے دوچار رہے اس کا کسی قدر اندازہ ابن الہیثم کے اس تنقیدی لب ولہجہ سے ہوتا ہے جو اس نے **المجسطی** اور **کتاب المنثورات** پر سخت احتجاج کرتے ہوئے درج کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> ''اسے (بطلیموس کو) یا تو اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ جن مفروضات پر اپنے کلیہ کی بنیاد رکھ رہا ہے وہ ایک امر محال ہے یا وہ اس بات سے قطعی ناواقف تھا۔ اگر وہ امر محال جان کر بھی اس خیال کا قائل تھا تو یقیناً یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا علم خام تھا اور اس کے تصورات ومفروضات سب گمراہ کن تھے جس کے لیے اسے یقیناً مورِ دالزام قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن اگر اس نے ان مفروضات کو اسرار وعواقب کے نتائج کا اندازہ لگانے کے باوجود اختیار کیا جیسا کہ صاف ظاہر ہے اس لیے کہ اس کے پاس اس مسئلہ کا کوئی دوسرا بہتر حل موجود نہ تھا اور اس نے دانستاً اپنی غلطیوں سے صرف نظر کیا تو یقیناً وہ دوہری غلطی کا مرتکب ہوا ہے۔ پہلی بار تو ان مفروضات کو اختیار کرنے کے سبب جس کا ناممکن العمل ہونا واضح تھا اور دوسری بار اس غلطی سے صرفِ نظر کرنے کے سبب کہ وہ دانستاً ایک غلطی کر رہا ہے۔۔۔ اس بات میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ سیاروں کی حرکت کے صحیح زائچے موجود ہیں جن میں باہم نہ کوئی تضاد ہے اور نہ ہی اس پر امر محال کا گمان ہوتا ہے لیکن یہ بطلیموس کے مقرر کردہ خطوط سے یکسر مختلف ہے۔ بطلیموس پر اس کی حقیقت واضح نہیں ہوسکی تھی اور نہ ہی اسے اس مسئلہ کا ادراک حاصل تھا۔''[۲۷]

ابن الہیثم ہی پر کیا موقوف اہل یونان کے فلکیاتی تصورات کا بعید عن القیاس ہونا پہلی نسل کے مترجمین پر بھی واضح ہوگیا تھا لیکن تحریک ترجمہ نے دانش یونانی کا کچھ ایسا جلال ودبدبہ قائم کر رکھا تھا کہ ان تصورات کو فی الفور کالعدم قرار دینا آسان نہ تھا۔ ثانیاً ان کی فرسودگی واضح ہونے کے باوجود علمی گفتگو کی بزم ان ہی قدماء کے حوالے سے سجائی جاتی رہی ورنہ اہل فن کا ایک خاصا بڑا حلقہ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ اوجِ شمس (Solar Apogee) کے تعین کے دوسرے بہتر طریقے بھی ہوسکتے ہیں جیسا کہ فصول کی بنیاد پر بعض اہل فن نے مامون کے عہد میں **زیج الممتحن** کی ترتیب کے ذریعے واضح کیا۔[۲۸] لیکن ان تمام تر مبینہ علمی نقائص کے باوجود معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو اپنے مشاہدے کے برخلاف یہ کہتے نہ تھکتے کہ اگر بطلیموس، جالینوس یا ارسطو کی کتابوں میں یوں لکھا ہے تو حقیقت یہی ہوگی۔ گویا معاشرے کا ایک غالب حصہ

ایک طرح کی دانشورانہ احساس کمتری کا شکار تھا اور یہ کچھ وہی صورتِ حال تھی جسے کانٹ کی اصطلاحِ مستعار میں self-imposed immaturity کہنا چاہئے۔ **مدینة الحکمة** نے ازکاررفتہ ترجموں کی جو بزم سجائی تھی اس کے مقابلے میں، صاف محسوس ہوتا تھا، کہ خدا کی نازل کردہ کتاب **الحکمة** کی چمک بھی ماند پڑ گئی ہو۔ خود اعتمادی اور تخلیقی فکر کا آبشار خشک ہو گیا ہو۔ ایسی صورتحال میں ابن الہیثم کی یہ جھنجھلاہٹ برحق تھی:

خلیفہ ابن ابی المحاسن کی کتاب الکافی فی الکحل (تیرہویں صدی) کا ایک صفحہ جس میں دماغ اور آنکھوں کے باہمی تعلق پر کلام کیا گیا ہے۔

"بطلیموس نے پانچ سیاروں کا جو خیالی نظام وضع کیا ہے وہ ایک لغو اور مہمل بات ہے، اس کا مہمل ہونا خود اس پر بھی واضح تھا لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ سیاروں کی حرکت اپنے اصل مدار پر قائم ہے اور یہ کسی عالمِ خیال میں نہیں بلکہ عملی دنیا میں ہو رہا ہے لیکن بطلیموس اس صورتِ حال کو سمجھنے سے یکسر قاصر رہا۔"[29]

اپنے عہد کے دوسرے مفکرین کے مقابلے میں ابن الہیثم کو اس بات کا کہیں شدت سے احساس تھا کہ بطلیموسی فلکیات فی نفسہٖ بے اصل اور غیر علمی بنیادوں پر قائم ہے جسے خیر باد کہے بغیر ایک علمی اور سائنسی منہج کا قیام ممکن نہیں۔ ابوجعفر البطروجی، جنھوں نے بالآخر بطلیموسی نظام کی اینٹ سے اینٹ بجا دی انھیں بھی اس بات کا خوب اندازہ تھا کہ یونانی تراجم کی ہیبت کس طرح صدیوں خالصتاً قرآنی دائرۂ فکر میں ایک علمی تحریک کے امکانی نمو کا راستہ روک کر بیٹھ گئی۔ بقول بطروجی بطلمیوس کا قائم کردہ ماڈل رصدی و حسّی مشاہدے سے مطابقت نہیں رکھتا اور یہ کہ اُس نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس کی بنیاد تو ہم پر ہے حقیقت پر نہیں۔[30]

سنت اللہ بنام دانش یونانی

دانش یونانی کی مسلسل مزاحمت اور تحریک ترجمہ کی پیدا کردہ مسلسل بلند ہوتی لَے کے باوجود نزول وحی پر کوئی دو ڈھائی سو سال کا عرصہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ مسلمانوں نے تمام مروجہ علوم کا احاطہ کر لیا۔ انسانی تہذیب کی اب تک کی پیش رفت تحلیل و تجزیہ کی میز پر لے آئی گئی۔ اہل یونان کے علمی ہیبت و جلال کے باوجود مسلم دانشوری کی زیریں لہریں اپنا کام کرتی رہیں۔ ابتدائی صدیوں کا مسلم ذہن جس پر حکمت بالغہ[31] کی چھاپ اب بھی بڑی نمایاں تھی اس کائنات کو ایک منطقی اور مربوط نظام سے تعبیر کرتا تھا۔ اسے اس بات کا گہرا شعور تھا کہ شمس و قمر کی گردش، قوموں کا عروج و زوال اور کائنات میں

جہد پیہم کے لامتناہی سلسلے مربوط اور منظم قوانین کی رہین منت ہیں۔ خدا نے ہر چیز کے تغیر وتبدل، عروج وزوال اور اس کے خواص وتناسب کا ایک قانون طے کر دیا ہے سو اہل تسخیر کے لیے لازم ہے کہ وہ ان قوانینِ فطرت کا نہ صرف یہ کہ درک حاصل کریں بلکہ اسے کمال احتیاط کے ساتھ برتنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہوں۔ فطرت کے یہ قوانین اور عروج وزوال کے یہ مسلّمات غیر جانبدار اور غیر مبدّل ہیں۔ دنیا کی جو قوم بھی خدا کے ان قوانین سے خود کو ہم آہنگ کر لے گی، رازِ کائنات اس پر منکشف ہوگا، تسخیر واکتشاف کی دنیا اس پر وا ہوگی، سیاست وقیادت کا منصب اس کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ خدا کی یہ سنت، جسے قوانین فطرت کہیے، کسی شخص، قوم یا عہد کے لیے مخصوص نہیں کہ {وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلا}۔

سنت اللہ پر گہرا یقین اور حکمت بالغہ کی شناوری فکری تشتت کی ان صدیوں میں بھی مسلمانوں کو مسلسل سِرّ کائنات کی بے نقابی پر مہمیز کرتی رہی۔ محمدؐ رسول اللہ نے اپنے متبعین کو کتاب کی تعلیم کے ساتھ حکمت سے بھی متصف کیا تھا: {ویعلمهم الکتاب والحکمة}۔ آپؐ نے وحی ربانی کی روشنی میں ایک ایسے عقلی دائرۂ فکر کی تشکیل کی جو انسان کو مکمل ذہنی بلوغ کے ساتھ کائنات کے مشاہدے اور اس کی تسخیر واکتشاف پر آمادہ کر سکے۔ حکمت قرآن سے باہر نہیں بلکہ خود ''تزکیہ ربانی'' کا پیدا کردہ وحی آسا عقلی رویّہ تھا۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجیے کہ جو کوئی بھی خالی الذہن ہو کر سلیم القلبی کے ساتھ وحی ربانی کا مطالعہ کرے گا وہ حکمت کی نعمت سے متصف ہوگا اور پھر جب یہ صاحب حکمت کتاب وکائنات پر نظر ڈالے گا تو کتاب کی بہترین فہم اور کائنات کے سِرّ الاسرار اس پر منکشف ہوتے جائیں گے۔ سنت اللہ کی اس تفہیم اور حکمتِ بالغہ کے اسی شعور نے مسلم اہل فکر کو اس ایقان سے سرشار کیا کہ علم وانکشاف ایک بے کنار سمندر ہے ''انسان کو چاہیے کہ وہ تمام کائنات کے اسرار منکشف کرنے کی کوشش کرے اور یہ کہ اس عالم سے ماوراء جو اسرار ہیں ان سب کو منکشف کرنے کی صلاحیت اسے عطا کی گئی ہے''۔[۳۲]

کتاب وحکمت سے مملو وحی آمیز عقلی رویّے نے ایک نئے منہج علمی کو جنم دیا جس کی بنیاد قیاس مع الفارق استخراج یا توہمات کے بجائے مشاہدے اور تصدیقی تجربے پر رکھی گئی۔ قال الافلاطون یا قال البطلیموس پر انحصار کے بجائے نئے مسلم ذہن نے جو علمی منہج اختیار کیا اس کی ایک جھلک البیرونی کے اس اقتباس میں دیکھنے کو ملتی ہے:

> ''میں نے وہی کیا ہے جو ہر انسان پر واجب ہے، کہ وہ اپنے فن میں مہارت حاصل کرے یعنی اس فن میں جو لوگ اس سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کے اجتہادات کو قبول کرے۔ اور اگر کچھ خلل پائے تو بے جھجک اس کی اصلاح کر دے اور جو کچھ خود اسے سوجھے اسے اپنے بعد آنے والے متأخرین کے لیے بطور ایک یادداشت، محفوظ کر جائے۔''[۳۳]

عقل ومشاہدہ اور تفکر وتدبر کے اس نئے استخراجی (empirical) منہج علمی[۳۴] نے انسانی تہذیب کو ایک نئے غلغلہ اور ایک بالکل ہی نئی جہت سے آشنا کیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے پوری کتابِ کائنات یکسر مطالعہ کے لیے کھول دی گئی ہو اور

البیرونی کی کتاب میں چاند گہن پر بحث

امکانات کی ایک نئی دنیا وجود میں آنے کو بے تاب ہو۔ جب انسان اس یقین واثق سے سرشار ہو کہ دنیا دراصل ریاضیاتی قانون پر قائم ہے اور یہ کہ عالم موجودات کی عددی توجیہ عین ممکن ہے، جیسا کہ جابر نے اس خیال کا اظہار کیا کہ خواص اشیاء کی عددی تاویل اگر مہیا کی جا سکے تو اشیائے عالم کے لیے ریاضیاتی حتمیت کے میزان کا اصول قائم کرنا ممکن ہو سکے گا یا اس کا یہ دعویٰ کہ یہ اصول اشیاء اور اس کی داخلی ہم آہنگی کے ایک نظام کی وضاحت کرتا ہے، ہر شئے میں اس کا ظہور ہے اور یہی دنیا کا مجرد اساسی مفہوم[٣٥] بھی۔ تو یہ سمجھئے کہ اس نے آنے والی نسلوں پر اسباب وعلل کی اس دنیا کا اساسی راز منکشف کر دیا۔

اس نئے منہج علمی کی بنیاد طلب حق پر رکھی گئی تھی۔ مسلم علماء اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ قرآن مجید کی دعوت اکتشاف نے ان پر ایک بڑی ذمہ داری عائد کردی ہے۔ بقول ابن الہیثم حقائق شبہات میں ڈوبے ہوئے ہیں لہٰذا ''طالب حق وہ نہیں جو متقدمین کی کتابوں کا محض قاری ہو اور ان پر حسنِ ظن میں اپنے طبعی رجحانات کے ساتھ بہہ جائے بلکہ طالب حق وہ ہے جو ان کے بارے میں اپنے ظن پر بھی شک کرے۔۔۔ اگر وہ اس روش کو اختیار کر سکے تو حقائق اس پر منکشف ہو سکیں گے اور متقدمین کے یہاں جو امکانی کوتاہی یا اشتباہ رہ گیا ہو گا اسے نظر آجائے گا''[٣٦] اس نئے منہج علمی نے

جس کی اشاعت نزولِ وحی کے بعد مختلف بلاد و امصار میں مسلسل ہوتی رہی تھی ہمارے تہذیبی سفر کے بے لاگ تجزیے اور نوعِ انسانی کے کارواں کو نئے خطوط پر منظم کرنے میں کلیدی رول انجام دیا۔ انسانی تہذیب جو تاریخ کی عظیم ترک تازیوں، باجبروت بادشاہوں کے تذکروں، عاد و ثمود کے عبرت انگیز قصّوں، داؤد و سلیمان کے جاہ و حشم اور حکمت لقمان کے مسرت آگیں تذکروں کے باوجود کتاب فطرت سے ناواقفیت کے سبب بے سمتی کا شکار تھی، دیکھتے دیکھتے تسخیر و اکتشاف کی ایک نئی دنیا سجانے لگی۔

نیا ذہن: نئے امکانات

یہ نیا منہج علمی جس کی بنیاد ظن و تخمین کے بجائے مشاہدے اور تجربے پر رکھی گئی تھی آنے والے دنوں میں رصدگاہوں کے قیام پر منتج ہوا۔ کوئی ہزار برسوں تک، جب تک عالم اسلام میں غور و فکر کی روایت زندہ رہی، مختلف بلاد و امصار میں نئی نئی رصدگاہیں قائم ہوتی رہیں[۳۷] جب متجسّس نگاہیں ایک بار آسمان کی طرف اُٹھ گئیں تو اس قسم کے سوالات فطری تھے: یہ فضا، یہ فلک اور آسمان کا یہ لاجوردی رنگ، اس کی حقیقت کیا ہے؟[۳۸] ہوائیں کیوں چلتی ہیں اور یہ کہ موسم گرما کی اکثر ہوائیں شمالی اور موسم سرما کی اکثر ہوائیں جنوبی کیوں ہوتی ہیں؟ الکندی نے ان سوالوں کے جو جواب فراہم کئے وہ بعینہ وہی تھے جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے George Hadley اور Immanuel Kant سے منسوب کئے جاتے ہیں[۳۹] النریزی نے بادلوں اور بخارات کی بلندی کی پیمائش کی اور سہل الکوہی نے یہ پتہ لگانے کی کوشش کی کہ شہابیے کن کن فاصلوں پر ہیں۔ ابتدائی چند صدیوں میں تسخیر و اکتشاف کی اس تحریک نے عالم اسلام کو مسلسل ایک طرب انگیز کیفیت سے دوچار کئے رکھا۔ صورتِ حال کی صحیح تصویر کشی کے لیے لازم ہے کہ ہم اجمالی بیان کے بجائے تحریک اکتشاف کے چند غلغلہ انگیز لمحات کا قدرے تفصیلی تذکرہ کریں۔

یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ عالم اسلام میں پہلی باقاعدہ رصدگاہ عہد مامون میں شمّاسیہ بغداد اور دمشق کے نواح میں کوہ قاسیوں پر قائم کی گئی تھی۔ اس منہج علمی کا پہلا ثمر جو مسلمانوں کی جھولی میں گرا وہ Arch of the Mediterranean یعنی خط استوا کے طول کی پیمائش تھی۔ علمائے اکتشاف نے تدمر اور رقّہ کے مابین ایک درجے کے طول کی پیمائش کی اور اس کے ذریعے خط استوا کا طول چالیس ہزار دو سو ترپن (40,253) کلومیٹر دریافت کر لیا جو غیر معمولی طور پر محتاط پیمائش کی ایک کامیاب مثال تھی۔ پھر کیا تھا جلد ہی الزیج الممتحن کے نام سے علوم فلکیات کی جدولیں تیار ہونے لگیں اور اس بات کی کوشش کی جانے لگی کہ دنیا جیسی کہ وہ ہے اسے ٹھوس علمی بنیادوں پر ایک نقشے کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔

آنے والے دنوں میں البیرونی کی شہرۂ آفاق تصنیف کتاب تحدید الاماکن نے محیط ارضی کی پیمائش کا ایک اور طریقہ دریافت کر لیا۔ البیرونی نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر Mural Quadrant نامی آلے کا استعمال کیا جائے تو اس قسم

قطب الدین شیرازی کی تحفۃ الشاھیۃ فی الھیئۃ کا ایک ورق

کی پیمائش کے لیے صحرا نوردی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ آج Mural Quadrant کو Tycho Brahe کی ایجاد سمجھا جاتا ہے اور اس مناسبت سے اس کا نام Tychonicus پڑ گیا ہے۔[۴۰] البیرونی کی اس تنقید سے قطع نظر عہد مامون کے اصحاب اکتشاف کے سامنے ایک ایسی دنیا کی تحدید کا کام تھا جس کی نظیر انسانی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ ایک ایسے خریطۂ عالم (World Map) کی ترسیم کا خیال جس میں کائنات اپنے حدود اربعہ، سیاروں، زمین، سمندر، آباد اور غیر آباد علاقے، شہر اور بن اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ جلوہ گر ہوں۔[۴۱] بلاشبہ اپنی نوعیت کا ایک عظیم الشان منصوبہ تھا۔ بارہویں صدی عیسوی میں الادریسی نے سسلی کے عیسائی شہنشاہ روجر کی فرمائش پر خریطۂ عالم کی ترتیب کے ساتھ **نزھۃ المشتاق فی اختراق الآفاق** (*Tabula Rogeriana*) تالیف کی جس میں اس وقت کی دنیا کی تقریباً تمام ہی معلومات کا احاطہ کرلیا گیا۔

خریطۂ عالم کے وجود میں آجانے اور اس فن میں اکتشافی مسلمانوں کی مہارت کے سبب دنیا کے بارے میں قصّے کہانیوں اور پر اسرار خیالی واقعات کی دھند اب بڑی حد تک چھٹ گئی۔ اب تک ساسانی، فارسی اور ہندی جغرافیہ دانوں نے جو کچھ بھی لکھا تھا اسے ذاتی مشاہدے اور تجربات سے پرکھا گیا۔[۴۲] ۲۴؍مئی ۹۹۷ء کو ابوالوفا (متوفی ۹۹۸ء) اور ابوریحان البیرونی نے پہلی بار کاتھ اور بغداد کے مابین طول البلد کی پیمائش کی۔ آمودریا (Oxus river) کے کنارے

البیرونی اگر ایک طرف چاند گرہن کا انتظار کر رہے تھے تو دوسری طرف بغداد میں ابوالوفا اس جستجو میں مصروف تھے کہ اسی چاند گرہن کے ذریعے ان دو جگہوں کے مابین طول البلد (Longitude) کی پیمائش کیسے کی جائے۔ طول البلد کی صحیح ترین پیمائش نے ان حضرات کو حیرت آمیز مسرت سے دوچار کر دیا۔ پہلی بار یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ارض و سمٰوات کی ماہیت انسانی حیطۂ ادراک کا اس حد تک حصہ بن سکتی ہے کہ وہ محض گردش شمس و قمر کے ذریعے اس کے طول و عرض سے واقف ہو سکتا ہے۔ البیرونی اور ابوالوفا کی اس مشترکہ دریافت نے انسانی فکر میں ایک ہلچل کی سی کیفیت پیدا کر دی۔[۴۳]

گیارہویں صدی کے اواخر میں عمر خیام کی قیادت میں شہر اصفہان میں روز و شب کی باریک بین پیمائش کا کام از سرِ نو شروع ہوا۔ متجسّس نگاہیں ایک بار پھر آسمانوں کے تعاقب میں لگ گئیں۔ بالآخر برسہا برس کی محنت شاقہ کے بعد سال ۱۰۷۹ء میں عمر خیام نے ایک سال کی طوالت 365.242198 دنوں پر محمول کی جو جدید تحقیق سے حیرت انگیز طور پر قریب ہے۔ فی زمانہ الکٹرونک آلات اور ایٹومک گھڑیوں کے عہد میں سال کی طوالت 365.242190 سمجھی جاتی ہے۔ عمر خیام جو مغرب میں رباعیات کے شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں انھوں نے پہلی بار اس بات کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کیا کہ زمین اپنے مدار پر گردش کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عمر خیام نے جس مجمع عام میں شمع اور گلوب کی مدد سے زمین کی گردش کے ریاضیاتی ثبوت فراہم کئے اس میں ابوحامد الغزالی، جنھیں بعد میں حجۃ الاسلام کی حیثیت حاصل ہوگئی، بہ نفس نفیس موجود تھے۔

بطلیموس کے مفروضہ **الفلک المعّدل للمسیر** (Equant) کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ ابن الہیثم نے اس تصور کو نہ صرف یہ کہ پوری شدت سے رد کیا بلکہ اس نے پہلی بار سیاروں کی حرکت کے سلسلے میں ایک قابل قبول توجیہ پیش کی۔[۴۴] ابن الہیثم کا موقف تھا کہ یہ بات قابل تسلیم نہیں ہو سکتی کہ کائنات میں کوئی ایسا دائرہ موجود ہو جو اپنے مدار پر اس کے مرکز سے گزرے بغیر مسلسل گردش میں رہے۔ البیرونی نے بطلیموس کی مشہور زمانہ کتاب کے بارے میں تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس قبیل کی تحریروں کا علم ہیئت یا فلکیات سے کوئی تعلق نہیں۔[۴۵] بطلیموسی نظام کے اس مبینہ نقص نے علمائے فلکیات کو حقائق کا پتہ لگانے اور ایک نئے کائناتی ماڈل کی تشکیل پر آمادہ کیا۔ مغرب اقصیٰ میں البطروجی (متوفی ۱۲۰۰ء) ابن رشد (متوفی ۱۱۹۸ء) اور جابر بن افلح (متوفی ۱۲۰۰ء) ایک نئے ماڈل کی تلاش میں مسلسل سرگرداں رہے۔

سچ تو یہ ہے کہ نویں صدی عیسوی کی ابتداء سے ہی بطلیموسی نظام شک کے دائرے میں آ گیا تھا۔ البتہ متبادل نظام کی تشکیل مراغہ کے اہل علم کے لیے مقدر تھی۔ نصیرالدین طوسی (متوفی ۱۲۷۴ء) نے اس سمت ایک اہم پیش رفت کی۔ انھوں نے زیج اَلِاُلخانی کے نام سے ایک ہمہ گیر جدول مرتب کیا جس کی بنیاد Trigonometry پر رکھی اور جس کے سبب آسمانوں کی سمت اور مسافت کی پیمائش ممکن ہوگئی۔ طوسی نے الصغیرۃ والکبیرۃ (Tusi-Couple) کا تصور دے کر آنے والی تحقیق کو المعدل المسیر کے گرداب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات دلا دیا۔ طوسی نے اپنی کتاب **تحریر المجسطی**

کمال الدین الفارسی کی تنقیح المناظر کا ایک ورق

(مطبوعہ ۱۲۴۷ء) میں صرف بطلیموس کے رد پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی دوسری تصنیف تذکرۃ (مطبوعہ ۱۲۶۰ء) میں ایک نئے متبادل کی طرف واضح اشارہ بھی کیا۔ بالآخر نصیر الدین طوسی (متوفی ۱۲۷۴ء) قطب الدین شیرازی (متوفی ۱۳۱۱ء) اور ابن شاطر (متوفی ۱۳۷۵ء) کی مجموعی کوششوں نے ہمیشہ کے لیے کائنات کے سلسلے میں ہمارے تصوّر کو بدل ڈالا۔ ابن شاطر نے اپنی تصنیف کتاب نہایۃ السول فی تصحیح الاصول میں ایک متبادل نظام کا جو خاکہ پیش کیا اس کی بنیاد تصدیق شدہ مشاہدے پر رکھی گئی تھی۔ ابن شاطر کے اس نئے ماڈل نے آنے والے دنوں میں انسانی فکر کو ایک نئے انقلاب سے دوچار کر دیا[۴۶] اس ماڈل میں بعض جزوی تبدیلی، جسے علمی بددیانتی یا سرقہ کہنا چاہیے، کے بعد کوپرنکس نے اس دریافت کا سہرا اپنے سر باندھ لیا اور پھر استعمار کی صدیوں میں اس زور و شور سے پروپیگنڈہ ہوا کہ ہم کوپرنکس کو جدید دنیا کے معماروں میں شمار کرنے لگے[۴۷]

قرآنی دائرۂ فکر کے عام ہو جانے سے دیکھتے دیکھتے انسانی تہذیب کی ہیئت بدلنے لگی۔ وہ تمام علوم جن کی حیثیت زمانۂ قدیم سے مسلّم تھی اور جو یہ احساس دلاتے تھے کہ کائنات کی سریت عقدہ لاینحل ہے ان کا اعتبار ساقط ہونے لگا۔

رمل، نجوم، کہانت اور سفلی علوم پر ہی کیا موقوف الکیمی جیسا محبوب مشغلہ بھی شک کے دائرے میں آ گیا۔ الکیمی کے بجائے علم کیمیا کی بنیاد پڑی۔ جابر جو اس علم کے بانی اور امام کی حیثیت رکھتا ہے اس نے تمام کیمیائی مظاہر کو قانون الاسباب کا تابع بتایا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ انسانوں کے لیے ان اسباب کا پتہ لگانا عین ممکن ہے۔ بقول جابر، اشیاء کے خواص اس کے اندر پائے جانے والے مختلف اجزاء کے تناسب پر منحصر ہیں۔ آگے چل کر جابر کا یہ کلیۂ میزان Law of Proportions کے نام سے مشہور ہوا۔ المیز ان نظام کائنات کے ایک ایسے مجرد اساسی اصول کی حیثیت سے سامنے آیا جس کی بنیاد پر پوری کائنات کی ریاضیاتی توجیہ کے امکانات روشن ہو گئے۔[۴۸] جابر، جسے آج بھی بابائے کیمیا کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے، نے تجربات کو علمِ کیمیا کی بنیاد قرار دیا۔ اس نے پہلی بار معدنیات سے تیزاب تیار کیے مثلاً گندھک کا تیزاب (سلفیورک ایسڈ) شورے کا تیزاب (نائٹرک ایسڈ) اور نمک کا تیزاب (ہائڈروکلورک ایسڈ) جس میں فولاد جیسی دھات کو پگھلا دینے کی صلاحیت پائی گئی۔ تیزاب کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اس نے الکلی کی ایجاد کی۔ اس کے علاوہ بعض تیزاب کے مجموعے سے ماء الملوک (aqua regia) تیار کیا جس میں سونا اور پلیٹنم جیسی دھاتیں بھی تحلیل ہونے لگیں۔ علم کیمیا کی ان یجادات نے آگے چل کر مصنوعی کھاد، پلاسٹک کے سامان بلکہ کہہ لیجئے کہ سینتھٹک اشیاء کی دنیا بنانے میں کلیدی رول انجام دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جابر کو کائنات کی کیمیائی اور ریاضیاتی تفہیم پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ سرّ کائنات کی بے نقابی کے ذریعے مصنوعی مخلوق بلکہ مصنوعی انسان بنانے کا خواب بھی دیکھنے لگا تھا۔ جابر کی پرواز تخیل عہد جدید کی کلوننگ کی تحقیقات پر اثر انداز ہوئی ہو یا نہیں البتہ مغرب میں بعض ادبی شہہ پاروں پر اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔[۴۹]

نویں صدی عیسوی تک جب بصریات پر علمائے قدیم مثلاً اقلیدس [Euclid] (۲۹۵ ق م) اور جالینوس [Galen] (۱۲۹ء تا ۲۰۰ء) کا غلبہ تھا، عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اشیاء کے دکھائی دینے کا عمل بینائی کے آنکھ سے نکل کر اشیاء کی طرف جانے کے سبب ہے۔ رازی (متوفی ۳۰۰ھ) نے اس خیال کا اظہار کیا کہ صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ غالباً وہ پہلا طبیب تھا جس نے یہ رائے قائم کی کہ آنکھ کی پتلی اس میں داخل ہونے والی روشنی کی مناسبت سے پھیلتی یا سکڑتی ہے۔ ابن الہیثم، جسے قانون انعطاف (Law of Refraction) اور قانون انعکاس (Law of Reflection) کی دریافت کا اعزاز حاصل ہے، نے اس بات کے تجرباتی شواہد فراہم کیے کہ کسی شئی کو دیکھنے کے لیے روشنی آنکھوں سے نہیں نکلتی بلکہ باہر سے آنکھوں کے اندر داخل ہوتی ہے جس سے آنکھ کے اندر اس شئی کی تصویر مرتب ہو جاتی ہے اور ہم اس طرح دیکھنے پر قادر ہوتے ہیں۔ بصارت کے اصولوں کی توجیہ نے نہ صرف یہ کہ آنکھ کی اصل ساخت سے ہمیں متعارف کرایا بلکہ آگے چل کر بصریات کے قوانین مرتب کرنے اور دوربین کی ایجاد میں بھی مدد و معاون ثابت ہوئے۔ ابن الہیثم کے ایک دوسرے ہم عصر البیرونی نے روشنی کی رفتار کو آواز سے تیز تر ثابت کر دکھایا اور خود ابن الہیثم نے دنیا کو پہلی بار اس حقیقت سے باخبر کیا کہ روشنی کی رفتار بھی محدود ہے اسے بے زماں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مستقبل میں بصریات میں ہونے والی

الزہراوی اپنے چند طلباء کے ساتھ دوران علاج تعلیم دیتے ہوئے۔(ماخذ: ویلکم لائبریری لندن)

تحقیقات ابن الہیثم کے ان ہی اساسی نظریات کی مرہون منت رہیں جنھیں آج بھی بابائے بصریات یا بابائے طبیعات کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں کمال الدین الفارسی نے قوسِ قزح کے راز کو منکشف کر دیا۔[۵] اس نے بتایا کہ قوسِ قزح کا بننا دراصل فضا میں موجود قطروں میں شعاع کے ایک یا دو بار ٹوٹنے کے سبب ہے۔ شعاع کے ٹوٹنے میں زاویوں کا جو اختلاف ہوتا ہے اس سے مختلف رنگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ قوسِ قزح کی یہ بعینہ وہی توجیہ ہے جس کی دریافت کا سہرا سترہویں صدی عیسوی کے فرانسیسی مفکر ڈیکارٹ (René Descartes) کے سر باندھا جاتا ہے۔

پہلی صدی ہجری تک اہل یونان کی طرح مسلمانوں میں بھی ابجدی نمبروں کے استعمال کا رواج تھا۔ کائنات کی ریاضیاتی تفہیم وتعبیر کے لیے اعداد وشمار کا روایتی طریقہ جب ناکافی معلوم ہونے لگا تو مسلمانوں نے ہندوستانی طریقۂ شماریات سے استفادے کی کوشش کی۔ الکندی نے ہندوستانی نمبروں کو رواج دینے کی کوشش کی لیکن اسے بعض عملی پیچیدگیوں کے سبب مقبولیت نہ مل سکی۔ الخوارزمی وہ پہلا شخص ہے جس نے صفر سے نو تک کے ہندسوں میں بڑی سے بڑی گنتی لکھنے اور اس میں مختلف قسم کے حسابی تصرفات کے امکانات کی ایک نئی دنیا آباد کر ڈالی۔ الخوارزمی کی کتاب الجبر و المقابلة سے ریاضی کی دنیا میں غیر معمولی انقلاب آ گیا۔ معاملہ وراثت کی تقسیم کا ہو یا زمین کی پیمائش کا، الجبر و المقابلہ نے انتہائی پیچیدہ حساب وکتاب کو آسان اور عام فہم بنا دیا۔ آنے والے دنوں میں خوارزمی کی یہ کتاب دنیائے ریاضی میں اتنی اہمیت اختیار

علمِ نباتات پر پندرہویں صدی کا ایک عربی مخطوطہ جس کے لاطینی چربے جلد ہی عام ہو گئے۔

کر گئی کہ اسے ریاضی کی ایک مستقل شاخ، الجبرا کی حیثیت دے دی گئی اور خود اس کا نام الخوارزمی جب یورپ پہنچا تو اس سے الگورِتھم منسوب ہو گیا جس کے دم سے آج بھی دنیائے کمپیوٹنگ کی رونق قائم ہے[۵۱]

الخوارزمی کی کتاب نے ہندی اعداد اور صفر کو جس طرح متعارف کرایا اس سے یقیناً حساب و کتاب میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ البتہ اس کتاب کو ابھی ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ احمد الاقلدیسی (متوفیٰ ۹۸۰ء) نے **کتاب الفصول فی الحساب الھندی** کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے عدد سے بھی آگے بڑھ کر کسر اشاریہ (Decimal Fraction) کے جوڑ گھٹاؤ کا طریقہ ایجاد کیا[۵۲] جسے مغرب میں کئی صدیوں تک Simon Stevin (۱۵۷۸؍۱۶۲۰) کا کارنامہ سمجھا جاتا رہا۔ تیسری صدی ہجری میں ریاضی کے علم نے اتنی وسعت اختیار کر لی کہ تفریقی مساواتوں (Differential Equations) اور تکملی احصاء (Integral Calculus) کا استعمال عام ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہی مساوات (Equations) ہیں جنہیں (J.Keppler) نے سترہویں صدی کے اوائل میں حرکات سیارگاں کے حساب پر منطبق کیا۔[۵۳]

ریاضی کی بنیاد جب ایک بار اس ایقان پر رکھ دی گئی کہ اس مہیب پر اسرار کائنات میں ہر شئے ایک انتہائی باریک بین ریاضیاتی نظام پر قائم ہے تو پھر ریاضی کو سرّ کائنات کی نقاب کشائی کے عمل میں بنیادی کلّیہ بلکہ رأس الکلیہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ مسلم علماء نے اعلیٰ درجے کے ریاضیاتی مسائل پر اپنی بہترین دماغی صلاحیتیں صرف کیں۔ اب تک جو کچھ ناقابل تصور سمجھا جاتا تھا عملی طور پر ظہور پذیر ہونے لگا۔ مثال کے طور پر الماہانی کو لیجئے جس نے ریاضی کی تاریخ میں پہلی بار تیسرے درجے کی جبری مساوات وضع کی جسے وہ خود تو حل نہ کر سکا البتہ ابوجعفر الخازن نے اسے حل کر دکھایا۔ پانچویں صدی ہجری میں عمر خیام نے پہلی بار تیسرے درجے کی مساواتوں کا اصول اور حل پیش کیا البتہ وہ اس تشنگی کے ساتھ دنیا سے گیا کہ مطلق عددی حل (Absolute Numerical Solution) اس کی پہنچ سے دور رہ گیا ہے، کیا عجب مستقبل میں کوئی اور اسے ممکن کر دکھائے۔ کہا جاتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں شرف الدین طوسی نے عددی حل معلوم کر لیا تھا۔[۵۴] بات یہیں ختم

نہیں ہوگئی آنے والے دنوں میں یحییٰ المغربی (متوفی ۱۲۸۳ء) نے roots of the number کی دریافت کا طریقہ ایجاد کر ڈالا۔ اور پھر کوئی ڈیڑھ سو سال کے بعد غیاث الدین جمشید الکاشی (متوفی ۱۴۲۹ء) نے دائرے کے circumference اور radius کے تناسب کا پتہ لگا کر دنیائے ریاضی میں ہلچل بپا کر دی۔[۵۵]

عقل و اکتشاف کی اس غلغلہ انگیز تحریک نے قدیم طبّی تصورات کو بھی تقلیبِ فکر و نظر سے دو چار کر دیا۔ ابتداً اہلِ یونان کے طبّی علوم کو حرفِ آخر کی حیثیت حاصل تھی۔ جالینوسی نظامِ طب، جو اصلاً بقراط (Hippocrates) کا خوشہ چین تھا، اس مفروضے پر قائم تھا کہ تندرستی دراصل جسم میں پائے جانے والے چار مختلف قسم کے مائع مادّوں کے تناسب اور توازن سے عبارت ہے۔ ان چار رقیق مادوں کو جسے جالینوسی طب کی اصطلاح میں humor کہا جاتا تھا دراصل عناصر اربعہ ہوا، پانی، آگ اور زمین کا عکاس سمجھا جاتا تھا۔ یہ خیال عام تھا کہ اگر ان کا توازن بگڑ جائے تو جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف عیسائی دنیا چرچ کے زیر اثر اس خیال کی قائل تھی کہ بیماری دراصل ایک طرح کا خدائی انتقام ہے۔ فنّی التباسات اور مذہبی توہمات کے اس ماحول میں مسلم علمائے اکتشاف نے دنیائے طب میں بھی تجربات و مشاہدات کی قندیل روشن کی۔ کہا جاتا ہے کہ جب بغداد میں مرکزی ہاسپٹل کا منصوبہ سامنے آیا تو اہل فن نے سب سے پہلے گوشت کے ٹکڑے شہر کے مختلف مقامات پر آویزاں کر دیئے پھر اس جگہ کو ہاسپٹل کے لیے منتخب کیا جہاں گوشت کے خراب ہونے کا عمل نسبتاً سست تھا۔ اس واقعہ سے کم سے کم اتنا تو پتہ چلتا ہی ہے کہ اس ابتدائی عہد میں بھی جب طبّ کی مروجہ کتابوں کا تحلیل و تجزیہ جاری تھا اور اس فن کی بنیاد رکھی جا رہی تھی، مسلم اطباء پر جرثومے کی دنیا بے نقاب ہو چکی تھی یا کم از کم وہ جرثومے کی مضرت رسانی سے واقف ہو چکے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں علمائے فقہ کو اس حقیقت پر قائل کرنے میں بسا اوقات دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔[۵۶]

نویں صدی عیسوی کی ابتداء میں ہی حُنین بن اسحاق، جو جالینوس کا پہلا عربی مترجم ہے، نے جالینوس کی بعض صریح غلطیوں کا اندازہ کر لیا تھا لیکن اسے معمولی ترمیم سے آگے ہمت نہ ہوئی۔ جالینوس کی Anatomy کا تو یہ حال تھا کہ اس کے بعض نقائص اہل فن پر واضح ہو گئے تھے لیکن کسی کی یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس سے انکار کرتا۔ عام رویّہ یہ تھا کہ اگر جالینوس نے یوں لکھا ہے تو یقیناً یہ سچ ہوگا خواہ مشاہدہ اس کی تردید کرتا ہو۔ البتہ رازی [Rhazes] (پ ۸۶۵) وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی کتاب شکوک لکھ کر جالینوس کے بت کو ہمیشہ کے لیے پاش پاش کر دیا۔[۵۷] رازی نے پہلی بار چیچک (small pox) اور خسرہ (Measles) کے فرق کو واضح کیا اور اس فن پر چند بنیادی کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ اس نے جملہ امراض اور اس کے علاج پر مشتمل الحاوی کے نام سے تیئیس جلدوں میں دنیائے طب کا ایک ایسا خزینہ مرتب کر ڈالا جس کی مثال اس سے پہلے انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ چوتھی صدی ہجری میں ابوالحسن الطبری نے خارش کا سبب اور اس کے جرثومے سے پہلی بار دنیا کو باخبر کیا۔[۵۸] ابن سینا نے تپ دق کے متعدی ہونے کی بات کہی[۵۹] اور اسی صدی میں ابوالقاسم الزہراوی نے دموی

امراض کا پتہ لگایا۔[۱۰] پانچویں صدی میں عبدالملک بن زہر نے دنیا کو غلافِ قلب کے اورام (Pericarditis) سے آگاہ کیا۔[۱۱]
الحاوی کی اشاعت کو ابھی ڈیڑھ صدی گذری ہوگی کہ ابن سینا نے اپنا نیا شہرہ آفاق مخزنِ طبی **القانون فی الطب** شائع کر دیا۔ ابن سینا کے **القانون** نے صدیوں شرق وغرب میں اہل فن کی رہنمائی کی اور مغرب کی دانش گاہوں میں کوئی پانچ چھ سو سالوں تک اسے طب کی ام الکتاب کی حیثیت حاصل رہی۔ ابن سینا کے ایک نوجوان معاصر ابوالقاسم الزہراوی [Abulcasis] (متوفیٰ ۱۰۱۳ء) نے **کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف** کے نام سے تیس جلدوں میں ایک ایسے مخزن طبّی کی تالیف کی جس میں دنیائے طب کا عطر کشید کر لیا گیا تھا۔ اس کتاب کی چھبیس جلدیں علم الادویہ سے متعلق تھیں جب کہ آخری جلد صرف سرجری کے لیے مختص کی گئی تھی۔ الزہراوی کا یہ کارنامہ چونکہ اندلس کی سرزمین پر انجام پایا تھا اس لیے مغربی دنیا پر اس کے اثرات فی الفور پڑے۔ کہا جاتا ہے کہ عمل جراحی کے بعض پیچیدہ مسائل جن کے حل کا سہرا مغربی اہل فن کے سر باندھا جاتا ہے واضح طور پر زہراوی کی کتاب میں موجود تھے۔ مثلاً بڑی نسوں سے خون بہنے کی روک تھام کا طریقہ جسے سولہویں صدی کے فرانسیسی جراح Ambroise Paré کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے یا فن تولید میں جرمن طبیب Walcher (متوفیٰ ۱۹۳۵ء) سے منسوب Walcher Position یا زخموں کی سلائی کے لیے FriedrichTrendelenburg (متوفیٰ ۱۹۲۴ء) سے منسوب ٹرنڈلنبرگی طریقہ ہی یہ تمام طریقے ابوالقاسم الزہراوی کے یہاں معروف تھے۔[۱۲]

تیرہویں صدی عیسوی میں ابن سینا کے بعض طبی تصورات پر شکوک وارد کئے گئے۔ ابن النفیس (پ ۱۲۱۳ء) نے انسانی نبض کے سلسلے میں پرانے تصورات کی نہ صرف یہ کہ نفی کی بلکہ **القانون** کے مقابلے میں علم طب کی ایک نئی درسی کتاب تیار کی جس نے جلد ہی عالم اسلامی میں **القانون فی طب** کی جگہ لے لی۔ ابن النفیس نے اپنی تالیف کتاب **شرح تشریح القانون** میں جالینوس کے اس خیال کی سختی سے تردید کی کہ قلب کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں خون جانے کے لیے بیچ میں کوئی سوراخ بنا ہوتا ہے۔ ابن النفیس نے دنیا کو اس حقیقت سے متعارف کرایا کہ قلب کے دائیں حصّے سے بائیں حصّے میں خون جانے کا کوئی اور راستہ پھیپھڑے کے علاوہ نہیں ہوسکتا۔ ابن النفیس کی اس دریافت کو نئی اصطلاح میں pulmonary transit کہا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو دورانِ خون کی دریافت کا سہرا جو ۱۶۲۸ء میں William Harvey کے سر باندھا گیا اس کا سہرا تیرہویں صدی عیسوی میں ابن النفیس سے جا ملتا ہے۔

اکتشافی تمدّن کا قیام

نئے مسلم دماغ نے تحقیق واکتشاف کی ایک ایسی غلغلہ انگیز تحریک برپا کی جس نے زندگی کے تمام ہی گوشوں کو ایک تقلیبِ مسلسل سے دوچار کئے رکھا۔ کائنات کی یہ نئی تفہیم جس کے مطابق دنیا اہل فکر کے لیے دعوتِ شوق ٹھہری اور جہاں یہ احساس مسلسل عام ہوتا رہا کہ {**إن فی اختلاف اللیل والنہار وما خلق اللہ فی السمٰوات والارض لآیات لقوم**
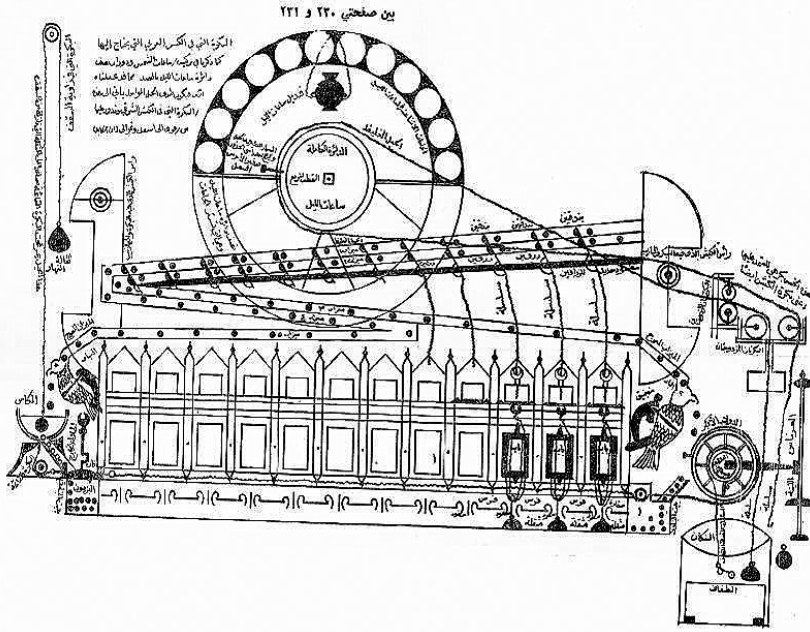
مسجد اموی دمشق میں رضوان الساعتی کی مشہور زمانہ آبی گھڑی کا ڈائیگرام

یتقون } ایک ایسی ثقافت کے قیام پر منتج ہوا جو ظن وتخمین کے بجائے مشاہدے اور یقین سے غذا حاصل کرتا۔ خدا کی اس مہیب پر اسرار کائنات کا مشاہدہ، اس کی تخلیقی نشانیوں پر غور وفکر، سنت اللہ کے اسرار سے کسی قدر آ گہی اور {سیروا فی الارض } کی قرآنی دعوت نے مسلم ذہن کو ہر لمحہ اس احساس سے دو چار کئے رکھا گویا تسخیر واکتشاف کا یہ عمل ایک انبساط انگیز مگر کبھی نہ ختم ہونے والا سفر ہو کہ

آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

گذشتہ صفحات میں ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ استخراجی سے استقرائی منہج علمی کی تبدیلی نے کس طرح علمائے متقدمین کے مسلّمات کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ساسانی، ہندی، اور یونانی علوم جب تجربہ اور مشاہدہ کی کسوٹی پر بار بار پرکھے گئے تو بڑے بڑے اساطینِ وقت کا اعتبار جاتا رہا۔ بطلیموس ہوں یا جالینوس، ارسطو ہوں یا اقلیدس جن کے علمی دبدبے نے صدیوں سے تلاش حق کی راہ مسدود کر رکھی تھی، وہ اس نئے منہج علمی کی تاب نہ لا سکے۔ مشاہدے کی یہ لے مسلسل تیز ہوتی رہی یہاں تک کہ {سیروا فی الارض }کی قرآنی دعوت نے بعض مہم جو نوجوانوں کو، خدا کی یہ دنیا جیسی کہ وہ ہے، اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر مہمیز کیا۔ اس سلسلے میں ابن جبیر (متوفی ۱۲۱۷ء) اور ابن بطوطہ

(متوفی ۱۳۷۷ء) کے نام آج بھی اساطیری اہمیت کے حامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۳۲۵ء میں ابن بطوطہ جو اس وقت اکیس سال کا ایک نوجوان تھا حج کے سفر پر روانہ ہوا۔ چوبیس سال بعد جب گھر واپس آیا تو وہ عالم عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان، روس، افریقہ، چین، اور سماترا کی سیر کر چکا تھا۔ ابن جبیر اور ابن بطوطہ کے سفر ناموں نے دنیائے شوق کا آنکھوں دیکھا حال پیش کیا۔ اس طرح مختلف اقوام وتہذیب کے بارے میں پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے شخص واحد کا مصدقہ تجربہ سامنے آیا۔ ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱ء) نے پہلی بار اس امر کا انکشاف کیا کہ دنیائے شوق کے سفر میں جب مسافر ایک سمت سے دوسری سمت کا سفر کرتا ہے تو اسے دنوں کے گھٹنے بڑھنے اور کبھی اچانک وقت کے ٹھہر جانے کا احساس ہوتا ہے۔ یاقوت الحموی (متوفی ۱۲۲۹ء) نے **معجم البلدان** لکھ کر دنیا کے تقریباً تمام ہی معروف شہروں میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور کہاں کیسے لوگ آباد ہیں، ایک ایسا جام جہاں نما فراہم کر دیا جہاں بیک نظر اقوام عالم کی تمام تر جلوہ نمائیوں کو ملاحظہ کیا جا سکتا تھا۔

معاصر دنیا سے عملی آگہی، سفر کا شوق، مخازن علمی کی اشاعت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عالم اسلام کی وسیع سرحدوں کے اندر، جس میں متمدن دنیا کا غالب حصہ شامل تھا، اکتساب واستفادے کی عمومی لہر نے انسانی تہذیب کو ایک ایسی تجربہ گاہ فراہم کر دی تھی جہاں بیک وقت مختلف خطّوں کے علوم اور مختلف ثقافتوں کے ماحصل کا ارتکاز نظر آتا تھا۔ مثال کے طور پر اہل اُندلس کی زراعتی تکنیک نے، جہاں سال میں کئی فصلوں کا رواج تھا، اہل عراق کو ایک سے زیادہ فصل کی راہ دکھائی۔ اہل ایران جن کے یہاں نہروں کے ذریعے آبپاشی اور نشیبی زمینوں سے اوپر پانی پہنچانے کی روایتی تکنیک تھی، وہ اہل عراق واہل شام کے کام آئی۔ مختلف قسم کے پھل ایک علاقہ سے دوسرے علاقوں میں متعارف ہوئے۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے ایک زراعتی انقلاب نے پورے عالم اسلام کو اپنی انبساط انگیز آغوش میں لے لیا۔ عمومی خوشحالی کے اس ماحول نے، جس کا احساس آٹھویں صدی عیسوی سے ہونے لگا تھا اہل اکتشاف کے لیے ایک سازگار ماحول فراہم کیا۔ فرصت کے اس ماحول میں اہل فن نے بعض ایسی ایجادات بھی پیش کیں جن کا مقصد بظاہر تو عقل کو حیران کرنا تھا لیکن فی الاصل یہ اس خیال کی داعی تھیں کہ کائنات کے بعض قوانین کی بنیادی تفہیم سے ایک نئے عالم طلسم کا قیام ناممکن نہیں۔ بنوموسیٰ جو تاریخی مصادر میں ایک ماہر مشین ساز کی حیثیت سے متحرک نظر آتے ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے خود کار کھلونوں کی ایک دنیا آباد کر دی تھی۔ رنگ بدلتے فوارے، خود کار سریلی بانسریاں حتیٰ کہ چھوٹی سی روبوٹ لڑکی جو آپ کی خدمت میں چائے پیش کر سکے۔[۶۳] گیارہویں صدی عیسوی میں اسپین کے شہر طلیطلہ میں الزرقالی (Arzachel) نے ایک ایسی آبی گھڑی بنائی جو وقت بتانے کے ساتھ ساتھ چاند کی گردش سے بھی مطلع کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کئی صدیوں تک یہ گھڑی طلیطلہ کے عجائبات میں شمار ہوتی رہی یہاں تک کہ ایک ماہر فن نے اس کا راز جاننے کے لیے اسے کھول کر دیکھا اور پھر دوبارہ اسے اپنی اصل حالت پر قائم نہ کر سکا۔[۶۴]
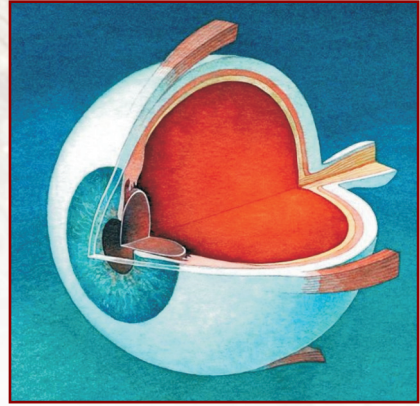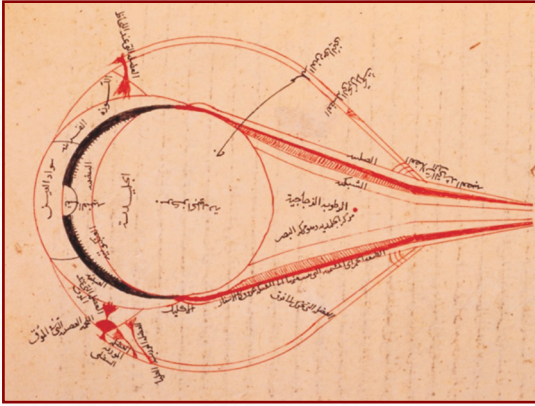
تنقیح المناظر میں آنکھ کی ماہیت کا ڈائیگرام جو حیرت انگیز طور پر نئی تحقیقات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

نزولِ وحی کے پیدا کردہ اس عالم اکتشاف نے عام ذہنوں کو جس اعتماد سے آشنا کیا تھا اس کا کسی قدر اندازہ اُن علمی اور تجرباتی سرگرمیوں سے ہوتا ہے جو مسلسل ان صدیوں میں مختلف بلاد وامصار میں ہوتی رہیں۔ یہ احساس عام ہو چلا تھا کہ خدا کی اس کائنات میں جو انسانوں کے لیے تسخیر کی گئی ہے قوانین فطرت سے آگہی ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ بحر و بر کی تسخیر، خشکی وتری پر انسانوں کی چلت پھرت کے مناظر تو دنیا نے بہت دیکھے تھے، نویں صدی عیسوی کے شہر قرطبہ میں عباس بن فرناس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ہوائی سفر کا منصوبہ بنایا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن اس نے اچانک جامع قرطبہ کے ایک بلند منارہ سے چھلانگ لگا دی۔ اس نے پیراشوٹ جیسی کوئی چیز پہن رکھی تھی۔ اس تجربہ سے حوصلہ پا کر اس نے دوسری بار باز کی ساخت کا ایک لکڑی کا فریم بنایا۔ وقت مقررہ پر ایک جم غفیر اس تماشے کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا۔ اس نے بلندی سے اڑان بھری کوئی دس منٹ تک ہوا میں چکر لگانے کے بعد اس کا جہاز زمین میں آ گرا، اس کی پشت مجروح ہو گئی۔ دوبارہ اس ستّر سالہ بوڑھے کو مزید تجربے کا موقع نہ مل سکا۔[۶۵]

تحریک اکتشاف کے عمومی غلغلے نے صرف مسلم ذہن کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ غیر مسلم علماء ومفکرین بھی اس تحریک کا حصّہ بن گئے۔[۶۶] ابتدائی صدیوں میں جب مسلم ریاست کی سرحدیں مسلسل وسیع ہوتی جاتی تھیں عددی اعتبار سے مسلمان اقلیت میں تھے۔ البتہ ان کے اکتشافی طرز فکر نے فکری اور علمی سطح پر پورے معاشرے کو اپنے دائرۂ اثر میں سمو لیا تھا۔ رنگ ونسل، زبان وزمان اور مذہب وملت کے سارے امتیاز سے بالاتر ہو کر پورا معاشرہ اس تحریک میں شریک تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس عظیم الشان مہم کی قیادت اہل ایمان کے ہاتھوں میں تھی۔ تب متبعین محمدؐ اس یقین واثق کے حامل تھے کہ انھیں غیاب پیمبری میں اقوام عالم کی سیادت یا {شھداء علی الناس} کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور اس لیے رازِ کائنات کی بے نقابی اور اس کی اطلاقی منصوبہ بندی ان کے ملی منشور کا حصّہ ہے۔ رہے وہ لوگ جو اس ہزار سالہ اکتشافی تحریک کے باوجود جس نے مغرب کے عہد تاریک کو روشنی بخشی اور آج بھی جس کی بنیادوں پر جدید سائنسی تہذیب کا چراغ روشن ہے،
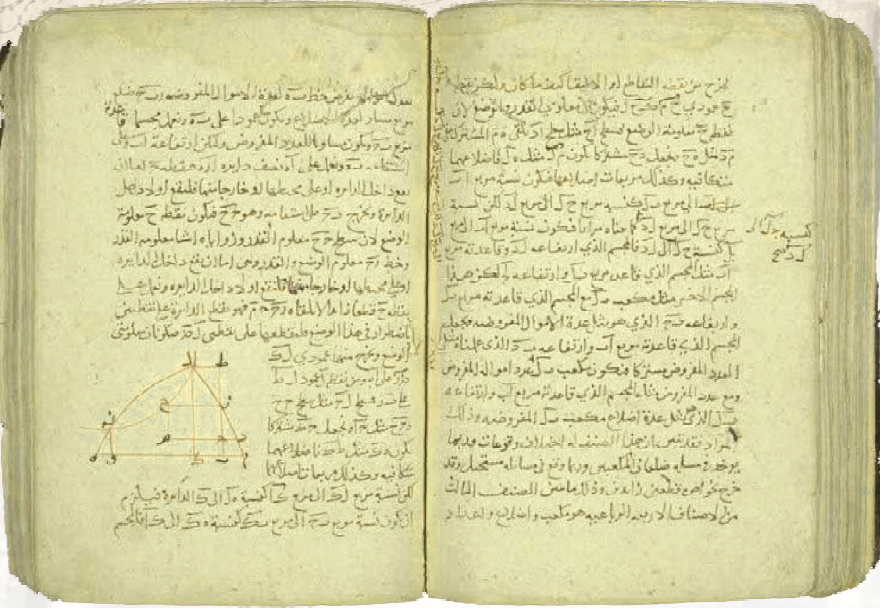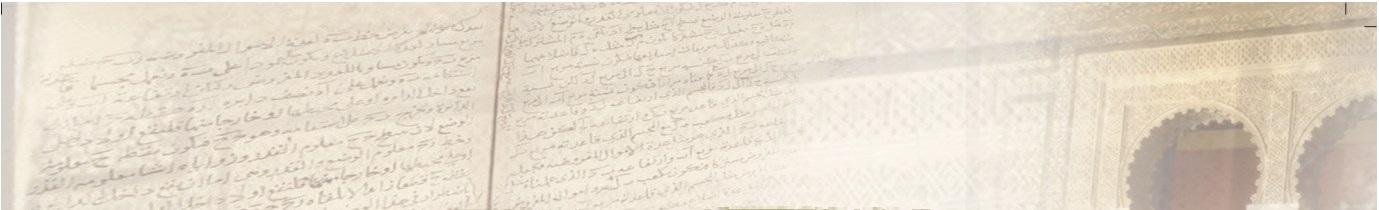
عمر خیام (۱۰۴۸-۱۱۳۱ء) کے مقالة فی الجبر و المقابلة کا ایک ورق

یہ کہتے نہیں تھکتے کہ اسلام میں سائنس کے پنپنے کے امکانات معدوم ہیں تو وہ دراصل بدترین قسم کے تعصب اور سخت ناواقفیت کا شکار ہیں۔[۶]

گذشتہ صفحات میں ہم قدرے تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ عالم اسلامی میں ہر دور میں تحریک اکتشاف کی کمان جن لوگوں کے ہاتھوں میں رہی ہے وہ وحی ربانی کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ ان میں سے بیشتر لوگوں نے تفسیر و تاویل اور فقہ و کلام جیسے روایتی دینی علوم پر باضابطہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اہم اکتشافی کتابیں جو علومِ اکتشاف میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کی اشاعت نے ہماری تہذیب کو تقلیب فکر و نظر سے دوچار کیا ہے ان کے ابتدائی صفحات اس بات پر گواہ ہیں کہ مصنف نے ان کتابوں کو خالص دینی جذبے سے تحریر کیا ہے جن پر وہ خدا سے بہترین اجر کے طالب رہے ہیں۔ اگر مسلمان اس عمل کو اپنا فریضہ منصبی نہ سمجھتے تو اس تحریک کے پیچھے عوامی تائید کا فقدان ہوتا۔ پھر نہ تو عباسی بغداد میں **بیت الحکمة** کا علامتی ادارہ وجود میں آتا اور نہ ہی اتنے بڑے پیمانے پر تاریخ کے مختلف ادوار میں رصد گاہوں اور تجربہ گاہوں کی ریت قائم ہوتی۔ حتیٰ کہ فقہی التباسات کے اس عہد نمناک میں بھی جب کلامی فقہ کے مجادلوں سے امت کا وجود لہولہان تھا، ایک فقہی گروہ دوسرے کا خون بہانا مباح سمجھتا، رصد گاہوں اور تجربہ گاہوں پر عوامی تادیب کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان علمی اور اکتشافی سرگرمیوں کو حکمراں اپنے سیاسی جواز پر محمول کرتے جس کا ایک بیّن ثبوت خود عہد عباسی میں **بیت الحکمة** کا قیام بھی ہے۔

ہمارے مورخین نے بیت **الحکمۃ** کے بیان کو غیر معمولی اہمیت دے رکھی ہے۔ اس کا ایک سبب تو شاید یہ ہے کہ جہاں دمشق کی جامع اموی کی علمی سرگرمیاں بنوامیہ کے زوال کے سبب حاشیہ پر چلی گئیں وہیں **دارالحکمۃ** کے موسسین کی حکومت کا سلسلہ کوئی پانچ سو سالوں تک چلتا رہا جس کے اثرات تاریخ نگاری پر پڑنا فطری تھے۔ نزول وحی کے بعد تسخیر و اکتشاف کا جو عمومی غلغلہ بلند ہوا تھا اس نے مختلف بلاد و امصار میں رصد گاہوں، لائبریریوں اور علمی مجالس کا جال بچھا دیا تھا۔ عالم اسلام کا کوئی ایسا قابل ذکر شہر نہ تھا جہاں چوٹی کے علماء و مفکرین کا ایک قابل ذکر گروہ نہ پایا جاتا ہو۔ اہل فن کی اس کثرتِ تعداد کے سبب ہی یاقوت الحموی (۱۱۷۹ء ۱۲۲۹ء) کو مختلف سوانحی معاجم مثلاً **معجم الادباء**، **معجم الشعراء** اور **اخبار الشعراء** وغیرہ مرتب کرنے کی تحریک ملی۔

کہا جاتا ہے کہ دمشق میں اموی حکمرانوں نے جو پہلی باضابطہ لائبریری قائم کی اس میں اس عہد کا تمام علمی سرمایہ جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ طب، الکیمی اور اجنبی زبانوں میں مختلف علوم کے مخطوطات ہر خاص و عام کے استفادے کے لیے مہیا کرا دیئے گئے۔ آگے چل کر جب فاطمیوں نے مصر میں ایک نئی خلافت کی بنیاد رکھی تو ان کی اسکیم میں بھی لائبریریوں کو خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ کہا جاتا ہے کہ فاطمی خلیفہ العزیز کے عہد میں صرف علومِ عہدِ قدیم سے متعلق کتابوں کے لیے چالیس کمرے مختص کئے گئے تھے۔[۶۸] عوامی زندگی میں کتابوں نے کس قدر اہمیت اختیار کر لی تھی اس کا کسی قدر اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ۱۲۳۴ء میں بغداد میں جب مدرسہ مستنصریہ کا قیام عمل میں آیا تو خلیفہ نے اپنے ذاتی کتب خانے سے اسے اسّی ہزار کتابیں مرحمت فرمائیں۔ مسجد جسے مسلمانوں کی سماجی زندگی میں کلیدی اہمیت حاصل رہی ہے لائبریری کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی جہاں مختلف امور پر ہمہ دم علمی مناقشوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ دمشق، بغداد اور قاہرہ کے تذکروں سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ بڑی
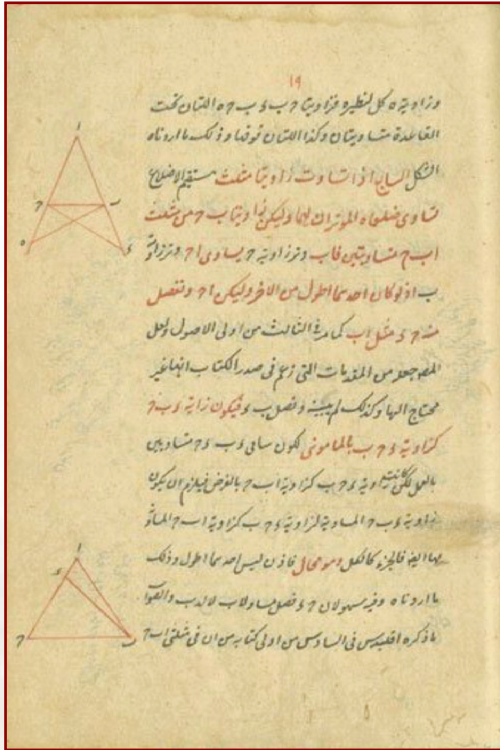
قاضی زادہ الرومی (۱۳۶۴-۱۴۳۶ء)
کی جیومیٹری کی کتاب کا ایک صفحہ

لائبریریوں کی سہولت صرف دارالخلافہ یا بڑے شہروں تک محدود تھی۔ دسویں صدی عیسوی کے شیراز میں ایک ایسی لائبریری کا تذکرہ ملتا ہے جو تین سو ساٹھ کمروں پر مشتمل تھی اور جس کے ارد گرد نہروں اور باغات کا دلفریب سلسلہ قائم تھا۔[۶۹] صرف مَروْ کے شہر میں، جیسا کہ یاقوت نے لکھا ہے، تیرہویں صدی عیسوی میں دس عظیم الشان لائبریریاں تھیں۔ بغداد جو مدرسوں کا شہر سمجھا جاتا تھا اور جہاں اس وقت تیس مدرسے قائم تھے ہر مدرسے کی اپنی الگ لائبریری ہوا کرتی تھی۔[۷۰] کہا جاتا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی کے مصر میں جب القاضی الفاضل نے ایک مدرسہ قائم کیا تو اس نے اس مدرسے کو خود اپنی طرف سے ایک لاکھ کتابوں کا عطیہ دیا۔[۷۱] اس صورتِ حال کا موازنہ اگر اس وقت کی دوسری لائبریریوں سے کیجئے تو اس لائبریری کلچر کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیرس کی مشہور زمانہ سوبون یونیورسٹی کی لائبریری میں چودہویں صدی عیسوی میں صرف دو ہزار کتابیں پائی جاتی تھیں جبکہ ویٹیکن کی مرکزی لائبریری پندرہویں صدی عیسوی میں کل دو ہزار دو سو ستاون (۲۲۵۷) کتب پر مشتمل تھی۔[۷۲]

سماجی زندگی میں لائبریریوں کو مسجد کے ساتھ مرکزی اہمیت مل جانے اور تعلیم و تعلّم کی اس عمومی فضا کے قیام میں کاغذ کی صنعت نے اہم رول ادا کیا۔ ابتدائے اسلام میں چرمی اوراق یا رقِ المنشور (Papyrus) کے استعمال کا رواج عام تھا جس کے سبب کتابیں خواص کے حلقے تک محدود تھیں۔ آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں بغداد میں پہلی کاغذ کی فیکٹری قائم ہوئی۔[۷۳] جلد ہی اس صنعت کو اتنا فروغ ہوا کہ بغداد کے بازار کاغذ فروشوں اور اسٹیشنری کے ساز و سامان سے بھر گئے۔[۷۴] کہا جاتا ہے کہ بغداد میں صرف لکھنے پڑھنے کی اشیاء کے لیے ایک پورا بازار وجود میں آ گیا تھا جسے سوق الورّاقین کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کاغذ کی یہ عام دستیابی گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب تک علم و فن کی جو دنیا صرف خواص کے لیے محدود تھی اب اس کے دروازے عامۃ الناس پر وا کر دیئے گئے ہیں۔

خلاصۂ بحث

قرآنی دعوتِ تسخیر و اکتشاف نے علم کی جو عمومی تحریک پیدا کی تھی وہ فکری اور سماجی طور پر اس حد تک مسلم معاشرے کا حصّہ بن گئی تھی کہ اس پر سیاسی انقلابات کے اثرات کم ہی پڑتے تھے۔ خلافتیں تاراج ہوتیں، حکمراں تبدیل ہوتے لیکن علم و فن کی شمع تابندہ رہتی۔ خلافت راشدہ کا سیاسی سفر، سفرِ معکوس میں مبتلا، عباسی بغداد، فاطمی مصر اور اموی اسپین میں انتشار کا شکار ہوا لیکن مسلم ذہن کی تابانی، اجنبی علوم کی تنقیح و تنقید اور سرّ کائنات کی نقاب کشائی میں مشغول رہی کہ اب مسلم تہذیب نے 'صورتِ خورشید' جینے کا فن سیکھ لیا تھا۔ بغداد پر زوال آیا تو قرطبہ چمکنے لگا اور جب اسپین میں امویوں کا چراغ گل ہونے لگا تو دمشق، استنبول، تاشقند، سمرقند، بخارا، کابل، قاہرہ، دہلی اور نہ جانے کتنے شہر ہماری تہذیبی فتوحات کا علامیہ بن گئے۔
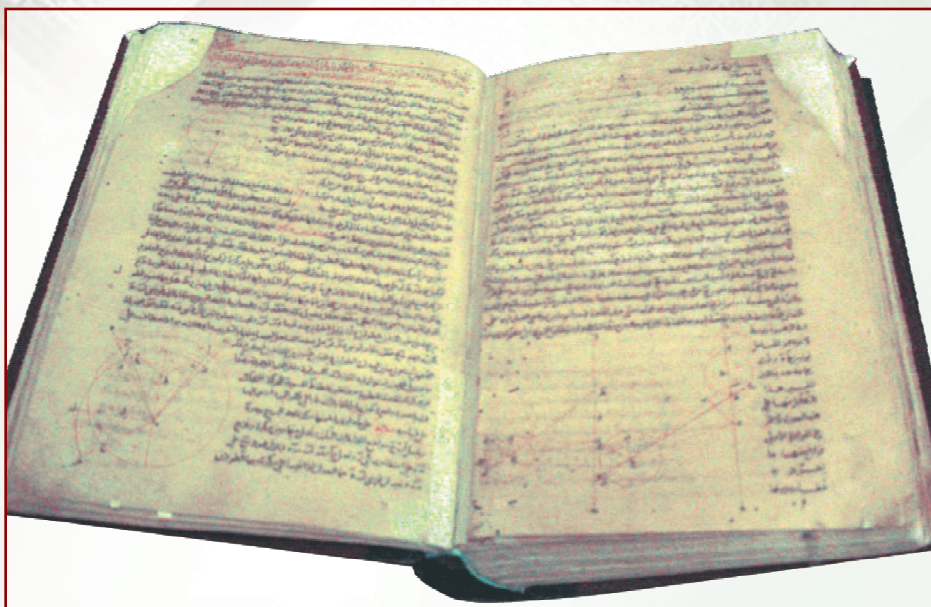
البیرونی کی قانون المسعودی کی ایک جھلک

قرآن مجید کی دعوتِ فکر بالآخر سرِّ کائنات کی بے نقابی پر منتج ہوئی۔ ابتداء میں تو مسلمانوں نے ساسانی، یونانی اور ہندی مآخذ سے ملنے والی دانشِ انسانی سے بھرپور اکتساب کی کوشش کی لیکن علم و حکمت کی اس تنگ دامانی کا جب انھیں اندازہ ہوا تو پھر وہ مشاہدے اور تجربے کی راہ پر چل نکلے۔ وہ علمی مفروضات جس کی صداقت تجربات و مشاہدات سے نہ ہوتی ہونا قابل اعتنا قرار پائے۔ بطلیموسی نظام اور دانشِ یونانی جسے عیسائیت نے معتبر قرار دے رکھا تھا اور جو صدیوں سے انسانی فکر کی پیش قدمی میں مزاحم تھے بالآخر بڑی ردّ و کد اور تحقیق و جستجو کے بعد مسترد کر دیئے گئے۔ جس دن ابن الہیثم نے بطلیموسی نظام کی صداقت پر اعتراض وارد کر دیا تھا تو بس سمجھ لیجئے کہ اسی دن جدید سائنس کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ آگے چل کر جب مراغہ کی رصد گاہوں میں منہمک ماہرین فلکیات نے مشاہدے کو علم کائنات کی اساس قرار دے ڈالا اور جس کے نتیجے میں ابن شاطر کی تصنیف کتاب نہایۃ السول فی تنقیح الاصول وجود میں آئی تو علمائے فن اس اعتماد سے سرشار ہو گئے کہ انھوں نے مستقبل کی علمی اساس کا بڑا کارنامہ انجام دے ڈالا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ابن شاطر کا یہ کارنامہ کوئی ڈیڑھ سو سال بعد جب کوپرنکس کے حوالے سے مغرب میں عام ہوا اور بعد کی تحقیقات نے ان اساس پر ایک نئی دنیا تعمیر کر ڈالی تو کچھ تو تعصب اور کچھ بے خبری کے سبب مغرب اس خیال سے غافل رہا کہ سر کائنات کی بے نقابی کا سرا اس قرآنی

دائرۂ فکر میں پایا جاتا ہے جس نے کائنات پر غور وفکر کو ایک مذہبی فریضے کی حیثیت دے رکھی ہے۔ گو کہ ارسطو کی کتابوں کے تراجم نے مسلم ذہن کو وقتی طور پر مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ ایسا اس لیے کہ علوم کا یونانی تصور اولاً خاصا محدود تھا۔ نیچرل فلاسفی جسے بسا اوقات فزکس کا نام بھی دیا جاتا تھا، کے علاوہ میٹا فزکس اور میتھ میٹکس پر تمام علوم کا احاطہ ہوجاتا تھا۔[۴۵] دوسری طرف ارسطا طالیسی تصور کائنات میں دنیا کو ایک ازلی ابدی حقیقت کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا تھا۔ خدا کے ساتھ ساتھ کائنات کے قدیم ہونے کا تصور قرآنی دائرۂ فکر سے مغائر تھا۔ ابتداً مسلم اہل فکر کے لیے ان خیالات سے مطابقت پیدا کرنا یا انھیں یکسر مسترد کرنا خاصا دشوار ثابت ہوا۔ البتہ جب کائنات پر غور وفکر کے لیے عقلی اور سائنسی بنیادیں مستحکم ہوتی گئیں تو نہ صرف یہ کہ کائنات کے بارے میں یونانی تصورات پس پشت چلے گئے بلکہ علوم کی یونانی روایتی تقسیم اکتشافی عمل کے لیے ناکافی محسوس ہونے لگی۔ مثال کے طور پر ابن الہیثم نے جب **کتاب المناظر** لکھی یا البیرونی نے **کتاب تحدید نہایة الأماکن** تصنیف کی تو انھیں اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ علوم کی بالکل ہی نئی شاخوں کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ اس عہد کی تصنیفات پر ایک نگاہ ڈالئے تو حیرت ہوتی ہے کہ جن باتوں کے اب تک صرف عمومی اور سرسری تذکرے کو دانش کی معراج سمجھا جاتا تھا ان پر بہت قلیل عرصے میں باضابطہ تخصیصی کتابیں لکھی جانے لگیں۔ کوئی **کتاب علم الهندسه** لکھ رہا ہے تو کوئی **کتاب الجبر و المقابلة** لکھنے میں مصروف ہے اور کسی کا شوقِ تحقیق اسے **کتاب النجوم** کی تصنیف پر آمادہ کر رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض مسلم اہل علم ارسطو سے خاصے متاثر رہے[۴۶] البتہ عالم اسلام کے مجموعی ماحول پر قرآنی تصور کائنات اور مذہبی جذبۂ شوق وتحقیق غالب رہا۔ اور اگر مامون کے اس خواب[۴۷] کو بھی اس پس منظر میں رکھئے جو اس نے ارسطو سے متعلق دیکھا تھا تو اس بات کا سمجھنا دشوار نہیں رہتا کہ ابتدائی ایام میں یونانی علوم ودانش کو بنیادی طور پر مسلم دائرۂ فکر کے معاون کے طور پر دیکھا جاتا رہا۔

بعض مفکرین اس غلط فہمی کا شکار رہے ہیں کہ جدید سائنس خالصتاً مغرب کی ایجاد ہے۔[۴۸] وہ اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ عہد وسطیٰ میں عالم اسلام اپنی تمام تر علمی اور فکری ترقی کے باوجود جدید سائنس کے پیدا کرنے میں ناکام رہا۔ ان حضرات کے خیال میں اسلام کی کچھ ساخت ہی ایسی ہے کہ وہاں غور وفکر اور مشاہدہ وایجاد کی بیل منڈھے نہیں چڑھتی۔ زوال کی صدیوں میں مسلمانوں کے لیے اس قسم کی جلی کٹی باتیں اور فارق الحقائق الزامات کچھ نئے نہیں رہے ہیں۔ ان معترضین سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ اولاً اگر قدمائے یونان کی کتابیں عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوکر ان تک نہ پہونچتیں تو کیا وہ (مفروضہ) جدید سائنس کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوجاتے؟ ثانیاً علمائے یونان کے عربی تراجم اس ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ اسلامی تہذیب میں علم وحکمت کی بالیدگی کی خاصی گنجائش موجود رہی ہے۔ ثالثاً قدمائے یونان کی کتابیں اگر ایک علمی سائنسی انقلاب کے لیے کافی تھیں تو پھر ان کتابوں نے، جب وہ اپنی اصل شکل میں رومی سلطنت کے علاقوں میں موجود تھیں، کوئی سائنسی انقلاب کیوں نہیں پیدا کیا؟ رابعاً آخر کیا وجہ تھی کہ ساسانی، رومی اور ہندی مآخذ

نجیب الدین محمد علی السمر قندی (متوفی ۱۲۲۲ء) کی الادویۃ المعروفۃ المستعملۃ کے ابتدائی صفحات

سے آنے والے علم وفن اپنی اصل سرزمینوں میں وہ نتائج نہ پیدا کر سکے لیکن جب قرآنی دائرۂ فکر میں انسانی تہذیب کے اس علمی ورثے کو تحلیل وتجزیے کا موضوع بنایا گیا تو ایک انقلاب آگیں کیفیت پیدا ہوگئی؟ خامساً مسلمانوں نے دانشِ یونانی کے التباسات کو وحی ربّانی کی روشنی میں اور اپنے تجربے اور مشاہدے کے ذریعے مسلسل چاک کرنے کی کوشش کی۔ اس عمل میں وہ گاہے بگاہے التباسات کا شکار تو ہوئے اور کبھی ایسا بھی لگا گویا قرآنی دائرۂ فکر دانشِ انسانی سے متصادم ہو گیا ہو لیکن بالآخر وحی ربّانی نے ان کی دستگیری کی اور وہ اکتشاف وتسخیر کی راہ پر آگے بڑھتے گئے۔ عہدِ وسطیٰ میں جب مغربی ذہن پر چرچ کی بند دماغی کا تسلط قائم تھا اور جب انسانی ذہن اپنے ہی پیدا کردہ التباسات ومفروضات کا اسیر بن کر رہ گیا تھا اور جب اس تعذیب انگیز گھٹن سے نجات کی کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی اس وقت عربی کتابوں کے لاطینی ترجمے اہل مغرب کے لیے آخری منارۂ نور کی حیثیت رکھتے تھے، جس سے چھن کر آنے والی روشنی ان کی علمی مجلسوں کی رونق قائم رکھتی۔ گویا آج مغرب ہی کیا ساری دنیا میں علم وفن کے جو مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں ان سب کی اساس اسی قرآنی دائرۂ فکر میں پائی جاتی ہے جس نے کائنات پر غور وفکر کو ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت دی اور پھر تمام علوم حاضرہ اور متقدمہ سے اکتساب کا فن سکھایا۔

تعلیقات وحواشی

۱۔ محمد بن اسحاق بن یسار، سیرت ابن اسحاق، تحقیق وتعلیق محمد حمید اللہ، ترجمہ نور الٰہی ایڈوکیٹ، نئی دہلی ۲۰۰۰ء ص ۱۵۰۔

۲۔ گوکہ بت پرستی کے ذریعہ سماجی نظام کو ایک تقدس عطا کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس خلاء کا احساس بھی پایا جاتا تھا کہ بت پرستی ایک فلسفۂ حیات کی حیثیت سے کائنات اور فطرت کے سلسلے میں بنیادی سوالات کا کوئی تشفی بخش جواب فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ پھر عام زندگی میں بھی بتوں کا احترام یا مسلّمہ معروف کی پاسداری اسی وقت تک کی جاتی تھی جب تک ان سے مطلب براری کا امکان پایا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ امراء القیس نے اپنے باپ کے انتقام کے سلسلے میں اپنے بت سے اجازت حاصل کرنے کی تین مرتبہ کوشش کی لیکن جب اسے لگاتار مطلوبہ اشارے حاصل نہ ہوئے تو اس نے یہ کہتے ہوئے اپنی راہ لی کہ اگر اس بت کے اپنے باپ کا معاملہ ہوتا تو یقیناً اس سرد مہری کا مظاہرہ نہ کرتا۔ اصنام پرستی کے سلسلے میں اس قدر غیر سنجیدہ رویّے کی ایک وجہ تو دین حنیف یا دین ابراہیمی کا وہ پس منظر تھا جس کے باقیات کی تلاش کو مستحسن خیال کیا جاتا اور جس کی طرف ایک رومانی رویہ پایا جاتا تھا اور دوسرا سبب یہ تھا کہ اصنام پرستی مکہ کے تاریخی کلچر کا حصہ نہیں تھی اسے بہت بعد کے عہد میں مکہ کے بعض سردار شام سے لے کر آئے تھے جہاں یہ خیال عام تھا کہ ان کی موجودگی سے بارش ہوتی ہے اور دشمنوں پر فتح پانا آسان ہوجاتا ہے۔

(ابن الکلبی، کتاب الاصنام، تعلیق احمد عبید ومحمد احمد، قاہرہ ۱۹۹۳ء، ص ۸)۔

۳۔ ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ، ج ۳، ص ۱۲۱۴۔

۴۔ عام طور پر سیرت نگاروں نے تجربۂ وحی کے سلسلے میں بخاری کی آغاز وحی والی روایت کو ہی اپنا محور ومرکز بنایا ہے۔ ہمارے خیال میں اس روایت میں بعض تفصیلات زیب داستاں کے قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ آپؐ کو اپنی جان کا خطرہ ہوگیا: **لقد خشیت علی نفسی** جس کے جواب میں حضرت خدیجہؓ کو یہ تسلی دینا پڑی: **کلا ابشر فو اللہ ما یخزیک اللہ ابدا انک لتصل الرحم و تصدق الحدیث تحمل الکل و تکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق (رواہ البخاری)**

بلکہ اس روایت کے مطابق تو آپؐ کو اس تجربے کی صحیح ماہیت کا بھی اندازہ نہ تھا وہ تو خدا بھلا کرے حضرت خدیجہ کا کہ وہ آپؐ

کو لے کر اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچیں جنھوں نے آپؐ کی زبانی واقعہ کی تفصیل جاننے کے بعد یہ یقین دلایا کہ ھذا الناموس الذی نزل اللہ علی موسیٰ کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوا تھا۔ ہمارے خیال میں محمد رسول اللہ کی نبوت کو سند فراہم کرنے کے لیے ورقہ بن نوفل کی تصدیق زیب داستاں سے زیادہ نہیں۔ تاریخ و روایت کی دوسری کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیلات سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

حافظ ابن عساکر نے سلیمان بن طرخان تیمی کے حوالے سے لکھا ہے کہ غارِ حرا کے تجربے کے بعد جب حضورؐ حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے تو فرمایا: یا خدیجة ارایت الذی کنت اری فی المنام و الصوت الذی کنت اسمعونی الیقظة و اھال منه فانه جبریل قد استعلن و اقرأنی کلاما فزعت منه ثم عاد الیٰ فاخبرنی انیٰ نبی ھذہ الامة۔

واقعہ نزول کے گرد اساطیری ماحول کی تعمیر میں ان روایتوں کا بھی بڑا دخل ہے جسے بعض سیرت نگاروں نے بلا تحقیق و تجزیہ اپنی تالیفات میں جگہ دے دی اور جس نے گزرتے وقتوں کے ساتھ نقل در نقل کے مرحلے میں استناد کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ان روایتوں پر اگر اعتبار کر لیا جائے تو وحی اور تفویض نبوت جیسے قطعی اور حتمی واقعات پر محض ہلوسہ کا گمان ہوتا ہے۔ ہم یقیناً ان سیرت نگاروں کے دلوں کے حال سے واقف نہیں البتہ یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان روایتوں کی زد راست نبوت جیسی حتمی اور قطعی حیثیت پر پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر محمد بن اسحٰق نے عبید بن عمرو کی زبانی پہلی نزول وحی کے سلسلے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ منصبِ رسالت سے قطعی میل نہیں کھاتیں۔ بقول راوی جب آپؐ پہلی وحی کے بعد گھر کی طرف چلے تو راستے میں آسمانی آواز سنی کہ یا محمد انت رسول اللہ و انا جبرئیل۔ حضورؐ نے اِدھر اُدھر دیکھا جب کچھ نظر نہ آیا تو اوپر نگاہ گئی۔ دیکھا کہ وہ جبرئیل ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اے محمدؐ آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبرئیل ہوں۔ حضورؐ نے گھر آ کر جب یہ واقعہ حضرت خدیجہؓ سے بیان کیا تو ان کا فوری ردّعمل تھا انیٰ لارجو ان تکون نبی ھذہ الامة۔ یعنی مجھے یقین ہے کہ آپؐ اس امت کے نبی ہوں گے۔ اس طرح کی روایتوں سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ گویا نبوت کوئی کسبی منصب ہو جس کے حصول کے لیے میاں بیوی مل کر اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہوں۔ ابن اسحٰق نے بعض ایسی روایتوں کو بھی جگہ دی ہے جو بظاہر تو ذاتِ اقدس کے سلسلے میں غلو کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں البتہ ان روایتوں کے سہارے ایک ایسا اساطیری ماحول تشکیل پاتا ہے جس میں نبوت جیسی قطعی شئے محض ایک نفسیاتی اور روحانی تجربہ بن کر رہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر احمد عن یونس کی روایت میں ابن اسحٰق نے لکھا ہے کہ بعثت نبویؐ سے چند سال پہلے ہی جب آپؐ کسی حجر و شجر کے پاس سے گزرتے تو وہ تسلیمات بجالاتے آنحضرتؐ ان کے سلام کو سنتے، اِرد گرد دیکھتے لیکن انہیں درختوں اور پتوں کے علاوہ کچھ اور نظر نہ آتا۔ آپؐ کو صرف السلام علیک یا رسول اللہ کی صدا سنائی دیتی۔ تو کیا محمدؐ رسول اللہ کو نزول وحی سے پہلے اپنے اس منصب عظیم کے ملنے کا احساس تھا؟ ہمارے خیال میں اگر ایسا ہوتا تو جبرئیل کے اچانک سامنے آجانے سے آپؐ اتنے متوحش نہ ہوتے۔

العاملی کی تشریح الافلاک کا ایک صفحہ

تاریخ و روایت کے مطالعے کے دوران ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ روایت نویسوں نے مختلف مآخذ سے جو مواد ہمارے لئے اکٹھا کیا ہے ان کے مجموعی مطالعے اور تحلیل و تجزیہ کے نتیجہ میں ہم کسی حد تک اس تاریخی پس منظر کو متصوّر کر سکتے ہیں اور بس۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس عمل میں قرآن مجید کی روشنی اور غیر تقلیدی ذہن کی رفاقت ہمیں حاصل ہو، ورنہ مختلف قسم کے قصصِ کاذبہ کو سچ جان کر ہم ایک بہت ہی بھونڈی اور مجہول تصویر متشکل کر پائیں گے۔ ذرا غور کیجئے کیا عقل سلیم اس بات کی شہادت دے سکتی ہے کہ محمدؐ رسول اللہ کو، جنہیں مہبطِ وحی کے شرف سے نوازا گیا اور جنہیں نبوت جیسی عظیم ذمہ داری سونپی گئی، انھیں تو اپنی نبوت کے سلسلے میں تذبذب ہو لیکن ورقہ بن نوفل اور خدیجہؓ بنت خویلد انہیں اس بات کا یقین دلائیں کہ اے محمد یقین جانیے خدا نے آپ کو نبوت سے سرفراز کیا ہے اور یہ کہ آپؐ کے پاس جو پیغامبر آتا ہے وہ کوئی اور نہیں وہی ناموس اکبر ہے جو حضرت موسیٰ کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ أحمد عن یونس کی ایک دوسری روایت میں تو ابن اسحٰق نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جبرئیل کی اصل حقیقت کے سلسلے میں آپؐ خاصے متذبذب تھے سو خدیجہؓ نے آپؐ کی دلجمعی کے لئے کہا کہ وہ جب آئیں تو آپؐ مجھے اطلاع دیں۔ پھر اچانک ایک دن جبرئیل تشریف لے آئے۔ آپؐ نے کہا خدیجہؓ یہ جبرئیل میرے پاس آئے ہیں۔ خدیجہؓ نے پوچھا کیا آپؐ انہیں دیکھ رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں! خدیجہؓ نے کہا آپؐ میرے بائیں جانب تشریف لے آئیں۔ آپؐ بائیں جانب آ کر بیٹھ گئے۔ پوچھا: کیا آپؐ اب بھی انہیں دیکھ رہے ہیں فرمایا: ہاں! خدیجہؓ نے کہا: آپؐ میری دائیں جانب تشریف لے آئیں۔ آپؐ اٹھے اور خدیجہؓ کے دائیں جانب آ کر بیٹھ گئے۔ پوچھا: کیا آپؐ اب بھی انہیں دیکھ رہے ہیں فرمایا: ہاں! کہا آپؐ آ کر میری گود میں بیٹھ جائیں۔ سو رسول اللہ گود میں بیٹھ گئے۔ تب خدیجہؓ نے پوچھا کہ کیا اب بھی انہیں دیکھ رہے ہیں فرمایا: ہاں! راوی کہتا ہے کہ پھر خدیجہؓ نے اپنا چہرہ کھول دیا اور اپنی اوڑھنی اتار دی اور آپؐ بدستور گود میں بیٹھے رہے۔ تب خدیجہؓ نے پوچھا: کیا آپؐ انہیں دیکھ رہے ہیں فرمایا نہیں۔ خدیجہؓ نے کہا: اے ابن عم یہ شیطان نہیں فرشتہ ہے آپؐ کو بشارت ہو (ابن اسحٰق حوالہ مذکور ص ۱۷۳)۔ احمد ہی کی ایک دوسری روایت میں یہاں تک ہے کہ جب حضرت خدیجہؓ نے آنحضرتؐ کو اپنے کرتے کے اندر داخل کر لیا تو جبرئیل واپس چلے گئے، جس سے خدیجہؓ نے استنباط کیا کہ یقیناً یہ فرشتہ ہے شیطان نہیں۔ (ابن اسحٰق حوالہ مذکور ص ۱۷۴)

ہمارے خیال میں اس قسم کے قصۂ کاذبہ پر وہی لوگ یقین کر سکتے ہیں جنہیں منصبِ نبوت کی عظمت کا واقعی احساس نہ ہو۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ابن اسحٰق، جنہیں ہمارے ہاں پہلے باقاعدہ سیرت نگار کی حیثیت حاصل ہے، نے اس طرح کی خرافات کو اپنے ہاں جگہ دے رکھی ہے اور ورقہ بن نوفل کی تصدیقِ نبوت محمدیؐ کے واقعہ کو تو بخاری و مسلم جیسے اجل محدثین نے کیف بدأالوحی کے باب میں درج کر رکھا ہے۔

۵۔ A. J. Wensinck, "Kibla," in *The Encyclopedia of Islam* vol. 5 Leiden, E.J. Brill, 1960), pp. 189-93.

۶۔ Suliman Bashear, "Qibla Musharriqa and Early Muslim Prayer in Churches", *The Muslim World*, 81, no. 3-4 (1991) :268.

۷۔
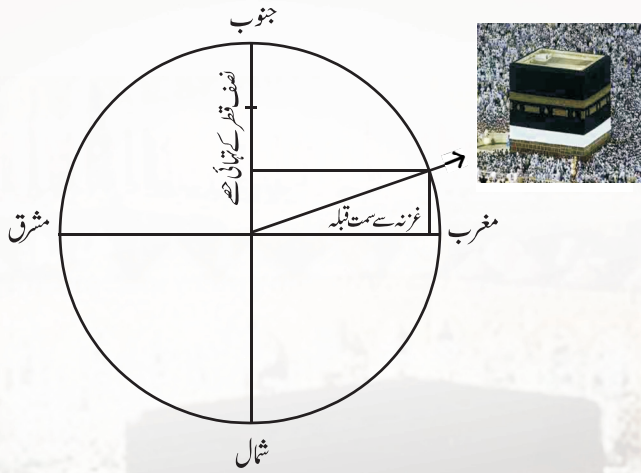
۸۔ David A. King, *Astronomy in the Service of Islam* (Brookfield, 1993), p.257

۹۔ David A. King, *In Synchrony with the Heavens: Studies in Astronomical Timekeeping and Instrumentation in Medieval Islamic Civilization* (Leiden, Netherlands: E. J. Brill, 2004), p.215.

۱۰۔ الخوارزمی (متوفی ۸۴۷ء) اور البتانی (متوفی ۹۲۹ء) نے مختلف علاقوں سے تعین قبلہ کے لیے جو جدولیں تیار کی تھیں وہ آگے چل کر حبش الحسیب (متوفی ۸۶۴ء) ابن الہیثم (متوفی ۱۰۴۰ء) اور البیرونی (متوفی ۱۰۵۰ء) کے ہاتھوں مزید فنی باریکیوں کے ساتھ مرتب ہوئیں۔ یہاں تک کہ تیرہویں صدی میں ابوعلی المراقشی کی نئی تحقیق اور نئے فارمولے کی بنیاد پر دمشقی موقیت الخلیلی نے مختلف علاقوں کے لیے سمت قبلہ کے تعین کا حیرت انگیز جدول تیار کر ڈالا۔ Samso, Julio. "Astronomical Tables and Theory." in *The Different Aspects of Islamic Culture.* Vol. 4: Science and Technology in Islam. (Ed. A.Y. Al-Hassan) Part 1: The Exact Sciences, Paris: UNESCO, pp. 209-234.

۱۱۔ علم المیقات کے سلسلے میں چشم کشا مباحث کے لیے دیکھئے: David A. King, *Astronomy in the Service of Islam* اور *In synchrony with the Heavens* ۔

۱۲۔ اوقات صلوٰۃ کی تحدید ہی پر کیا موقوف ابتدائے عہد میں دن اور رات کے مختلف پہروں کا تعین بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ دن میں سورج کے گھٹتے بڑھتے سائے اور رات میں تاروں کے مقام سے آگہی تحدید وقت کا واحد ذریعہ تھا۔ گویا آسمان کا جتنا باریک بینی سے مشاہدہ کیا جا سکے تحدید وقت میں کامیابی کا اتنا ہی زیادہ امکان نظر آتا تھا۔ زمین سے مختلف سیارے اپنا زاویہ کس طرح بناتے ہیں اس کی پیمائش پر سب کچھ منحصر تھا۔ وہ اس طرح کہ اگر ایک مثلث کے ایک کنارے ایک تارا ہو اور دوسرے کنارے پر قطبِ عالم تو پھر تیسرے کنارے سے اس بات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ مذکورہ تارا کس بلندی تک پہنچتا ہے۔ اس حساب کتاب کے لیے Trigonometry کا علم وجود میں آیا اور پھر قدیم اسٹرلوب میں اتنی گنجائش پیدا ہوگئی کہ وہ صحیح وقت کا پتہ دے سکے۔ کچھ یہی پیچیدگی سمت قبلہ کے تعین میں پائی جاتی تھی۔ زمین جو ایک بیضوی سطح کی حامل ہے اس کی سطح پر دور دراز کے ملکوں سے قبلہ کے تعین کے لیے Spherical Geometry کا علم وجود میں لایا گیا۔ یہاں بھی تاروں کی مدد سے پیچیدہ اعداد و شمار کے ذریعے بالآخر گوہر مقصود ہاتھ آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ نویں صدی میں مسلم ماہرین فلکیات اس لائق ہو گئے تھے کہ Trigonometry کے ذریعے مختلف بلاد و امصار سے سمت قبلہ کا تعین کر سکیں۔ اس سلسلے میں البطّانی کا نام خصوصیت کا حامل ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے۔

David King, *In Synchrony with the Heavens: Studies in Astronomical Timekeeping and Instrumentation in Medieval Islamic Civilization.* 2 vols. Leiden, 2004.

۱۳۔ مثال کے طور پر تقسیم وراثت کے سلسلے میں مروجہ ریاضی کی تنگنائی کا تذکرہ کرتے ہوئے خوارزمی نے ایک دقیق حل طلب مسئلہ یوں متعارف کرایا ہے۔ فرض کریں کہ ایک شخص جو بسترِ مرگ پر ہے اپنے دو غلاموں سے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ تین سو درہم کی ادائیگی پر آزاد تصور کیا جائے گا۔ اس میں سے ایک غلام مرجاتا ہے اور اپنے پیچھے ایک بچی اور دو بچوں کو چھوڑ جاتا ہے اور ساتھ میں چار سو درہم کا ترکہ بھی اور تبھی اس کا پرانا آقا بھی داعئ اجل کو لبیک کہتا ہے اور وہ اپنے پیچھے تین بیٹیوں اور تین بیٹوں کو چھوڑتا ہے۔ اب ایسی صورت میں ان بچوں میں سے فی کس کس کو کتنا ملے گا۔ اس قسم کی صورتحال سے نمٹنے کے لیے الخوارزمی نے الجبر و المقابلہ کا فن ایجاد کیا جس کے ذریعہ بظاہر دماغ بافتہ سوالات کو آسان طریقے سے حل کرنا ممکن ہو گیا۔

۱۴۔ خوارزمی، الجبر و المقابلۃ، ۱۹۸۹ء ص ۴۔

۱۵۔ دوسرے مسلم علمائے سائنس کی طرح البتانی بھی اس نکتے سے پوری طرح آگاہ تھے کہ فلکیات و نجوم کا مطالعہ ایک خدا شناس کا فطری وظیفہ ہے جیسا کہ قرآنی آیات سے استشہاد کرتے ہوئے انہوں نے اپنی مشہور زمانہ زیج کے ابتدائیہ میں لکھا ہے:

إن من أشرف العلوم منزلة و أسناها مرتبة و أحسنها حلية و أعلقها بالقلوب و ألمعها بالنفوس و أشدها تحديداً

للفكر والنظر وتزكية للفهم ورياضة للعقل بعد العلم بما لا يسع الإنسان جهله من شرائع الدين وسنته علم صناعة النجوم لما في ذلك من جسيم الحظ وعظيم الانتفاع بمعرفة مدة السنين والشهور والمواقيت وفصول الأزمان وزيادة الليل والنهار ونقصانها ومواضع النيرين وكسوفها ومسير الكواكب في استقامتها ورجوعها وتبدل أشكالها ومراتب أفلاكها وسائر مناسباتها إلى ما يدرك بذلك من أنعم النظر وأدام الفكر فيه من إثبات التوحيد ومعرفة كنه عظمة الخالق وسعة حكمته وجليل قدرته ولطيف صنعه قال عز من قائل {إن في خلق السموات والأرض واختلاف

ابوقاسم محمد بن عبداللہ الانصاری (بارہویں صدی) کی
تالیف شرح شذور الذهب کا ایک صفحہ

الليل والنهار لآيات لأولي الألباب} وقال تبارك وتعالى {تبارك الذي جعل في السماء بروجا} وقال عز وجل {هو الذي جعل الليل والقمر نوراً خلفة} وقال سبحانه {هو الذي جعل الشمس ضياء والقمر نوراً وقدره منازل لتعلموا عدد السنين والحساب} وقال جل ذكره {والقمر بحسبان} مع اقتصاص كثير في كتاب الله عز وجل يطول وصفه ويتسع القول بذكره واستشهاده ـــ (زيج البتانی، الباب الأول)

۱۶۔ تاریخی تذکروں میں نصیر الدین طوسی کی علمی عظمت ان کی سیاسی شخصیت کے تابع ہو کر رہ گئی ہے بالخصوص سقوط بغداد میں ان کی منفی سیاست کے سبب عامۃ الناس میں ان کی شخصیت مسموم رہی ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں کتاب الٰہی اور کتاب فطرت کے علوم مجتمع ہو گئے تھے۔ اگر ایک طرف فلکیات پر ان کی تالیفات اساسی نوعیت کی ہیں تو دوسری طرف روضۃ التسلیم، سیر و سلوک، اوصاف الاشراف اور تجرید الاعتقاد جیسی کتابیں اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کا شمار وقت کے اہم ترین اسمٰعیلی علماء میں ہوتا تھا۔

۱۷۔ تاریخ کے ایک طالب علم کو حیرت ہوتی ہے کہ مسلم مورخین نے آخر کیونکر عبداللہ بن زبیر کو ہماری سیاسی تاریخ سے محو کر رکھا

ہے۔ حالانکہ کوئی ساڑھے نو برس تک وہ عالم اسلام کے ایک بڑے حصّے بشمول حجاز پر حکمراں رہے۔ زہدو تقویٰ، علم وفضل کی میزان پر بھی وہ عبدالملک سے کہیں فائق تر نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں ان کے استحقاق حکمرانی کا دعویٰ اتنا وزنی سمجھا جاتا تھا کہ عبدالملک نے لوگوں کو اس خوف سے حج پر جانے سے روک دیا تھا مبادا وہ ابن زبیر کی باتوں سے متاثر نہ ہو جائیں اور اس طرح بلاد شام کا علاقہ بھی اس کے ہاتھوں سے جاتا رہے۔ بات جب خراب ہونے لگی اور لوگوں نے حج سے روکے جانے پر احتجاج کیا تو عبدالملک نے بیت المقدس کو ایک متبادل زیارت گاہ کے طور پر متعارف کرایا اور اس قبیل کی روایتیں عام کی گئیں کہ رسول اللہؐ نے تین مسجدوں کی زیارت کے لیے سفر کا حکم دیا ہے اور یہ کہ بیت المقدس کی وہ چٹان جس پر قدم رکھ کر رسول اللہؐ نے آسمان کی طرف معراج کیا تھا فضیلت میں کعبہ کے ہم پلّہ ہے۔ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ عبدالملک نے اس چٹان پر ایک خوبصورت گنبد بنوا دیا اور اہل شام کو اس چٹان کے گرد طواف کی ترغیب دی۔ کہا جاتا ہے کہ اس ترغیب وتحریص کے نتیجے میں اہل شام کے وفود مسجد اقصیٰ کی زیارت کے لیے پہنچنے لگے۔ حتیٰ کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر وہاں طواف کے ساتھ قربانی اور حلق کا رواج بھی شروع ہو گیا۔ گنبد میں جنت، جہنم اور پل صراط کی خیرہ کن تصویریں بنائی گئیں اور اس طرح اہل شام کو کعبہ کے مقابلے میں ایک متبادل زیارت گاہ ہاتھ آ گئی۔ وہ تو کہئے کہ عبدالملک کو جلد ہی حجاز مقدس پر تسلط حاصل ہو گیا جس کے سبب اس متبادل زیارت گاہ کی حاجت باقی نہ رہی ورنہ حکمرانِ وقت کی یہ سیاسی مصلحت حج کی صورت شکل بھی مسخ کر دیتی۔

سجستان میں windmill کا تذکرہ اور اس کی تکنیک کے بارے میں دمشقی کی کتاب نخبۃ الدھر فی عجائب البحر و البر (تیرہویں صدی) میں۔

مزید تفصیل کے لیے دیکھئے تاریخ یعقوبی، ج ۲ ص ۱۶۱ اور البدایہ و النہایہ، ج ۸ ص ۲۸۱۔

۱۸۔ تاریخ کے متداول ماٰخذ سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالملک کے عہد تک بصرہ اور کوفہ میں مالیات اور محصولات کے رجسٹر بزبان فارسی اور شام میں بزبان یونانی لکھے جاتے تھے۔ زاذان فروخ نامی ایک فارسی بصرہ میں مالیات کا ذمہ دار تھا جب کہ دمشق میں اس عہدہ پر ایک عیسائی سرجون بن منصور کو مامور کیا گیا تھا۔

۱۹۔ بلاذری، ص، ۲۴۹

۲۰۔ تاریخ کی کتابوں میں خالد بن یزید بن معاویہ کا تذکرہ ایک ایسے عالم کی حیثیت سے آتا ہے جنھیں دھاتوں کے خواص کی گہری معلومات تھی۔ ایک موقع پر انھوں نے عبدالملک بن مروان کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ نئے سکّے پر سورہ اخلاص کندہ کرائیں۔ (ابوہلال العسکری، کتاب الاوائل، بیروت، ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۵)۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خالد بن یزید کی کیمیا میں دلچسپی اساطیری الکیمی کے سبب تھی جس کے زیر اثر تاریخ کے مختلف ادوار میں بہت سے لوگ سستی دھاتوں کو کسی اساطیری فارمولے کے ذریعے سونے میں بدل ڈالنے کے متمنی دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ الکیمیا میں خالد کی تمام تر دلچسپی ایک نئے معیاری سکّے کے قیام کے سبب تھی اور اسی ضرورت کے پیش نظر انھوں نے اس فن پر مروجہ بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا اور بالآخر ایک معیاری ٹکسال کے قیام میں اموی سلطنت کی بروقت دستگیری کی۔ کہا جاتا ہے کہ خالد بن یزید نے اہل روم کے آتشِ یونانی کے مقابلے میں نفیت (یا نفیط) نام کا ایک کیمیائی مرکب بھی تیار کرلیا تھا جو اچانک تیزی سے بھڑک اٹھتا تھا۔

۲۱۔ مثال کے طور پر قمری مہینوں کے تعین کے مسئلہ کو لیجیے۔ بطلیموس نے قمری مہینوں کی پیمائش کے لیے چاند گہن کا سہارا لیا ہے۔ اس کے مطابق دو چاند گہن کے دوران ۲۶،۰۰۷،۱ دن اور ایک گھنٹے کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اس دوران چاند ۲۶۷، ۴ مرتبہ گردش کر چکا ہوتا ہے۔ اگر ۲۶،۰۰۷،۱ دن اور ایک گھنٹے کو ۲۶۷، ۴ سے تقسیم کیا جائے تو ایک قمری مہینہ ۲۹ دن ۳۱ منٹ، پچاس سیکنڈ، ۸ ثلاثی اور ۲۰ رباعی پر مشتمل ہوگا۔ (یعنی ۲۰،۸،۵۰،۳۱،۲۹) قمری مہینہ کی یہ پیمائش حجاج بن مطر کی اصلاح شدہ پیمائش ہے ورنہ بطلیموس کے مطابق ''دن'' کو ''گردش'' سے تقسیم دینے پر حاصل قدرے مختلف نکلتا ہے جو اس طرح ہے۔ (۲۰،۹،۸،۵۰،۳۱،۲۹) ملاحظہ کیجیے:

Bernard Goldstein, "Ancient and Medieval Values for the Mean Synodic Month", *Journal for the History of Astronomy*, 34 (2003): 65–74.

George Saliba, *Islamic Science and the Making of European Renaissance*, p. 79–80.

۲۲۔ یہ خیال عام ہے کہ مسلمانوں نے اپنے سیاسی جاہ و حشم کے زمانے میں علوم و فنون کو جو ترقی دی وہ ان کا اپنا طبع زاد کارنامہ نہ تھا بلکہ انھوں نے صرف اتنا کیا کہ عباسی خلافت کی ابتدائی دو صدیوں میں یونانی علوم و فنون کو بڑی سرعت کے ساتھ عربی میں منتقل کر دیا جس کے نتیجے میں عباسی بغداد میں ایک علمی غلغلہ کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ البتہ جب یہی علوم بعد کی صدیوں میں لاطینی میں ترجمہ ہو کر اہالیان یورپ کو منتقل ہو گئے تو مسلم تہذیب کی آب و تاب جاتی رہی کہ اس خیال کے مطابق مسلمانوں نے قدماء کے ان علوم کی محض حفاظت کی اور اس کے اطلاقی فوائد کشید کئے جب کہ یورپ نے ان علوم کو ترقی دے کر

اکتشاف وتسخیر کی ایک بالکل ہی نئی دنیا بناڈالی۔ ہمارے خیال میں اس قسم کی باتوں پر آج وہی لوگ کان دھر سکتے ہیں جنھیں انسانی تہذیب کی تاریخ سے یکسر ناآگہی ہو یا پھر وہ تعصب اور پروپیگنڈے کا شکار ہوں۔اولاً تو یہ خیال ہی باطل ہے کہ عہد عباسی کے تحریک ترجمہ سے پہلے فلکیات، جغرافیہ، ریاضی اور فنون لطیفہ کا جزیرۃ العرب اور اس سے باہر مفتوحہ علاقوں میں کوئی وجود نہ تھا۔ اہل مکہ کو ناخواندہ، جاہل اور اجڈ قوم باور کرانے میں ان بیانات کا بھی دخل ہے جو نیک نیتی سے جاہلیت کا ایک ایسا تصور پیش کرتے ہیں جہاں کوئی تہذیب کسی بھی شکل میں نہ پائی جاتی ہو۔ ہوسکتا ہے ایسی مبالغہ آرائی سے اسلام کے کارنامے کو اجاگر کرنے میں کچھ وقتی تقویت مل جاتی ہو لیکن ان بیانات کا تاریخی حقائق سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔قرآن مجید کا ایک معمولی قاری بھی اس بات کا بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ قرآن کے اولین مخاطبین شعر و شاعری اور ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، شمس وقمر کی گردش اور ماہ و سال کی تقویم سے انہیں آگہی تھی۔ فلکیات کے علاوہ رمل، نجوم اور کہانت سے انھیں آشنائی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک سے لے کر ایک لاکھ کی گنتی تک سے نہ صرف واقف تھے بلکہ آیتِ وراثت کے اندرونی شواہد تو اس بات پر دال ہیں کہ وہ حصص کی پیچیدہ تقسیم کو بھی سمجھنے کے اہل تھے۔ گویا قرآن مجید جیسی عظیم الشان علمی کتاب جس ماحول میں نازل ہو رہی تھی وہاں اس کی تفہیم کی بنیادی استطاعت مخاطبین میں لازماً پائی جاتی تھی۔

ابتدائی مسلم ذہن کی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا پروپیگنڈہ ان مستشرقین نے بھی بڑے زور و شور سے کیا ہے جو زوال کی صدیوں میں ہمیں یہ باور کرانے پر مُصر رہے ہیں کہ تم نہ کل کسی لائق تھے اور نہ آج ہو سکتے ہو۔کل یونانی علم وحکمت کے چراغ سے تم نے اپنا گھر روشن کر رکھا تھا تو آج مغرب کے علوم وفنون ہی تمہاری دادرسائی کر سکتے ہیں۔ بیشتر مستشرقین جو مسلم تہذیب کو یونانی علم وحکمت کا خوشہ چیں بتاتے ہیں ان کی فکری جڑیں دراصل Goldziher کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ جو اسلامی عہد کی تمام اکتشافی اور سائنسی ترقیوں کو اجنبی علوم(foreign sciences) کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"The Attitude of Orthodox Islam Toward the 'Ancient Sciences'" in Merlin L. Swartz, (ed). *Studies on Islam*. New York: Oxford University Press, 1981, pp.185-215.

بعد کے مستشرقین نے اپنے طور پر کوئی تحقیق کرنے کے بجائے کلی طور پر Goldziher کے اس خیال کو ایک حتمی صداقت کی حیثیت سے قبول کرلیا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں آج بھی یہ خیال عام ہے کہ اسلام اکتشافی ذہن کا مخالف ہے اور شاید اسی سبب موجودہ عالم اسلام میں کائنات پر غور وفکر اور اکتشاف وتسخیر کی روایت انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔

اس خیال کے حاملین اس پروپیگنڈے کا اظہار کرتے نہیں تھکتے کہ یونانی علم وحکمت جب تک اسلامی تہذیب کو تابدار کرتے رہے ان کی ترقی ایک مخصوص سطح سے آگے نہ جاسکی لیکن یہی علوم جب عربی سے ترجمہ ہوکر لاطینی زبان میں یورپ کو منتقل ہوئے تو مغرب کے سائنسی مزاج نے اس سے بالکل ہی ایک نئی دنیا بناڈالی۔ اس طرح کی باتیں اگر ایک طرف استعمار کا سیاسی پروپیگنڈہ ہیں اور اس مصنوعی پندار کو قائم رکھنے کے لیے ان کی ضرورت ہے تو دوسری طرف تاریخ سے سخت ناواقفیت
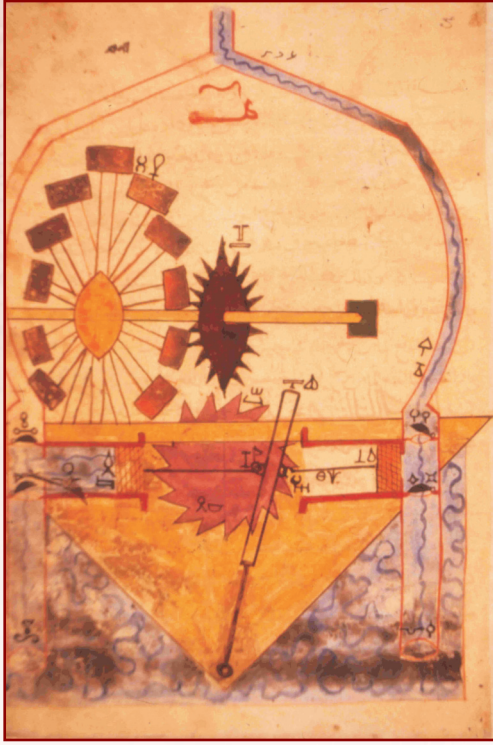
کا نتیجہ بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ تحریک ترجمہ محض یونانی علوم کے تراجم کا نام نہیں تھی بلکہ ان تین سو سال پر مشتمل اس علمی تحریک نے روم و فارس کے مفتوحہ علاقوں میں پائے جانے والے تمام علوم وفنون کا احاطہ کرلیا تھا حتیٰ کہ ہندوچین کے علوم وفنون بھی مسلمانوں کی دسترس میں آگئے تھے۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ انسانی تہذیب اپنے ارتقائی سفر میں جہاں تک پہنچی تھی اس کا نہ صرف یہ کہ مسلمانوں نے بڑی حد تک احاطہ کر لیا تھا بلکہ قرآنی دائرہ فکر کی روشنی میں انھوں نے تحلیل وتجزیے کی ایک معروضی روایت بھی قائم کرڈالی تھی۔ مروجہ علوم کو جوں کا توں قبول کرنے کے بجائے اسے قرآنی تصورات و معتقدات کی روشنی میں استرداد وقبول کا موضوع بنایا گیا۔اب اس عمل میں انھیں کتنی کامیابی ہوئی یہ ایک الگ مسئلہ ہے جوسرِ دست ہماری بحث کا محور نہیں ہے۔

الجزری کی کتاب الحیل میں
دوہرے پمپ کی تکنیک جس کے ذریعہ ۱۲ میٹر
کی گہرائی سے پانی نکل سکتا ہے۔

۲۳۔ ابن الہیثم، الشکوک علی بطلیموس (تعلیق عبدالحمید صبرہ ونبیل شہابی) قاہرہ ۱۹۷۱ء

۲۴۔ جارج صلیبہ نے ایک قدیم غیر مطبوعہ مسودے کتاب الھیئہ میں پائی جانے والی اندرونی شہادت کے حوالے سے اس کتاب کے متداول ہونے پر مطلع کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

George Saliba, *A History of Arabic Astronomy: Planetary Theories During the Golden Age of Islam,* New York University Press, 1994, p.20.

۲۵۔ اَلمُعَدِّل اَلمَسِیر جسے ہم قدیم فلکیات میں Equant کا مسئلہ کہتے ہیں اپنی تمام ترلغویت کے باوجود ایک طویل عرصے تک مشاہداتی علم سے مزاحم ہوتا رہا۔ حالانکہ فی نفسہ اس تصور کی حقیقت قیاس مع الفارق سے زیادہ کچھ بھی نہ تھی۔ اس سے زیادہ مہمل اور کیا بات ہوگی کہ یہ تصور کیا جائے کہ کوئی دائرہ جو یکساں رفتار سے اپنے خطوط پر کسی محور کی جانب محوِخرام ہو وہ اس

کے مرکز کو مس کئے بغیر اس سے گذر جائے۔ جارج صلیبہ، حوالہ مذکور ص ۸۵۔

۲۶۔ متکلمین نے عرض اور جوہر کی جو بحث قائم کی اس میں وقت کو بھی جوہری پیمانے میں متصوّر کیا گیا جہاں مسبب الاسباب خدائے وحدہٗ لاشریک کی ذات قرار پائی جو تمام عوامل کا سرچشمہ ہے۔ الرازی نے Absolute Space کا نظریہ پیش کیا جو ارسطو کے نظریۂ مکان کے مقابلے میں نیوٹن سے کہیں زیادہ قریب ہے۔

۲۷۔ ابن الہیثم، الشکوک علی بطلیموس، (تحقیق عبدالحمید صبرہ و نبیل شہابی) قاہرہ، ۱۹۷۱ء، ص ۶۳۔

۲۸۔ George Saliba, *Islamic Science and the Making of European Renaissance,* London, 2007, pp. 82-83.

عہدِ وسطیٰ کے یوروپ میں اس قسم کے آلات علم و حکمت کی نشانی سمجھے جاتے تھے۔ اہلِ علم انہیں اپنے ڈرائنگ روم میں رکھنے پر فخر کرتے اور مصوّر انہیں اپنی تصویروں کے پسِ منظر میں دکھاتے۔

۲۹۔ ابن الہیثم، الشکوک علی بطلیموس، قاہرہ ۱۹۷۱ء، ص ۳۸۔

۳۰۔ ابوجعفر البطر وجی (متوفی ۶۰۰ھ) جسے مغرب میں Alpetragius کے نام سے جانا جاتا ہے، نے اپنی معرکۃ الآراء تالیف کتاب الحیاۃ میں بطلیموسی ماڈل کو یکسر مسترد کرتے ہوئے ایک نئے علم ہیئت کا ابتدائی خدوخال پیش کیا۔ اس کتاب کا لاطینی ترجمہ ۱۵۳۱ء میں ویانا میں شائع ہو چکا تھا جبکہ اس کی ایک اور تصنیف کتاب الھیئۃ کا لاطینی ترجمہ مایکل اسکوٹ کے ہاتھوں فریڈرک دوم کے صقلیہ میں تیرہویں صدی میں ہو چکا تھا۔ کوپرنکس، جس نے فلکیات کے مسلم متقدمین کے تذکرے میں خاصے تحفظِ ذہنی، ناسپاسی بلکہ سارقانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے لئے بھی بطروجی کو یکسر نظرانداز کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف *De Revolutionibus Orbium Coelestium* میں کوپرنکس نے لکھا ہے: "Alpetragius superiorem sole Venerem facit, et inferiorem Mercurium" یعنی البطروجی نے زہرہ کا مقام سورج سے اوپر اور عطارد کا نیچے متعین کیا ہے۔ کوپرنکس کا یہ اعتراف اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی ہے کہ البطروجی کا تصورِ کائنات افلاطون اور بطلیموس سے مختلف ہے جہاں اول الذکر نے ان دونوں سیاروں کو سورج کے اوپر اور آخرالذکر نے دونوں کو نیچے رکھا ہے۔

۳۱۔ قرآن مجید میں حکمت کا لفظ کہیں تو الگ سے آیا ہے اور کہیں کتاب و حکمت کا تذکرہ یکجا کیا گیا ہے۔ جیسے {ومن یوت

سولھویں صدی میں یہ آلے مغرب میں عام ہونے لگے

الحکمة فقد اوتی خیراً کثیرا} یا {ویعلمهم الکتاب والحکمة} (البقرۃ: ۲۶۹)۔ قرآن مجید نے محمد رسولؐ اللہ کو معلمِ کتاب وحکمت کے فرض منصبی پر مامور بتایا ہے کتاب سے مراد وحی ربانی پر مشتمل ایک ایسا معین وثیقہ ہے جس کے بارے میں التباس کی گنجائش کم ہے البتہ حکمت کے تعین کے سلسلے میں ہمارے متقدمین مختلف غلط فہمیوں کا شکار رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ حکمت قرآن کے علاوہ ایک اور مقابل ماخذ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ یہ خیال واثق ہوتا گیا کہ آپؐ پر کتاب وحکمت دو الگ الگ چیزیں نازل کی گئیں۔ ایک کا مجموعہ قرآن مجید کی شکل میں موجود ہے تو دوسرے کا اظہار سنن وروایات کی شکل میں ہوا ہے۔ اس خیال کو قبول عام کرنے میں قتادہ السدوسی متوفیٰ ۱۱۸ھ، ابن وہاب (تلمیذ امام مالک) متوفیٰ ۱۹۷ھ اور امام شافعی متوفیٰ ۲۰۵ھ کا خاص طور پر رول رہا ہے۔ ہمارے خیال میں حکمت کو سنت کا ہم معنیٰ قرار دینا اس لیے بھی صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید کے صفحات اس بات پر دال ہیں کہ کتاب و حکمت بیک وقت انبیاء سابقین کو بھی عطا کی جاتی رہی ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت مسیح کے سلسلے میں یہ کہنا کہ {ویعلمه الکتاب والحکمة والتوراة والانجیل} (آل عمران: ۴۸) یا آل ابراہیم کے سلسلے میں قرآن مجید کا یہ بیان کہ {فقد آتینا آل ابراهیم الکتاب والحکمة} (نساء: ۵۴) یا حضرت لقمان کے حوالے سے یہ کہنا {ولقد آتینا لقمان الحکمة} (لقمان: ۱۲) گویا اس خیال کی تائید ہے کہ حکمت کو محمد رسولؐ اللہ کی سنت پر محمول کرنا ان قرآنی بیانات کی صحیح تفہیم نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اگر حکمت سے مراد سنت رسول لیا جائے تو یقیناً احادیث وروایات کے مجموعے آل ابراہیم حضرت مسیحؑ اور لقمان پر نازل نہیں کئے گئے تھے۔

بعض شارحین نے کتاب وحکمت کی ثنویت کا ایک حل یہ نکالا کہ انھوں نے حکمت کو قرآن سے باہر تلاش کرنے کے بجائے خود کتاب کے اندر اس کی موجودگی کی نشاندہی کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن نے خود اپنے آپ کو ایک جگہ **حکمة بالغه** سے تعبیر کیا ہے۔ البتہ مختلف مقامات پر کتاب کے ساتھ حکمت کا لاحقہ اس بات کا اعلان ہے کہ اس کتابِ عظیم کی عقدہ کشائی اور اس کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو منور کرنے کے لیے حکمت کا سہارا لازم ہے۔ پھر یہ حکمت ہے کیا؟ قرآنی بیان کے مطابق یہ وہی شئے ہے جو داؤد کی ملک گیری میں ان کی رفیق و پاسبان بنی اور کتاب وحکمت کا یہی تحفہ جب آل ابراہیمؑ کو عطا

ہوا تو مقتدر حکمرانی ان کے حصّے میں آگئی {**فقد آتینا آل ابراھیم الکتاب والحکمة واتیناھم ملکا عظیما**} (نساء۔ ۵۴) خدا جسے چاہتا ہے حکمت سے نواز دیتا ہے {**یوتی الحکمة من یشاء**} (بقرۃ۔ ۲۶۹) اور جسے خدا حکمت سے نواز دے گویا اسے خیر کثیر سے نوازا گیا۔ ان قرآنی بیانات سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حکمت ایک ایسا خیر کثیر اور ایک ایسی نعمت عظیم ہے جو اقوام و ملل کو استخلاف فی الارض کی مسرتوں سے ہمکنار کرتی ہے۔ داؤد و سلیمان کی سلطنتوں کا جاہ و حشم اسی حکمت کے نتیجے میں قائم ہوا تھا اور خود آپؐ پر آنے والی وحی ایک ایسی عقل حکیم اور قلب سلیم کی تعمیر کا کام کر رہی تھی جس کے نتیجے میں آنے والے دنوں میں استخلاف فی الارض اس کا مقدر تھی۔ معاصرانہ بیان میں اگر کہا جائے تو مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ حکمت سے مراد ایک ایسے عقلی رویہ کی تشکیل و تعمیر ہے جو کائنات کو تماشائے محض سمجھنے یا اس کی سریت سے خوف کھانے کے بجائے اس کی تسخیر کا فریضہ انجام دے سکے۔ داؤد نے اسی عبودیت کاملہ سے سرشار ایک عقلی رویے کے ذریعے ایک ایسی سلطنت کی تشکیل دی جس کی حکمرانی شرق و غرب، پہاڑوں اور پرندوں تک محیط تھی۔ قرآنی بیان کے مطابق پہاڑوں کو ان کے لیے اس طرح مسخّر کر دیا گیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ خدا کی حمد میں رطب اللسان رہتے اور اسی طرح پرندے خدا کی تمہید میں ان کے شریک و سہیم نظر آتے اور یہ سب کچھ اسی لیے ممکن ہو سکا کہ {**وآتیناہ الحکمة وفصل الخطاب**} (ص:۲۰)۔ داؤد و سلیمان کے جاہ و حشم کے بیان میں جن محیر العقول ایجادات کا تذکرہ ملتا ہے پہاڑوں اور فضاؤں پر ان کا کمند ڈالنا، پرندوں اور چیونٹیوں پر ان کی حکمرانی دراصل اسی خیال کی توثیق کرتی ہیں کہ حکمت اگر وحی کی رفیق بن جائے تو انسان کے لیے کائنات کی تسخیر صرف آسان ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ فطرت سے ہم آہنگ ایک ایسی جنت ارضی کی تشکیل کر سکتا ہے جہاں خدا کے انعامات پر لقمان کی طرح مومنین کے سر شکر سے جھک جاتے ہوں اور جہاں داؤد ان تمام انعامات سے لطف اندوز ہونے کے باوجود اپنا شمار اوّاب میں کراتے ہوں۔

۳۲۔ جابر بن حیان (محولہ فواد سیزگن، ص ۲۲۷)

۳۳۔ **القانون المسعودی**، ج۱، ص ۴۵۔

۳۴۔ تاریخ کا یہ بھی عجیب طنز ہے کہ نزولِ قرآن سے تسخیر و اکتشاف کی جو غلغلہ انگیز تحریک بلند ہوئی اور جس کے نتیجے میں تجرباتی اور مشاہداتی منہجِ علمی کو فروغ نصیب ہوا اسے آج مغرب میں فرانسس بیکن کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بیکن نے ارسطو کی *Organon* کے مقابلے میں *Novam Organum* شائع کیا جس میں تجربے اور مشاہدے کو علم کی بنیاد قرار دیا گیا۔ آگے چل کا بیکن کا یہ منہجِ علمی سائنسی طریقۂ کار کے طور پر متعارف ہوا۔ اور اس طرح یہ سمجھا جانے لگا کہ جدید دنیا جو تجرباتی سائنس کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے اس کے بانی مبانی کی حیثیت فرانسس بیکن کو حاصل ہے۔ علمی حلقوں میں بیکن کو father of modern empiricism بھی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ جن لوگوں کو تاریخ کی معمولی سی شُد بُد بھی ہوگی ان کے لیے اس بات کا انکار کرنا مشکل ہوگا کہ غور و فکر کا جدید سائنسی منہج، جہاں منقولات سے زیادہ مشاہدات کو دخل ہے، عہد وسطیٰ کے

تمثیل کرۂ ارضی
صانع: جعفر ابن عمر ابن دولت شاہ الکرمانی (چودھویں صدی)

مسلمان علماء میں ایک مقبول عام منہج کی حیثیت سے رائج رہا ہے۔ مثال کے طور پر ابن الہیثم کو لیجئے جو بابائے بصریات (father of optics) کی حیثیت سے مشرق و مغرب میں یکساں احترام سے دیکھے جاتے ہیں، انھوں نے نہ صرف انسانی تجربہ اور مشاہدہ کی سرّیت کو بے نقاب کیا بلکہ اہل علم کو وہ اس بات پر مسلسل آگاہ بھی کرتے رہے کہ ''حقائق شبہات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔'' ابن الہیثم کا منہج بنیادی طور پر ان شبہات کو تجربے اور مشاہدے کی میز پر پرکھنے سے عبارت ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

. . . رأينا أن نصرف الاهتمام الى هذا المعنى بغاية الامكان و نخلص العناية به و نوقع الجد فی البحث عن حقيقته و نستأنف النظر . . . فی مباديه و مقدماته و نبتدیء بالاستقراء الموجودات و تصفح أحوال المبصرات و تمييز حواص الجزئيات و نلتقط باستقراء ما يخص البصر فی حال الابصار و ما هو مطرد لايتغير و ظاهر لا يشتبه من كيفية الاحساس... ثم نترقى فی البحث والمقاييس على التدريج والترتيب مع انتقاد المقدمات والتحفظ من الغلط فی النتائج و نجعل غرضنافی جميع ما نستقرئه و نتصفحه استعمال العدل لا اتباع الهوى و نتحرى فی سائر ما نميزه و ننتقده طلب الحق لا الميل مع الارائ... فلعلنا ننتهی بهذا الطريق الى الحق الذی به يثلج الصدر و نصل بالتدرج والتلطف الى الغاية التی عندها يقع اليقين و نظفر مع النقد والتحفظ باحلقيقة التی يزول معها الخلاف و تنحسم بها مواد الشبهات . . . و ما نحن من جميع ذلک براء مما هو فی طبيعة الانسان من كدر البشرية ولكننا نجتهد بقدر مالنا من القوة الانسانية و من الله نستمد العون فی جميع الامور۔

ابن الہیثم ہی پر کیا موقوف، جابر بن حیان کا کلیۂ توازن، جس کا تذکرہ ہم پچھلے صفحات میں کر آئے ہیں، اور ان کا یہ اصرار کہ ''ليس لاحد ان يدعی بالحق انه ليس فی الغائب إلا مثل ما شاهد او فی الماضی والمستقبل إلا مثل ما فی الآن'' دراصل اسی تجرباتی منہج کا عکاس ہے جس کی بنیاد قرآن مجید کی وہ آیاتِ اکتشاف ہیں جس نے متبعین محمدؐ کو ایک نئے منہج علمی سے روشناس کرایا تھا۔ بھلا جو کتاب اپنے متبعین سے ہانکے پکارے یہ کہہ رہی ہو کہ سنريهم آياتنا فی الآفاق وفی

انفسھم حتیٰ یتبین لھم انہ الحق (فصلات: ۵۳) اور جس کے ہاں بصارت کی درستگی پر اس قدر اصرار ہو کہ خدا خود کہتا ہو **ما تریٰ فی خلق الرحمٰن من تفاوت فارجع البصر ھل تریٰ من فطور ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسأً وھو حسیر** (الملک: ۳-۴) بھلا اس کے حاملین تجربہ اور مشاہدہ سے کیسے پہلو تہی کر سکتے تھے۔ جو کتاب اپنے متبعین سے واشگاف الفاظ میں یہ کہتی ہو کہ **وجعل لکم السمع والابصار والافئدہ لعلکم تشکرون** (النحل: ۷۸) اور جو انھیں ان تجرباتی اور مشاہداتی خصائص کے لیے مسؤل بھی ٹھہراتی ہو: **ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسؤلا** (الاسراء: ۳۶) بھلا اس کے حاملین اس منہج علمی سے کیونکر روگردانی کر سکتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نئے منہج علمی نے غور و فکر کے پرانے مناہج کو تہہ و بالا کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے تسخیر و اکتشاف کی ایک نئی دنیا وجود میں آ گئی۔ نزول قرآن کے بعد انسانی تہذیب پھر ویسی نہ رہی جیسی کہ وہ پہلے تھی۔

۳۵۔ جابر بن حیان، محولہ فواد سیز گن، ص ۲۲۷

۳۶۔ ابن الہیثم، **الشکوک علی بطلیموس**، حوالہ مذکور، ص ۳۴۔

۳۷۔ رصدگاہوں کو ہمیشہ سے عالم اسلام میں مشاہداتی اور تجرباتی علوم کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا رہا۔ عہد مامون میں شمّاسیہ بغداد کے بعد، جسے غالباً پہلی باقاعدہ رصدگاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے، آنے والے دنوں میں رَے، اسفہان اور شیراز میں قائم ہونے والی رصدگاہوں نے شہرت حاصل کی۔ البتہ مراغہ اور سمرقند کی رصدگاہوں کو ان کے غیر معمولی کارناموں کے سبب انسانی تاریخ میں ہمیشہ احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ سمرقند میں اُلغ بیگ کی مشہور زمانہ رصدگاہ آج بھی ناظرین پر اس عہد کے علمی جاہ و جلال کا نقش مرتسم کرتی ہے۔ جوں جوں رصدگاہوں کے آلات میں ترقی ہوتی گئی زمین اور اس کے مابین ہماری معلومات میں قطعیت کا عنصر آتا گیا۔ رصدگاہوں کے عہد میں جب دنیا جدید الکٹرونک آلات سے بے خبر تھی محیطِ ارضی Circumference کی پیمائش ۲۴,۸۳۵ میل کی گئی تھی جو موجودہ پیمائش ۲۴,۹۰۶ میل سے حیرت انگیز طور پر قریب ہے۔

۳۸۔ الکندی وہ پہلا شخص ہے جس نے آسمان کے بظاہر لاجوردی نظر آنے کی توجیہ کی۔ وہ کہتا ہے ''فضا جو زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے اثر پذیر ہو کر ایک ہلکی سی روشنی دینے لگتی ہے جس کا سبب وہ زمینی ناری اجزا ہیں جو اُس حرارت کے باعث منتشر ہو جاتے ہیں جسے انھوں نے زمین سے انعکاس شعاع کے سبب قبول کیا ہوتا ہے۔ (چنانچہ) ہمارے سروں پر جو تاریک فضا ہے وہ ضیائے ارضی اور ضیائے کوکبی کے امتزاج سے تاریکی اور اجالے کی بین بین ایک رنگ میں نظر آنے لگتی ہے اور وہی یہ لاجوردی رنگ ہے''۔ (محولہ فواد سیز گن ص، ۱۳۶)

۳۹۔ بقول الکندی ''جب سورج شمالی جھکاؤ میں ہوتا ہے تو شمالی جانب کے مقامات گرم ہو جاتے ہیں اور جنوبی جانب کے مقامات سرد ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً شمالی ہوا اپنی حرارت کے باعث پھیلتی اور جنوب کی سمت رواں ہوتی ہے کیونکہ جنوبی ہوا سرد ہو جانے

کے باعث سکڑ چکی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ موسم گرما کی اکثر ہوائیں شمالی اور موسم سرما کی اکثر ہوائیں جنوبی ہوتی ہیں''۔

سترہویں صدی یوروپ میں الغ بیگ کی فلکیاتی جدول کا سرورق

توکیا اٹھارہویں صدی کے مغربی اہل اکتشاف الکندی کی ان توجیہات سے واقف تھے؟ واقعہ یہ ہے کہ جیسے جیسے مغرب میں نشاۃ ثانیہ کے اصل ماخذ کا ہمیں ادراک ہوتا جائے گا اس قسم کے تہذیبی تعاملات پر فیصلہ کن گفتگو ممکن ہو سکے گی۔ اس بارے میں کسی قدر تفصیلی گفتگو کے لیے پانچواں باب ملاحظہ فرمائیں۔

۴۰۔ مغرب میں ایک طویل عرصہ سے Mural Quadrant کو Tycho Brahe کی ایجاد سمجھا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ اس بات کے وافر شواہد موجود ہیں کہ یہ آلہ البیرونی کی دسترس میں تھا ورنہ وہ صحرا نوردی کے بغیر پیائش محیطِ ارضی کی بات نہ کرتا۔ اس کے علاوہ نصیر الدین طوسی کی رصدگاہ میں بھی اس کا استعمال عام تھا۔ استنبول میں واقع تقی الدین کی رصدگاہ میں آج بھی یہ آلہ ہمیں تاریخی التباسات کی درستگی کی دعوت دے رہا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے۔

A. Y. Al-Hassan, (ed.), *The Different Aspects of Islamic Culure.* Vol 4: Science and Technology in Islam. Paris: UNESCO Publishig, pp. 235-265.

۴۱۔ مامون کا خریطۂ عالم گو کہ یونانی تصور عالم کے مطابق دنیا کو ہفت اقالیم میں منقسم دیکھتا ہے البتہ اس اعتبار سے یہ دنیا کا پہلا نقشہ ہے جو دنیا کے ۴۵۳۰ اہم شہروں، پانچ سمندروں، ۲۹۰ دریاؤں، دوسو پہاڑوں کے علاوہ مختلف علاقوں میں پائی جانے والی قیمتی دھات اور پتھروں کا تذکرہ کرتا ہے۔ المسعودی نے اس منصوبے کی وسعت اور ہمہ گیری پر قدرے تفصیل سے کلام کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ کتاب التنبیۃ والاشراف۔

۴۲۔ البیرونی کے عہد تک علوم ارضیات کے مختلف مدارس فکر پائے جاتے تھے مثال کے طور پر عباسی خلیفہ المنصور (۷۵۳-۷۵) کے زمانے میں اس موضوع پر سنسکرت سے سوریہ سدھانت کا عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ آریہ بھٹ کی قدیم تصنیف سے بھی عرب ناواقف نہیں تھے جس میں ارض وسمٰوات کی گردش پر بحث کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس

زمین پر پانی اور خشکی کے حصے تقریباً برابر برابر ہیں۔

S. Maqbul Ahmad "Djughrafiya." in *Encyclopedia of Islam* Leiden: Brill, 1991, vol 3. pp. 575-587.

۴۳۔ ملاحظہ ہو: ابوریحان البیرونی، **کتاب تحدید نہایۃ الاماکن لتصحیح مسافۃ المساکن**، حوالہ مذکور۔

۴۴۔ ابن الہیثم نے اپنی جس شہرۂ آفاق تصنیف **الشکوک علی بطلیموس** میں بطلیموسی نظام کو قیاس مع الفارق قرار دیا وہ غالباً لاطینی زبان میں ترجمہ ہونے سے رہ گئی جیسا کہ جارج صلیبہ کا خیال ہے۔ ابن الہیثم نے سیاروں کی حرکات کی جو توجیہہ پیش کی اور جسے اس نے نظام طبعی کا نام دیا اس کی وضاحت وہ اس طرح کرتا ہے:

''وہ مقدمات جن پر کواکب، نیز عالم کے گرد حرکت کرنے والے تمام اجرام کے مداروں کی ترکیب بنی ہے، چار ہیں۔ ایک یہ کہ جسم طبعی خود ایک سے زیادہ طبعی حرکت نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ بسیط جسم طبعی کی حرکت میں اختلاف واقع نہیں ہوتا یعنی وہ گردش کے دوران ہمیشہ برابر وقت میں برابر فاصلہ طے کرتا ہے۔ تیسرے یہ کہ جسم آسمانی انفعال کو قبول نہیں کرتا اور چوتھے یہ کہ خلا موجود نہیں ہے۔'' (محولہ فوادسیزگن ص، ۱۰۲۱-۱۰۲۳)

۴۵۔ ابوریحان البیرونی (متوفی ۱۰۴۸ء) نے اپنی جس تصنیف میں بطلیموس کو ہدف ملامت بنایا ہے اس کا صرف تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ **ابطال البھتان بایراد البرھان** کے حوالے سے قطب الدین شیرازی (متوفی ۱۳۱۱ء) نے بیرونی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ محولہ George Saliba, *A History of Arabic Astronomy: Planetary Theories during the Golden Age of Islam,* New York University Press, 1994, p. 279.

۴۶۔ کوپرنکس سے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے ابن شاطر (متوفی ۱۳۷۵ء) نے بطلیموسی نظام کو مسترد کرتے ہوئے جس نئے نظام کو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا وہ وہی کچھ تھا جس کا سہرا کوپرنکس کے سر باندھا جاتا ہے۔ کوپرنکس اور ابن شاطر کے نقشوں پر کوئی اگر ذرا بھی ایمانداری سے نگاہ ڈالے گا تو اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ کوپرنکس کی تمام تر تحقیق ابن شاطر اور ان کے دیگر مسلم متقدمین کی علمی کاوشوں کا چربہ ہے۔ ملاحظہ ہو نقشہ ایک[۱] اور دو[۲] سے نقشہ تین[۳] کی مماثلت:
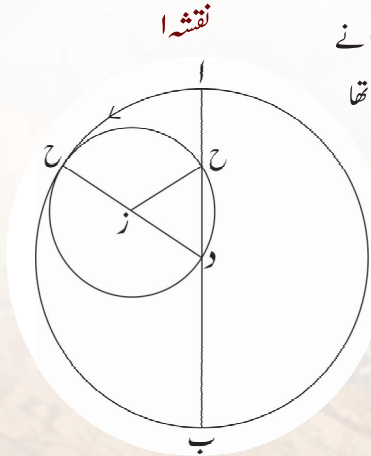
نقشہ ایک[۱] اور دو[۲] نصیر الدین طوسی کی مشہور زمانہ کتاب **تذکرۃ فی علم الھیئۃ** ۱۲۶۱ء سے ماخوذ ہے۔ جس میں سیاروں کی گردش الصغیرہ والکبیرہ (Tusi-Couple) کے ذریعے ظاہر کی گئی ہے۔ اس نقشہ میں دو دائرے ہیں جس میں چھوٹے دائرے کا قطر بڑے دائرے کا نصف ہے۔ بڑے قطر کو الف، ح، د، ب سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یہاں چھوٹے دائرے کے بارے

میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ گھڑی کی سمت گھومتا ہے جب کہ بڑا دائرہ مخالف سمت میں اس کی آدھی رفتار سے گردش کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بظاہر ح اپنی گردش کے باوجود الف اور ب کے درمیان ہی نظر آتا ہے۔

نقشہ ۲

نقشہ دو۲ میں طوسی نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ چھوٹا دائرہ جب بڑے دائرے کے اندر اس کی دوگنی رفتار سے مخالف سمت میں گردش کرتا ہے تو ناظرین کے لیے یہ منظر اپنے اندر کیا معنیٰ رکھتا ہے۔ سب سے پہلے خانہ میں جب چھوٹا دائرہ بڑے دائرے کے نصف اوپری حصہ میں ہوتا ہے وہ اس طرح کہ بڑا دائرہ گھڑی کی الٹی سمت اور چھوٹا دائرہ گھڑی کی سمت میں گردش کرتا ہے تو بالآخر چوتھے خانے کی صورتحال پیدا ہوجاتی ہے۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ یہاں چھوٹا دائرہ ڈیڑھ مرتبہ گھوم چکا ہوتا ہے جب کہ بڑا صرف تین چوتھائی گھومتا ہے۔ یہ صورتحال جب دور سے دیکھی جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ چھوٹا ہمیشہ بڑے کے قطر پر ہی گھومتا رہا ہے۔

اب طوسی کے ان ڈائیگرام کا نکولائی کوپرنکس کے ڈائیگرام سے تقابلی مطالعہ کریں تو حقیقتِ حال کو سمجھنے میں کچھ دشواری پیش نہیں آتی۔

سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ کوپرنکس نے اپنی ڈرائنگ میں Tusi -Couple کا ہی سہارا لیا ہے اس کا کارنامہ صرف اتنا ہے کہ اس نے عربی

QVod igitur iste motus apparentijs consentiat am= modo declarabimus. Interim uero quæret aliquis, quo nam modo possit illarum librationum æquali= tas intelligi, cum à principio dictum sit, motum cœle stem æqualẽ esse, uel ex æqualibus ac circularibus cõpositum. Hic aũt utrobiq; duo motus in uno apparẽt sub utrisq; ter minis, qbus necesse est cessa= tionẽ interuenire. Fatebimur quidem geminatos esse, at ex æqualibus hoc modo demon strant. Sit recta linea A B, quę quadrifariã secetur in C D E si gnis, & in D describãtur circu li homocentri, ac in eodẽ pla no A D B, & C D E, & in circũfe= rentia interioris circuli assu= maẽ utcũq; F signũ, & in ipso F cẽtro, interuallo uero F D cir culus describatur G H D, qui secet A B rectã lineã in H signo, & agaẽ dimetiẽs D F G. Ostẽdendũ est, φ geminis motibus circulorũ G H D & C F E cõcurrẽtibus in=

Source: *De Revolutionibus Orbium Coelestium* (1543)

نقشہ ۳

تجی کو رومن حروف سے بدل کر ایک خالص یورپی بازیافت کا تاثر دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ خیال کہ بطلیموسی نظام حرکت کائنات کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتا مسلم ماہرین فلکیات کے درمیان خاصا مقبول رہا ہے۔ سب سے پہلے ابن الہیثم (متوفی ۱۰۴۰ء) نے بطلیموسی نظام کی کھل کر تنقید کی البتہ ایک متبادل نظام کا تصور ابن شاطر (متوفی ۱۳۷۵ء) کے لیے مقدر تھا جسے پیرامیٹر کی تھوڑی سی تبدیلی کے بعد (یعنی زمین کے بجائے سورج کو مرکز قرار دے کر) کوپرنکس نے مغرب میں متعارف کرایا۔ کوپرنکس اور گلیلیو کی مشترکہ کوششوں کے سبب اہل مغرب کو ایسا محسوس ہوا گویا انھوں نے کائنات کی حرکت کا راز دریافت کرلیا ہو۔ اس احساس نے بعض بنیادی فکری تبدیلیوں کی اینٹ رکھ دی۔

۴۷۔ ۱۹۵۷ء میں غالباً پہلی بار اہل علم کو اس بات کا انکشاف ہوا کہ کوپرنکس سے کوئی ڈیڑھ دو سو سال پہلے ابن شاطر نے Tusi-Couple کی بنیاد پر جو نیا خاکہ ترتیب دیا تھا اس میں زمین کی جگہ سورج کو رکھ کر کوپرنکس نے مغرب میں خود کو اس فن کے امام کی حیثیت سے پیش کر دیا۔ اس بات کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ ابن شاطر کی کتاب **نهاية السول فی تصحيح الاصول** پندرہویں صدی میں اٹلی میں پہنچ چکی تھی۔ بعضے یہ بھی کہتے ہیں کہ ویٹیکن کی لائبریری میں یقیناً کوپرنکس نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہوگا کہ اس کتاب کا ویٹیکن کی لائبریری میں پایا جانا اور کوپرنکس کا وہاں جانا تاریخ سے ثابت ہے۔ یہی وجہ ہے ابن شاطر اور کوپرنکس کے ڈائیگرام میں حیرت انگیز طور پر مماثلت پائی جاتی ہے۔

ملاحظہ کیجیے بطلیموسی نظام کے بالمقابل ابن شاطر کا تصور جہاں الصغیرہ والکبیرہ (Tusi-Couple) کی مدد سے عطارد کے مقام کی نشاندہی کی گئی ہے۔
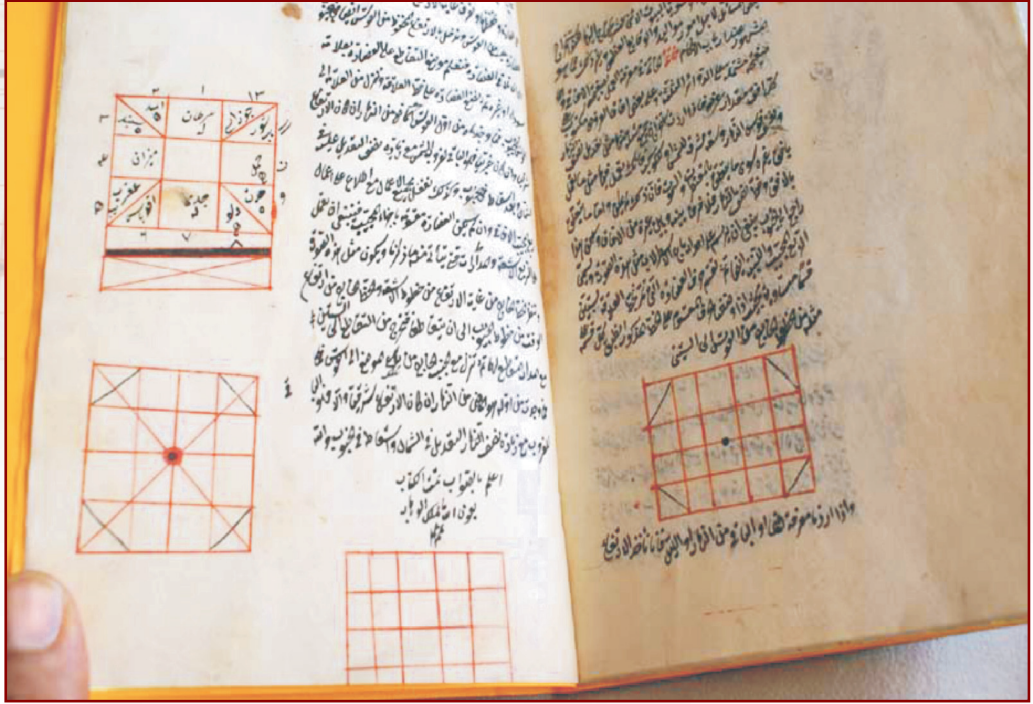
ناصرالدین طوسی کی کتاب میں اسطرلوب کی دقیق بحث

اس بارے میں مفصل بحث کے لیے ملاحظہ کیجئے:

George Saliba *A History of Arabic Astronomy: Planetary Theories during the Golden Age of Islam*, George Saliba, Islamic Science and the Making of European Renaissance, New York, 1994, p. 236. George Saliba (2007), Lecture at SOAS, London-Part 4/7 (http://youtube.com/ London, 2007. watch?v=GfissgPCgfM) and Lecture at SOAS, London-Part 5/7 (http://youtube.com/ watch?v=OVMBRAd6YBU)

۴۸۔ جابر نے پہلی بار اشیاء کے خواص کی عددی توجیح کے ذریعے ایک ایسے علم کی بنیاد رکھ دی جو آگے چل کر حیرت انگیز علمی انقلاب کا باعث ہوئی۔ پھر انسانوں کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ مختلف اشیاء میں اجزاء کا پتہ لگا سکیں اور اس کی ترتیب و تزئین میں ردّ و بدل کے ذریعے نئی اشیاء کی تخلیق کریں۔ جابر کے مطابق توازن یا المیز ان کا یہ اصول جس نے دریافت کر لیا اسے گویا کائنات کے بنیادی راز سے آگہی حاصل ہو گئی۔ (محولہ فواد سیز گن، ص ۷۷)

۴۹۔ عہد وسطیٰ میں عالم اسلام کو ایک ایسی غالب تہذیب کی حیثیت حاصل تھی جہاں سے فکری و ادبی رجحانات کو برآمد کرنا باعث فخر سمجھا جاتا۔ مغربی اہل فکر عالم اسلام کی طرف اسی مرعوبانہ نگاہ سے دیکھتے جس طرح آج تیسری دنیا کے ممالک مغرب کی طرف دیکھتے ہیں۔ عالم اسلام کے علمی مباحث سے باخبری، فیشن کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس پس منظر میں اگر جابر کے

تکوینی تخیلات Faust کی تحریروں اور Mary Shelley کی Frankenstein کی تخلیق کا سبب بنے ہوں تو اس پر کچھ تعجب نہ ہونا چاہئے۔

۵۰۔ محولہ فواد سیزگن، تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام، ص ۴۵۔

۵۱۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی تین سو سال بعد جب رابرٹ آف چیسٹر (Robert of Chester) نے اس کتاب کے بعض حصوں کا ترجمہ لاطینی میں *Liber Algebrae et Almucabola* کے نام سے کیا تو اس وقت تک یورپ میں اس علم کی لوگوں کو ہوا بھی نہ لگی تھی۔

۵۲۔ ملاحظہ کیجئے: ابوالحسن احمد بن ابراہیم الاقلیدسی، الفصول فی الحساب الھندی، عمان، ۱۹۷۳ء

۵۳۔ فواد سیزگن، حوالہ مذکور، ص ۸۹،

۵۴۔ فواد سیزگن، حوالہ مذکور، ص ۸۶

۵۵۔ الکاشی ان نابغۂ روزگار علمائے اکتشاف میں تھا جنھیں سمرقند میں اُلغ بیگ (متوفیٰ ۱۴۴۹ء) نے اعلیٰ تحقیق کے لیے مدعو کیا تھا۔ الکاشی نے دائرے کے circumference اور redius کے مابین 6.2831853071795865 کا تناسب دریافت کیا جو آج بھی بڑی حد تک صحیح ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: Berggren. J. L. *Episodes in the Mathematics of Medieval Islam.* New York, 1986, pp. 15-21, pp. 151-154.

۵۶۔ اسلامی معاشرے میں اخوت باہمی کے سبب لوگوں کا ایک دوسرے سے ملنا جلنا، امیر و غریب، شاہ و گدا کا ایک دسترخوان پر کھانا مساوات کا ایک انبساط انگیز منظر پیش کرتا ہے۔ چھوت کی بیماری، یعنی بعض متعدی جرثوموں کا دوسرے افراد کو منتقل ہونے کا خیال، علمائے فقہ کو ان کے اپنے مذعومہ اسلامی تصور مساوات سے متصادم نظر آیا۔ لہٰذا لسان الدین الخطیب (متوفیٰ ۷۷۶ھ) کو اپنی کتاب مقنعة السائل عن المرض الھائل میں لکھنا پڑا:

سو اگر کہا جائے کہ ہم چھوت کے دعوے کو کیونکر تسلیم کرلیں جب کہ شرع میں اس کی نفی آئی ہے تو ہم کہیں گے کہ چھوت کا وجود تجربہ، استقرائی، حس، مشاہدہ اور مسلسل اطلاعات سے ثابت ہے اور ان سب پر اس دلیل کی بنیاد ہے۔ جو کوئی اس مسئلہ پر غور کرتا ہے یا اسے اس کا ادراک حاصل ہے اس سے مخفی نہیں رہتا کہ جو بھی اس مرض کے مریض سے براہ راست رابطہ رکھتا ہے اکثر و بیشتر ہلاک ہو جاتا ہے اور جو نہیں رکھتا وہ بچ جاتا ہے۔ اسی طرح سے کسی کپڑے یا برتن کے سبب سے پورے گھر یا محلے میں مرض پھیل جاتا ہے حتیٰ کہ کان کی بالی جس نے پہن لی اس نے اسے ختم کر دیا اور پورے گھر کا صفایا ہو گیا۔ یہ مرض کسی شہر کے ایک گھر میں پیدا ہوتا ہے اور پھر اکا دکا ملنے جلنے والوں اور پھر ان کے پڑوسیوں میں پھیل جاتا ہے۔ (محولہ فواد سیزگن، ص ۷۴)۔

۵۷۔ رازی نے اپنی کتاب شکوک میں جالینوس کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میں ایک ایسے آدمی پر تنقید کر رہا ہوں جس کے سمندرِ علم سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ لیکن مجھے احساس ممنونیت اور

عظمت اس بات سے نہیں روکتی کہ میں ان غلطیوں کی طرف اشارہ کروں جو مجھ پر منکشف ہوگئی ہیں۔

۵۸۔ فوادسیزگن، حوالہ مذکور ص ۴۵

۵۹۔ ایضاً، ص ۴۶

۶۰۔ ایضاً، ص ۴۶

۶۱۔ ایضاً، ص ۴۶

۶۲۔ ایضاً، ص ۵۱

۶۳۔ Ehsan Masood, *Science and Islam: A History,* London, 2009, p.162

۶۴۔ حوالہ مذکور، ص ۴۷

۶۵۔ ایضاً، ص ۴۷

۶۶۔ مثال کے طور پر تھیوڈور ابوقُرہؒ (متوفی ۸۲۶ء) جو ایک عیسائی عالم تھے اور جنھیں اموی خلافت کے زمانے میں بعض دفتری امور کی انجام دہی پر مامور کیا گیا تھا مترجم کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے ہیں ثابت بن قُرہؒ (متوفی ۹۰۱ء) جنھوں نے علم ہندسہ اور ریاضی کی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا مذہباً صابی تھے۔ خود حُنین بن اسحاق جنھیں بہت سے اہم ترجموں کی نگرانی پر مامور کیا گیا وہ مذہباً عیسائی تھے۔
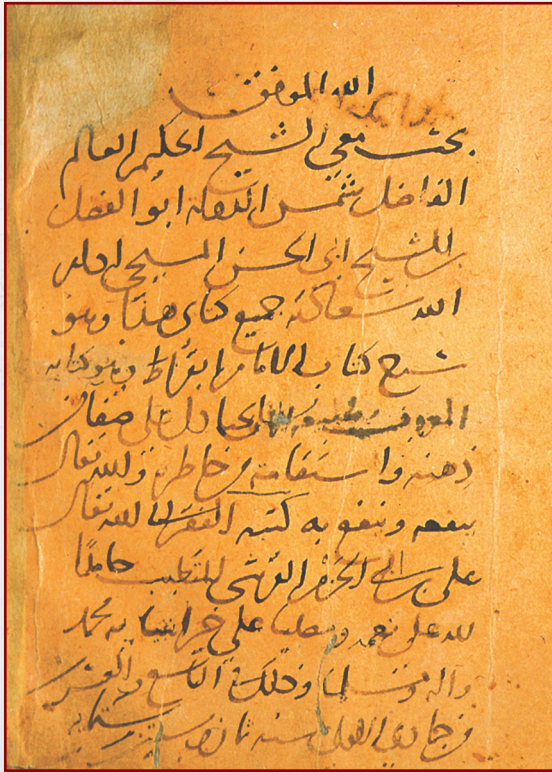
جب مسلم علماء کی سندِ توصیف اہلِ یوروپ کے لئے باعثِ صد افتخار تھی۔ ابن نفیس کا وہ اجازت نامہ جو انھوں نے ابوالفضل المسیحی کو ۱۲۷۰ء میں عطا کیا۔

۶۷۔ بعض مستشرقین نے یہ تاثر عام کر رکھا ہے کہ اسلامی تہذیب یا مسلم معاشرہ سائنسی ارتقاء کے لیے مناسب ماحول فراہم نہیں کرتا۔ ان کا کہنا ہے کہ یونانی علوم جب مسلمانوں کے ہاتھ لگے تو علمائے اسلام کی مخالفت کے سبب برگ و بار نہ لا سکے لیکن وہی علوم جب مسلمانوں سے اہل یورپ کو منتقل ہوئے تو مغرب میں ایک ولولہ انگیز سائنسی انقلاب آ گیا جس نے زندگی جینے کا انداز یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اس قسم کی دَعاوی اولاً تاریخ سے مکمل ناواقفیت پر مبنی ہیں۔ ثانیاً یہ ایک ایسی ثقافت کے پیداوار ہیں جو عہد وسطیٰ کے سائنسی ترقیات کو صرف اس لیے اہل ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں کہ یہ ترقیاں اقوام مغرب کی سرحدوں سے باہر ہو رہی تھیں۔ یہ سارا پروپیگنڈہ ایک ایسے عہد کی پیداوار ہے جب نوآبادیاتی تسلط کے سبب مسلمان جو اپنی بقا کی جنگ لڑنے پر مجبور تھے ان غیر تاریخی پروپیگنڈہ کا سدِّ باب نہ کر سکے۔ نتیجتاً پروپیگنڈہ کی دھند دبیز ہوتی گئی اور آج عالم یہ

ہے کہ ان متعصّبانہ ہفوات کو مسلّمہ تاریخی بیان کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا ہے۔ دیکھا جائے تو اس پروپیگنڈہ کا بانی مبانی دراصل گولڈزیر ہے جس نے سب سے پہلے اپنے ایک جرمن مقالہ "Stellung der alten islamischen Orthodoxie zu den antiken Wissenschaften" (Goldziher 1915) میں اس خیال کا اظہار کیا۔ اس کی بظاہر عالمانہ تصنیف *Muhammedanische Studien* (1888)، جو بنیادی طور پر اسلام کا مطالعہ ایک finished phenomenon کی حیثیت سے کرتی ہے، متجدین اور مستشرقین دونوں کے لئے گمرہی کا سبب بنی رہی ہے۔

۶۸۔ Johannes Pedersen, *The Arabic Book (*trans. Geoffrey French) Princeton University Press, 1984, pp. 116-17

۶۹۔ حوالہ مذکور، ص ۱۲۳

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۲۸

۷۱۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۷۲۔ *The Cambridge History of Renaissance Philosophy,* Charles Schmitt and Quentin Skinner (ed.) Cambridge University Press, 1988, pp. 11-12

۷۳۔ *The Arabic Book* حوالہ مذکور، ص ۶۲۔

۷۴۔ ہمیں وثوق کے ساتھ نہیں معلوم کہ عہد عباسی کے ابتدائی دنوں میں بغداد میں کاغذ کی مختلف فیکٹریاں وجود میں آ گئی تھیں اس کی حرفت کہاں سے آئی۔ قرآن مجید میں رِقِ منشور اس بات کی طرف تو اشارہ کرتا ہے کہ کاغذ کی کوئی ابتدائی شکل عہد نبوی میں موجود تھی جس پر عرب شعراء اپنے معلقات لٹکاتے اور لین دین کے معاملات اور باہمی معاہدے ان پر تحریر کئے جاتے۔ صلح حدیبیہ کا معاہدہ ہو یا میثاق مدینہ کی دستاویز یا رسول اللہ کے مختلف مکاتیب جو مختلف حکمرانوں اور سرداران قبائل کو لکھے گئے یا ان سب سے بڑھ کر خود قرآن مجید کا وہ نسخہ جو مصحفِ امام کی حیثیت سے مسجد نبویؐ میں استوانہ امام کے قریب رکھا ہوتا تھا اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ مسلمانوں کی پہلی نسل لکھنے پڑھنے کے بنیادی آلات سے متصف تھی۔ البتہ کاغذ کی ایک ایسی عوامی صنعت جہاں اسٹیشنری کے سامانوں کی کثرت ہو خاص عہد عباسی کی پیداوار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عربوں نے کاغذ کی ٹکنالوجی آٹھویں صدی کے وسط میں اہلِ چین سے سیکھی یہاں تک کہ آٹھویں صدی کے آخر تک اس فن میں ایسی مہارت حاصل کر لی کہ بغداد کے پیپر مِل تمام دنیا میں نفیس کاغذ کے لیے جانے جانے لگے حتیٰ کہ بعض لوگ اس کاغذ کو Bagdatixon کے نام سے پکارنے لگے۔

Jonathan Bloom, *Paper Before Print: The History and Impact of Paper in the Islamic World* Yale University Press, 2001, pp.48-51.

گرین وچ کے ٹیلے پر واقع برطانوی رصدگاہ (قائم شدہ ۱۶۷۵ء) جس نے آنے والے دنوں میں وقت کا کنٹرول مسلمانوں سے چھین لیا۔

۷۵۔ ارسطو جس کے یہاں علم بنیادی طور پر اپنی تین ذیلی شاخوں فزکس، میٹا فزکس اور میتھ میٹکس میں محدود ہے، ابتدائی صدیوں میں مسلم علماء کے لیے ایک دلفریب ماخذ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ارسطو اس خیال کا حامل تھا کہ محض قوتِ حس و ادراک علم کی ماہیت سے پردہ نہیں اُٹھا سکتے لہٰذا کائنات کے بارے میں کوئی صحیح تصور قائم کرنے کے لیے احساس و ادراک کے علاوہ وجدان کو بھی اہمیت دینی ہوگی۔ قدیم یونانی ذہن اس بات کا قائل تھا کہ کائنات ازل سے ہے جسے ایک ایسی ہستی نے بنایا ہے جو ازل سے ایک قسم کے مراقبۂ نفسی (Self Contemplation) میں محو ہے۔ ارسطو کا خدا گویا قرآن کے خدا سے یکسر مختلف تھا۔ کائنات کو خدا کی طرح قدیم ماننے سے شرک کا واضح تاثر پیدا ہوتا تھا۔ مسلم علماء و مفکرین کے لیے کائنات کا یہ تصور قابل قبول نہیں ہوسکتا تھا۔ دانش یونانی کی ان مداخلتوں نے اگر ایک طرف فکری التباس کے امکانات کو جنم دیا تو دوسری طرف بالغ نظر مسلم ذہن کو بے لاگ تحلیل و تجزیہ کے لیے تحریک بھی ان ہی بیرونی فکری مداخلتوں سے ملی۔ مسلمانوں کے لیے خدا کا قرآنی تصور دین و ایمان کا مسئلہ تھا لہٰذا تمام فلسفیانہ موشگافیوں کے باوجود کائنات کا ازلی و ابدی اور قدیم ہونا قابل قبول نہ ہوسکا۔ البتہ ارسطو کے الٰہیاتی نظام کے استرداد کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس کی تصنیفات کی حتمی حیثیت خاصی مشکوک ہوگئی۔ یہی وجہ تھی کہ آنے والے دنوں میں علوم کو محض تین ذیلی شاخوں میں محدود سمجھنے کے بجائے لامتناہی امکانات کا حامل سمجھا گیا اور مسلمان اہل فکر و فن نے علوم عقلیہ اور نقلیہ میں بے شمار ذیلی شاخوں کے تحت تحقیق و اکتشاف کی طرح ڈال دی۔ اگر ایک طرف کتاب الطھارۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب المعاملۃ، کتاب البیع اور کتاب الوراثۃ تخصیص کے میدان

قرار پائے تو دوسری طرف فطری سائنس میں کتاب المناظر، کتاب التحدید نہایۃ الاماکِن، کتاب الھندسۃ اور کتاب النجوم جیسی تصانیف نے علوم کی بے پایاں وسعت کا اعلان کر دیا۔

۷۶۔ گو کہ کندی، فارابی، ابن سینا اور ابن رشد بڑی حد تک ارسطا طالیسی نظامِ فکر کے موئد اور مبلغ رہے لیکن قرآنی دائرۂ فکر کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ ارسطو کی علمی عظمت ہر دور میں مسلسل تحلیل و تجزیہ کا موضوع بنی رہی۔ اسے اگر حرف آخر کے طور پر قبول کر لیا جاتا تو اسلامی تہذیب محض یونانیوں کا ایک چربہ قرار پاتی۔ تہذیب کے ارتقاء کا عمل یکسر رک جاتا۔

۷۷۔ عہد مامون میں دانش یونانی کو اس قدر استناد حاصل ہو گیا تھا کہ اسے فکر اسلامی کا معاون و رفیق سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ شرع کی بصیرت اور توحید کی معرفت میں بھی حکمائے یونان کو قولِ فیصل کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مامون نے ایک دن خواب میں ارسطو کو ایک تخت پر متمکن دیکھا۔ مامون نے اس مرد بزرگ سے دریافت کیا کہ بھلائی فی الواقع ہے کیا؟ ارسطو نے کہا: وہ چیز جو عقل کے نزدیک بھلی ہو۔ مامون نے پھر پوچھا اور اس کے بعد؟ ارسطو نے کہا جو شریعت کی نظر میں بھلی ہو۔ اور اس کے بعد؟ کہا جسے لوگ بھلا کہیں۔ پھر پوچھا اور اس کے بعد؟ جس کے جواب میں ارسطو نے کہا اس کے بعد کوئی بعد نہیں ہے۔ اسی موقع پر مامون نے ارسطو سے درخواست کی کہ کچھ نصیحت فرمائیے۔ کہا توحید کو تھامے رکھو۔ کہا جاتا ہے کہ شاید اسی خواب کا اثر تھا کہ مامون نے حکمائے یونان کی کتابوں کے تراجم کو اپنی زندگی کا مشن بنا ڈالا اور شاید اس لیے بھی کہ مامون کے ذہن میں دانش یونانی اور وحی ربانی میں کوئی نظری تعارض نہ تھا۔ بقول ابن الندیم:

فکان ھذا (المنام) من او کد الاسباب فی اخراج الکتب فان المامون کان بینہ و بین الملک الروم مراسلات و قد استظھر علیہ المامون فکتب الی ملک الروم یسألہ الاذن فی انفاذ ما عندہ من مختار من العلوم القدیمۃ المخزونۃ المدخرۃ ببلاد الروم فاجاب الی ذلک بعد امتناع فاخرج المامون لذٰلک جماعۃ۔۔۔فاخذوا ھما وجدوا اما اختاروا فلما حملوا الیہ امرھم بنقلہ فنقل۔ (الفہرست، ص ۱۳۹)

۷۸۔ مراد ہیں ٹوبی حف (Toby Huff) جن کی کتاب *The Rise of Early Modern Science* کے حوالے اس باب میں پہلے بھی آئے ہیں۔
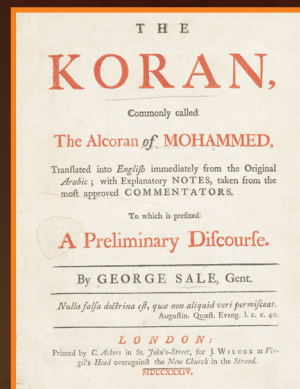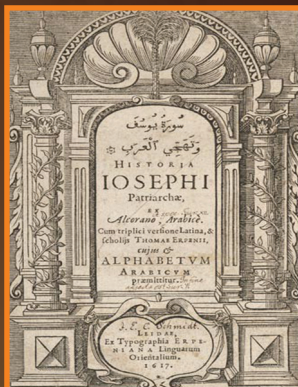
"اکتشافی تحریک جو کبھی فرد کی زندگی کو معانی سے معمور کرتی، اسے انفس و آفاق کے باہمی ارتباط پر مطلع کرتی، سرمایہ داری کے ہاتھوں کچھ اس طرح بے سمت ہوئی کہ اس کی تعمیر کردہ دنیا پر ایک نئے عہد ظلمت کا گمان ہونے لگا۔ ٹکنالوجی کی نئی پیش قدمیاں، رسل و رسائل کی سہولتیں اور کائنات کی تسخیر یقیناً قابل تحسین وقوعہ تھا لیکن فجر جدید کا یہ مژدہ بنیادی طور پر صرف اہل مغرب کے حصہ میں آیا تھا جس کی بے رحم قیمت ادا کرنے پر مشرقی اقوام مجبور تھے۔ گویا مغرب میں فجر جدید کا نوید جانفزا مشرق میں ظلمت شب کے قیام سے عبارت تھا۔"

اکتشافی تحریک کی ہجرت

قرآن مجید عہدِ رسولؐ سے کہیں زیادہ عہدِ مابعد پیغمبر کا منشور ہے جس کے ذمہ غیابِ پیغمبر میں رہتی دنیا تک کے لیے تمام اقوامِ عالم کی رہنمائی کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غور و فکر، تفکر و تدبر اور تسخیر و اکتشاف کی جہد مسلسل پر یہاں جتنا زور ہے اس کی نظیر سابقہ آسمانی کتابوں میں نہیں ملتی۔ اپنے تمام تر التباساتِ فکری، سیاسی حوادث، فقہی خانہ جنگیاں، مسلکی تشتت اور کلامی موشگافیوں کے باوجود مجموعی طور پر مسلم ذہن ساتویں صدی عیسوی سے لے کر سولہویں صدی کے اختتام تک اوہام و اساطیر کے بجائے عقل و مشاہدے کا علامیہ بنا رہا۔ البتہ سولہویں صدی کے نصف آخر میں ایک ایسا علامتی وقوعہ ہوا جس نے ہماری بند دماغی پر گویا مہر ثبت کر دی۔

۱۵۸۰ء میں روایتی علماء کے اصرار اور ہمہ گیر عوامی تائید کے سبب استنبول میں قائم کی جانے والی دنیا کی سب سے بڑی رصدگاہ منہدم کر دی گئی۔ کہا گیا کہ سرّ خدائی میں اس غیر ضروری مداخلت کے سبب ہی تادیباً طاعون کی وبا پھیلی ہے، جس کے سدّ باب کے لیے لازم ہے کہ رصدگاہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ یہی وہ عہد تھا جب مغرب میں ٹائکو براہی اور ان کے معاونین فلکیاتی مطالعہ کے لیے تحقیقی اور تجرباتی مرکز کے قیام کی سوچ رہے تھے۔ بالآخر ۱۶۰۰ء میں ٹائکو کی سربراہی میں مغرب کی پہلی باضابطہ رصدگاہ قائم ہو گئی۔ ادھر سترہویں صدی کی ابتدا میں گلیلیو گلیلی کے دوربینی مشاہدے نے جدید اور قدیم ذہن کے ٹکراؤ کو فیصلہ کن مرحلے میں داخل کر دیا۔ کوپرنکس کا کونی نظام جو بڑی حد تک ابن شاطر کی خوشہ چینی کا نتیجہ تھا اور جسے اب تک نظری دعاوی سے زیادہ اہمیت نہ تھی اب ایک زندہ مسئلہ کی حیثیت سے سامنے آیا۔ عیسائی مذہبی معتقدات اور انسانی مشاہدے اور استنباط کی یہ بڑھتی خلیج مزید مشاہدات کی طرف لے گئی۔ ۱۶۷۵ء میں شاہ چارلس ثانی کی ایماء پر انگلینڈ میں گرین وِچ کی پہاڑی پر ایک نئی رصدگاہ کا منصوبہ بنایا گیا جس نے آنے والے دنوں میں اکتشافی تحریک کے مرکز کی حیثیت کچھ اس طرح اختیار کر لی کہ رفتہ رفتہ گرین وچ کی زیج کو عالمی تقویم کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ۱۵۸۰ء میں استنبول میں واقع تقی الدین کی رصدگاہ کے انہدام سے لے کر ۱۶۷۵ء میں انگلینڈ میں گرین
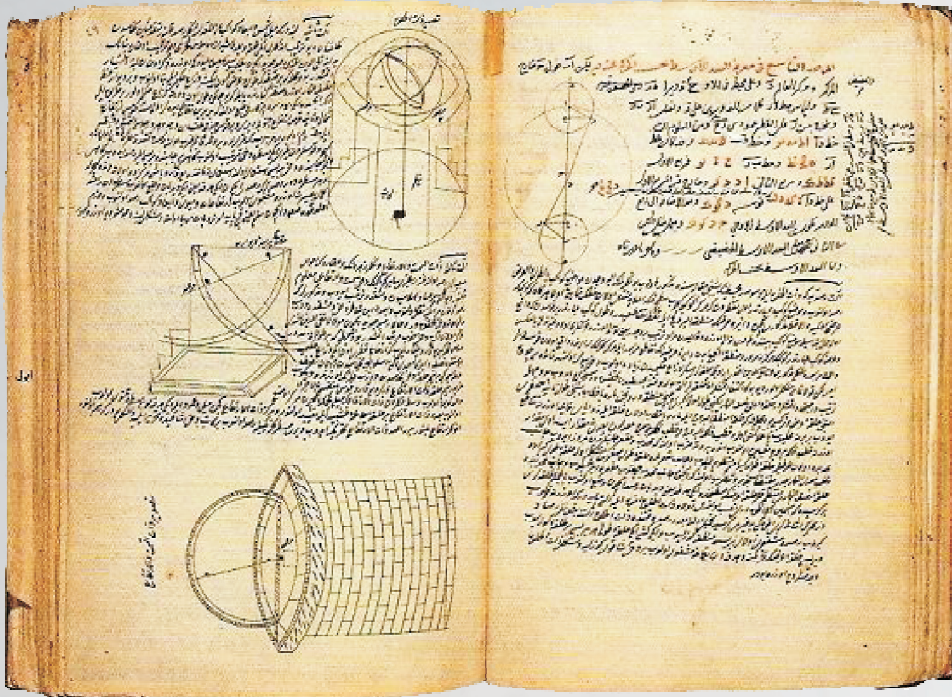
تقی الدین کی رصدگاہ میں مستعمل آلات کی ایک جھلک

وچ رصدگاہ کے قیام تک کا یہ عہد ہماری تہذیبی تاریخ میں بڑی ہی اہمیت کا حامل ہے، یہی وہ عہد ہے جب اکتشافی تحریک عالم اسلام سے ہجرت پر مجبور ہوئی، جس کے نتیجے میں آنے والے دنوں میں اسلام اور مغرب کے مابین قوت کا میزانیہ یکسر بدل کر رہ گیا۔

سولہویں صدی میں دنیا پر تین بڑے امپائر کی حکمرانی تھی: عثمانی ترک، صفوی ایران اور ہندوستانی مغل۔ اور یہ تینوں ریاستیں اپنے تمام تر باہمی اختلافات کے باوجود مجموعی طور پر اسلام کی سطوت وجلالت کا علامیہ سمجھی جاتی تھیں۔ گو کہ ۱۴۹۲ء میں سقوط غرناطہ کا حادثہ پیش آ چکا تھا۔ کولمبس اور واسکوڈی گاما کی بحری مہم جوئی کی ابتدا ہو چکی تھی۔ لیکن تب ان واقعات کی وہ تاریخی اہمیت نہ تھی، جیسا کہ بعد کی صدیوں میں مغربی مورخین نے باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ۱۴۵۳ء میں ترکوں کے ہاتھوں قسطنطنیہ کے سقوط کے سبب عالم عیسائیت اپنی تاریخ کے ایک بڑے بحران سے دوچار ہوا تھا۔ مشرقی عیسائیت کے دارالخلافہ پر اب عثمانی ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ۱۶۸۳ء تک، جب عثمانی ترک ویانا کے دروازوں پر دستک دینے کی پوزیشن میں تھے، قوت کے میزانیے میں مسلمانوں کی پوزیشن مستحکم سمجھی جاتی تھی۔ صورت حال یہ تھی کہ عالم عیسائیت ترکوں کو عذابِ خداوندی پر محمول کرتا جوان کے مصلحین کے بقول خدا کی جانب
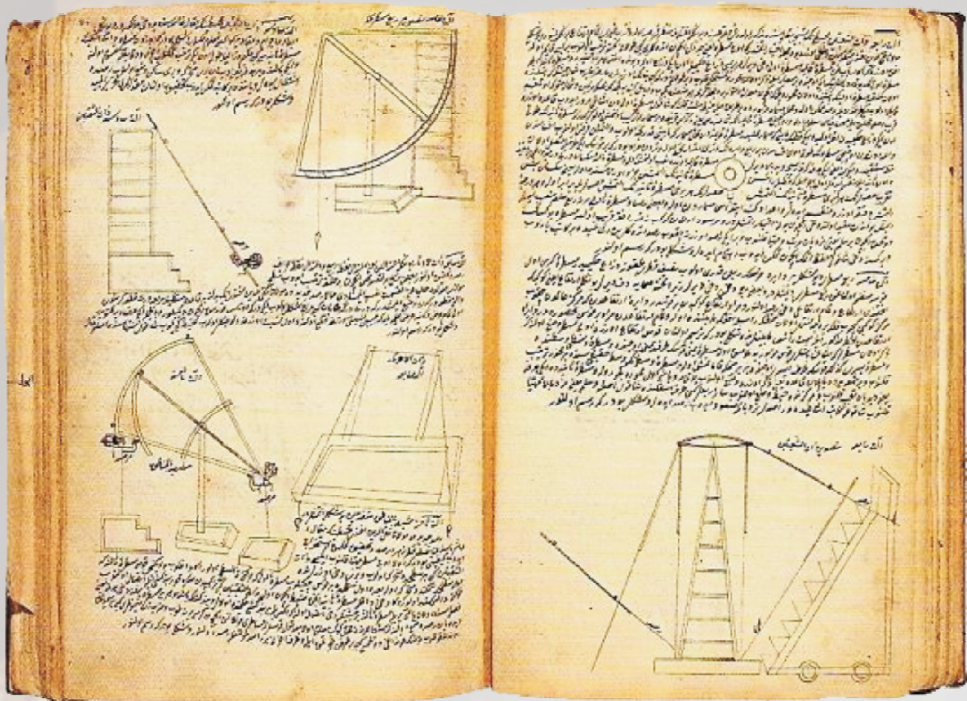
تقی الدین کی رصدگاہ میں مستعمل آلات کی ایک جھلک

سے اس لیے مسلط کیے گئے تھے کہ انھیں ان کے گناہوں کی سزا دے سکیں۔[1] ترک مسلمانوں سے یورپ کی مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ لوتھر جیسا مصلح برملا اس خیال کے اظہار سے نہیں تھکتا کہ بڑے سے بڑے عیسائی عالم اور راہب کو بھی اگر تین دن تک ترکوں کے ساتھ رہنے کا موقع مل جائے تو اس کے لیے اپنے مذہب پر قائم رہنا مشکل ہو جائے گا۔ ایسا اس لیے کہ بقول لوتھر ترک تہذیب کی جاہ و حشمت، ان کا کھانا پینا، رہنا سہنا، لباس و ثقافت، نماز روزہ اور اجتماعی طریقۂ عبادت کے مقابلے میں ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔[2]

مسلمانوں کی ترکتازیوں سے اگر یورپ ایک طرف سہا ہوا تھا تو دوسری طرف کلیسا کے جبر سے پریشان اور اس سے آزادی کی خواہاں حکومتیں بھی مسلمانوں کے سایۂ عاطفت میں پناہ کی طالب ہوتیں۔ ملکہ انگلستان ایلزابتھ اوّل پاپائے روم کے مقابلے میں ترکوں کی حمایت کے لیے سفارت بھیجتیں اور ترکوں سے ان کے گہرے سیاسی روابط کے سبب کیتھولک دنیا میں انھیں ترک حلیف کے طور پر دیکھا جاتا۔[3] ترک عثمانیوں کی ثقافتی حشمت کا عالم یہ تھا کہ بقول انگریز سفیر سر ٹامس شرلے، ترکی کے سفر پر جانے والے یوروپی نوجوان اپنی خوبو کھو کر کچھ مسلمان سے ہو جاتے۔ ۱۶۰۶ء میں مصر میں برطانوی قنصل بنجامن بشپ (Benjamin Bishop) کچھ اس طرح مسلمان ہوا کہ اس نے واپس برطانیہ جانے کا خیال ہی

ترک کر دیا۔[۴] گویا عالمی سطح پر مسلمانوں کی جلالت وسطوت کا جو عمومی چرچا تھا اس ماحول میں کولمبس اور ڈی گاما کی مہم جوئی یورپ کے لیے خواہ بڑا وقوعہ ہو مسلمانوں کے لیے اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہ تھی۔ اور ہوتی بھی کیوں کر، جب اسپینی اور پرتگالی جہازوں نے سفر کا آغاز کیا تھا اس وقت مشرق میں کہیں بڑے اور منظم بحری دستے تجارت میں مصروف چلے آتے تھے۔ مشرق کے بحری تفوق کا اندازہ کچھ اس بات سے لگایئے کہ اس عہد میں اسپین اور پرتگال کے پاس جو سب سے بڑا جہاز تھا، وہ زیادہ سے زیادہ سوٹن وزن کی کفایت کر سکتا تھا، جبکہ اسی عہد میں چینیوں کے بڑے تجارتی جہاز اکتیس سوٹن وزن ڈھونے کی صلاحیت کے حامل تھے۔ ایسی صورت میں کوئی وجہ نہ تھی کہ مغرب کے اس نئے سامانِ شوق کو چشم حیرت سے دیکھا جاتا یا اس نئی مہم کو مسلمان اپنے لیے کوئی خطرہ تصور کرتے۔[۵]

تب تاریخ کی کمان مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ شرق اور غرب ہر جگہ اہل فکر اس حقیقت سے واقف تھے کہ علوم و فنون کا آبشار جس سے مغرب میں ایک نئی انبساط انگیز کیفیت پیدا ہو رہی ہے، اس کے سوتے مشرق میں واقع ہیں۔ اور یہ کہ یوروپ میں علم وفن کی تمام تر سرگرمیاں ان مسلمان اساتذہ کی رہین منت ہیں، جنھوں نے صقلیہ اور اندلس میں ابتدائی سائنسی تہذیب کے چراغ روشن کیے، جہاں جدید یوروپ کے مؤسسین اور مفکرین کی وہ نسل پروان چڑھی جنھوں نے بالآخر یوروپ کو ایک نئے منہج علمی اور ایک نئی سائنسی تہذیب سے روشناس کرایا۔ اٹھارویں صدی تک القانون طب کے آخری حوالے کے طور پر یوروپ کی دانش گاہوں میں پڑھایا جاتا تھا۔ ایسی صورت میں ۱۵۸۰ء میں استنبول میں تقی الدین کی رصدگاہ کا انہدام اور تقریباً ان ہی ایام میں اوّلاً ڈنمارک میں ٹائکو براہی کے ہاتھوں فلکیاتی تحقیق کے لیے ایک ادارے کی بنا اور پھر ۱۶۰۰ء میں باضابطہ ایک بڑی ریاستی رصدگاہ کا قیام گو کہ بادی النظر میں کوئی بڑی تبدیلی نہ تھی، البتہ یہ اس بات کا عندیہ ضرور تھا کہ آنے والے دنوں میں مسلمانوں کی سیادت کو گہن لگنے والا ہے۔ اکتشافی تحریک کی یہ ہجرت دبے پاؤں کچھ اس طرح عمل میں آئی کہ ہمارے بہترین دماغ بھی اس تبدیلی کا اندازہ نہ کر سکے اور جب آنکھ کھلی تو دنیا بدل چکی تھی۔ مغرب نہ صرف یہ کہ تسخیر واکتشاف کی معرکہ آرائیوں میں ہم پر سبقت لے گیا بلکہ بڑی ہوشیاری سے اس نے ہماری اگلی نسلوں کو اس تاریخ سے بھی محروم کر دیا جو بعثت محمدی کے بعد مسلسل ہمارے فکر و عمل سے تشکیل پاتی رہی تھی۔

ہمارے لیے اکتشافی تحریک سے مہجوری کا غم ہی کچھ کم نہ تھا، طرفہ یہ کہ مغرب اب ہماری تاریخ سے برسرِ پیکار اور ہمارے تاریخی شعور کا انکاری تھا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں اس نے ایک نیا اسطورہ (myth) تشکیل دیا جس کے مطابق اکتشافی تحریک کو ایک خالصتاً مغربی عمل کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ یہ خیال عام ہوا کہ یورپ کے منظر عام پر آنے سے پہلے دنیا عہد تاریک میں ڈوبی ہوئی تھی اور یہ کہ یوروپی نشاۃ ثانیہ نے علم وحکمت کے نئے چراغ روشن کیے، جو آگے چل کر جدید مغربی تہذیب کی تشکیل کا باعث ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ اندلس اور صقلیہ کی مسلم دانش گاہوں کے یوروپی فارغین، جنھیں بجا طور پر جدید یورپ کا مؤسس کہا جانا چاہئے، کے کارناموں پر عہد ظلمت کی دبیز متعصّبانہ دھند
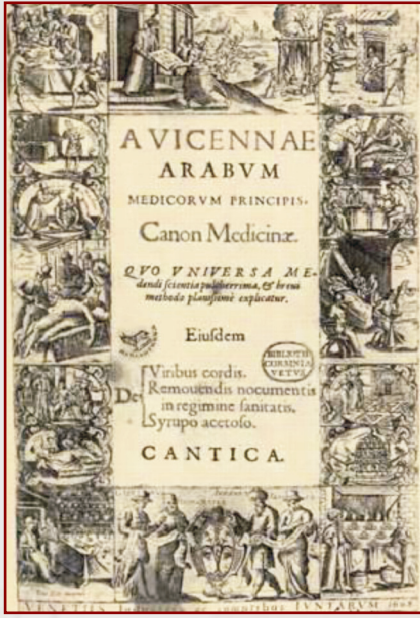
القانون فی الطب کا ایک لاطینی نسخہ
(مطبوعہ وینس ۱۵۹۵ء)

چھا گئی بلکہ تاریخ کے ایک نئے رزمیہ کے لیے ۱۴۹۲ء کو ایک غیر معمولی وقوعہ کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ یہی وہ سال ہے جب سقوطِ غرناطہ کا حادثہ پیش آیا اور جب کولمبس اپنی بحری مہم پر نکلا۔ تاریخ کے مغربی رزمیہ (Western Narrative) کا استعمار کی صدیوں میں کچھ اس زور وشور سے چرچا ہوا کہ مسلمان جواب مغرب کے نت نئے اکتشافی معجزوں کے سبب مبہوت اور مرعوب ہوکر رہ گئے تھے، کسی قدر تذبذب کے ساتھ ہی اس فسانے پر ایمان لے آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے کی آرزو بھی ان میں باقی نہ رہی۔

آج اس بات پر کسے یقین آئے گا کہ مغرب ایک تہذیب اور تصورحیات کے طور پر جو کچھ بھی ہے اس کی تعمیر میں عالم اسلام کا حصۂ رسدی اتنا زیادہ ہے کہ اگر اسے نکال دیا جائے تو جدید مغرب اپنی چمک دمک سے یکسر محروم ہوجائے۔ ہم اس نکتہ کو بھی فراموش نہیں کرسکتے کہ تہذیب اقوامِ عالم کا اجتماعی سرمایہ ہے، اسے شرق وغرب، عیسائی، چینی یا اسلامی، یہودی خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا۔ جب بھی کوئی قوم تاریخ پر پردہ ڈالنے کے لیے کسی تراشیدہ اسطورے کا سہارا لیتی ہے تو دراصل وہ دانستاً ہمیں تاریخ کی روشنی سے محروم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ فی نفسہٖ یہ ایک بڑا مجرمانہ عمل ہے جو انسانوں کو خود اپنے ہی تجربات سے سیکھنے سے محروم کردیتا ہے۔ تاریخ محض فخر ومباہات کا رزمیہ نہیں بلکہ یہ عالم انسانیت کی ایک ایسی شاہراہ ہے جس پر انسانی کارواں مسلسل خوب سے خوب تر کی تلاش میں اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ پھر اگر تاریخ پر اسطورہ کی دھند دبیز ہوجائے یا اسے عہدِ ظلمت کے پردے میں چھپا دیا جائے تو تاریخ کی اس ناقص تفہیم سے اندیشہ ہے کہ مستقبل کی منصوبہ بندی میں تاریخی بصیرت سے ہمارا دامن یکسر خالی رہ جائے۔

ہمارے لیے یہ سوال بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ مغرب جو صدیوں سے ہمارا خوشہ چین چلا آتا تھا۔ صنعتی انقلاب کے بعد اور خاص طور پر انیسویں صدی میں اچانک اس طرح کیسے اٹھ کھڑا ہوا کہ کرۂ ارض پر ہم حاملین قرآن کی موجودگی کے باوجود اسے سیاہ وسفید کا اختیار حاصل ہوگیا؟ سرّ مغرب سے آگہی کے بغیر ہم اس سوال کا شافی جواب بھی شاید فراہم نہیں کرسکتے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے پڑھائے ہوئے اکتشافی علوم کو تو مغرب نے آج تک سینے سے لگا رکھا ہے، جبکہ منہج کلامی کے زیر اثر پیدا ہونے والے داخلی مسلکی انتشار سے اس نے بڑی حد تک نجات حاصل کرلی ہے؟ گویا مغرب

کے عروج کے اسباب سے آگہی ہمارے لیے اپنے زوال کی تفہیم میں بھی مدد و معاون ہوگی اور اس رمز سے بھی پردہ اٹھا سکے گی کہ تحریک اکتشاف کی دوبارہ قیادت ہم سے فی الفور کن اقدام کی طالب ہے۔

القانون فی الطب

پہلا لاطینی ترجمہ جسے گیرارڈ آف کریمونا نے انجام دیا۔

یورپ میں تحریک اکتشاف کا پس منظر

نزولِ قرآن نے ایک نئے مشاہداتی / استخراجی منہج کو جس طرح قبولِ حق کے لیے اعتبار بخشا تھا، جس طرح وحی سے مملو ایک نئے عقلی رویہ نے متبعین محمدؐ کو تسخیر کائنات کے جذبے سے سرشار کر رکھا تھا اور جس طرح ساسانی، بازنطینی تہذیبوں کی جمع پونجی اور ہندی، چینی و یونانی علوم کا تمام قابلِ ذکر سرمایہ تحلیل و تجزیہ کی میز پر لے آیا گیا تھا، اس سے عالم اسلام اور اس کی مسلسل وسیع ہوتی ہوئی سرحدوں سے باہر بھی ایک مسرت آمیز غلغلہ انگیز کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ آخری نبی کے متبعین تاریخ کو اس کی حتمی منزل اور کاروانِ انسانی کو اس کے منتہیٰ و مقصود تک پہنچانے میں سرگرم ہیں۔ متبعین محمدؐ امت مبعوث کی حیثیت سے تو اس اعتماد سے سرشار تھے ہی، عالم اسلام سے باہر بھی بعض بیدار مغز اہل کلیسا پر یہ حقیقت عیاں ہوتی جاتی تھی[۱]۔ ایسی صورت میں سسلی اور اندلس تک جب مسلمانوں کے قدم پہنچے تو ان کی طرف اہل مغرب کا رویہ بیک وقت التفات و انکار کا تھا۔ وہ مسلمانوں کی بلند نگہی اور ان کے اکتشافی علوم کے تو قائل رہے کہ ان کی تہذیب و ثقافت اہل مغرب کو مبہوت کیے دیتی تھی، البتہ دینِ اسلام کے سلسلے میں منافرت آمیز سیاسی پروپیگنڈے کے سبب وہ اپنے دل میں سخت انقباض کی کیفیت پاتے۔ اکتشافی تحریک کے قائد کی حیثیت سے مسلمانوں کی کامیابی ایک ایسی حقیقت تھی جس کا انکار ان کے لیے مشکل تھا، البتہ یہ سب کچھ اس قرآنی دائرۂ فکر کی تشکیل کے سبب ہوا تھا، تو کسی ایسے خیال کی تصدیق یا تکذیب کی گنجائش اس مروّجہ عیسائیت میں نہ تھی جہاں متبعین مسیح نے اپنے اوپر غور و فکر کے تمام دروازے بند کر رکھے تھے۔

مغرب متوحش بھی تھا اور مرعوب بھی۔ اربابِ کلیسا اس پوزیشن میں نہ تھے کہ وہ دین اسلام کا تعلیماتِ عیسوی کی روشنی میں بے لاگ محاکمہ کرتے۔ سو انھوں نے عافیت اسی میں جانی کہ وہ اس نئے مسلم خطرے کا مقابلہ پروپیگنڈے اور منافرت سے کریں۔ یہ اور بات ہے کہ صلیبی جنگیں بھی سسلی اور اسپین میں مسلمانوں کی آمد کی طرح اکتشافی تحریک سے

اہل یورپ کے راست تعامل کا بہانہ بن گئیں اور اس طرح اندلس اور صقلیہ کے علاوہ لاطینی عیسائیت کی فلسطین میں چھوٹی سی ریاست بھی تقارب کے ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز بن گئی۔

اہل مغرب جب صلیبی جنگوں کے لیے اپنے گھروں سے نکل رہے تھے، جب مقبرۂ مسیح کی حرمت و ناموس کے حوالے سے پورے یورپ میں صلائے عام بلند کی جا رہی تھی اس وقت صلیب بردار مجاہدین ایک گمراہ کن زہریلے پروپیگنڈے کا شکار تھے۔ جنگ کے دوران مسلمانوں اور عالمِ اسلام سے ان کی راست واقفیت نے کسی حد تک اصل صورت حال پر انھیں آگاہ کیا۔ اس طرح یہ تو ضرور ہوا کہ مسلمانوں کے خلاف نفرت آمیز پروپیگنڈے کے ساتھ ہی ان کے تہذیب و تمدن اور دین و عقائد کا روشن رخ بھی اہل مغرب تک پہنچنے لگا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ چرچ نے عقائد اور تصور کائنات ہر دو سطح پر بعض ایسے عقائد کو بنیاد بنا رکھا تھا جس پر کسی نئی بحث کا دروازہ کھولنا گویا عیسائیت کی بساط لپیٹ دینے کے مترادف تھا۔ رسالۂ عیسوی پر پال کے تراشیدہ عقائد کا حصار اتنا سخت تھا کہ اہل کلیسا کے لیے نظریۂ تثلیث سے دست برداری تو کجا اس پر کسی مکالمہ کی گنجائش بھی نہ تھی۔[7] صدیوں سے چرچ ریاست کی خدمت پر جس طرح مامور رہا تھا اور جس طرح قسطنطین نے اسے عوامی اور مقبولِ عام دین بنانے کے لیے قدیم اساطیر و رسوم کو اس میں جذب کرنے کی کوشش کی تھی اس کے بعد اہل کلیسا کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ رہ گیا تھا کہ وہ ہر نظری بحران کے تصفیہ کے لیے ایک نئی کونسل قائم کرے اور تقلید سلف کے حوالے سے اگلوں سے اس پر غیر مشروط عمل کا مطالبہ کرے۔ اس صورت حال نے اہل مغرب کو نہ صرف یہ کہ ایک بند دماغ معاشرے کا نقیب بنا دیا تھا، بلکہ علم سے مغائرت کو معرفت کی معراج بھی سمجھا جانے لگا تھا۔

عیسائیت کا ارتقاء ابتدا ہی سے ایک ایسی فضا میں ہوا تھا جہاں گفتگو کے تمام دروازے بند تھے۔ یہ چرچ اور ریاست کا کام سمجھا جاتا تھا کہ وہ عام لوگوں کے لیے اعتقادات کا کون سا محضر نامہ کب ترتیب دے۔ ۳۱۹ء میں شہنشاہ قسطنطین نے ارباب کلیسا کو جس طرح ٹیکس اور فوجی خدمات سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔[8] اس سے ریاست اور کلیسا کے باہمی گٹھ جوڑ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ۳۸۰ء میں شہنشاہ تھیوڈوسیس کے ایک فرمان کے ذریعہ تثلیث کو واحد مستند تعبیر کی حیثیت دے دی گئی اور اس سے شمہ بھر اختلاف پر آخرت میں جہنم اور دنیا میں سخت تادیبی کارروائیوں کی دھمکی دی گئی۔[9] ۳۸۸ء میں مذہبی امور پر عمومی گفتگو کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ ۴۳۵ء میں رومن امپائر نے منحرفین کے لیے سزائے موت کو قانونی شکل دے ڈالی۔[10] بد دماغی کا یہ عالم تھا کہ متنازع اور خطرناک کتابوں کو جلانا کارِ ثواب سمجھا جاتا۔ ۳۹۱ء میں اسکندریہ میں واقع دنیا کی سب سے بڑی لائبریری کو جس میں کوئی سات لاکھ اسکرول موجود تھے، جن لوگوں نے جلا کر خاکستر کر ڈالا وہ کوئی اور نہیں مذہبی جذبے سے سرشار عیسائی تھے۔[11] ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اربابِ کلیسا انسانی تہذیب کے مجموعی سرمایے کو نیست و نابود کیے دینا اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہوں۔[12] پوپ گریگوری اوّل گرامر اور لاطینی زبان کی تعلیم کو لغو قرار دیتے۔[13] انھوں نے عام انسانوں کے لیے بائیبل کی تعلیم کو باقاعدہ ممنوع قرار دے رکھا تھا۔[14] ۳۹۸ء میں

کارتھیج میں منعقد ہونے والی چوتھی کونسل نے بشپ کے لیے غیر عیسائی اقوام کی کتابوں کا مطالعہ ممنوع قرار دے دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس عہد کے بعض عیسائی مولوی اس بات کا فخریہ اعلان کرتے کہ انھوں نے عیسائی مذہب کی کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب سے اپنے دل و دماغ کو آلودہ نہیں کیا ہے۔[15] اس بند دماغی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنے والے دنوں میں یورپ کا عیسائی معاشرہ تہذیب و ثقافت کا کھنڈر بن گیا۔ ۴۱۰ء میں جب ویزی گوتھ عیسائیوں نے روم کے ابدی اور روحانی شہر (the eternal city) کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو روایتی عیسائی تعبیر ایک بڑے بحران سے دوچار ہوگئی۔ لیکن جلد ہی سینٹ آگسٹائن کی معروف زمانہ تصنیف *The City of God*، جو روایتی فکر کی مدافعت میں لکھی گئی تھی، اس بحران پر پردہ ڈالنے میں کامیاب ہوگئی۔ آنے والے دنوں میں سینٹ آگسٹائن سب سے بڑے شارح کے طور پر ابھرے اور ان کی تعبیرات کو لازوال استناد کا حامل سمجھا جانے لگا۔[16]

رسالۂ عیسوی پر پال کے مکاشفانہ وار کے بعد دوسرا سب سے بڑا حملہ آگسٹائن کے اندھے اعتقادات کا تھا۔ پال نے اگر اپنے مکاشفے کی بنیاد پر ایک نئی عیسائیت کا قالب تیار کیا تھا تو آگسٹائن (۳۵۴ء-۴۳۰ء) نے عقل کو ایمان کی دنیا سے دیس نکالا دے کر تحلیل و تجزیہ اور اصلاح کے تمام دروازے بند کردیے تھے۔ اس طرح آنے والے دنوں میں متبعین مسیح کے لیے پال کے ذاتی التباسات سے باہر آنے کے تمام تر امکانات یکسر بند ہوگئے۔ بائبل کے طالب علمانہ اور تنقیدی مطالعہ کے لیے اہل مغرب کو انیسویں صدی تک انتظار کرنا پڑا اور وہ بھی تب ممکن ہوا جب مذہب ایک سماجی عامل کی حیثیت سے لوگوں کی زندگی سے غائب ہوگیا۔ آگسٹائن نے تشریح و تعبیر کا کلی اختیار کیتھولک چرچ کے ہاتھوں میں دیے جانے کی پرزور تحریک چلائی۔ ان کا کہنا تھا کہ اہل یقین ہی مذہب کا اعلیٰ فہم رکھ سکتے ہیں اور یقین کی یہ کیفیت اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ اس ادارے پر کاملاً ایمان نہ لے آئیں جو مسیحیت کی ترویج و تعبیر میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔

رہے اکتشافی علوم تو ان کے حصول کو آگسٹائن نے کارِ مہمل قرار دیا۔ انھوں نے اہل یقین عیسائیوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ اس کے بغیر بھی ان کی ایمانی زندگی تشنہ نہ رہے گی۔ سو بقول آگسٹائن، یہ بات سرے سے باعث تشویش نہیں کہ ''اہل کلیسا بنیادی عناصر کے خواص اور ان کی تعداد سے آگاہ نہیں یا انھیں ستاروں کی حرکت اور ان کے مدار سے واقفیت نہیں یا آسمانوں کی ساخت کا انھیں کچھ علم نہیں یا یہ کہ وہ جانور، پیڑ، پودے، پتھر، آبشار، دریا اور پہاڑ کی ماہیت سے واقف نہیں۔ ایسا اس لیے کہ اہلِ کلیسا کے نزدیک ایمان لانے کے لیے اتنا کافی ہے کہ ہر چیز کی تخلیق صانع عالم کی رحمتوں کے طفیل ہے۔''[17] اس کے باوجود اگر شوقِ تحقیق و تجسس میں لوگوں کی نگاہیں بار بار آسمانوں کی طرف اٹھتی ہو اور فلکیاتی علوم میں ان کی دلچسپی کم نہ ہوتی ہو تو آگسٹائن کے نزدیک یہ رویہ قابل ملامت و مذمت ہے:

''گو کہ چاند کی گردش سے بہت سے لوگ واقفیت رکھتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کی تعداد کم ہے جو چاند اور دوسرے

جب مسلمانوں کی تقلید تہذیب کی علامت سمجھی جاتی تھی۔
سسلی میں سینٹ گیوونی کے چرچ میں عربی خطاطی کے باقیات

سیاروں کے طلوع و غروب کے سلسلے میں مستند معلومات رکھتے ہوں۔ گو کہ اس طرح کی باتوں کا علم فی نفسہٖ توہمات کے دائرے میں نہیں آتا لیکن الہامی صحیفوں کو سمجھنے میں اس سے کچھ مدد بھی نہیں ملتی بلکہ ایک اعتبار سے یہ غیر مفید علم اس میں مخل بھی ہوسکتا ہے اور چونکہ اس علم سے مستقبل شناس بھی کام لیتے ہیں اس لیے مناسب ہے کہ اس کی سرکوبی اور مذمت کی جائے۔"[۱۸]

آ گسٹائن نے شوقِ تحقیق کو اہلِ یقین کے لیے نہ صرف یہ کہ غیر ضروری اور لایعنی بتایا بلکہ اپنی مشہور زمانہ تالیف Confessions میں انھوں نے اسے ایک مرض مزمن قرار دیا اور تسخیر و اکتشاف کی تمام کوششوں کی سخت سرزنش کی۔[۱۹]

آ گسٹائن فلسفۂ گناہِ ازلی (orignal sin) کے مؤسس بھی تھے جو بائبل کے لاطینی ترجمہ کو پوری طرح نہ سمجھنے کے سبب ان کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گیا تھا، سواس حوالے سے وہ انسانوں کو پیدائشی گنہگار بلکہ ناقص اور داغدار شخصیت کا حامل سمجھتے تھے، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان داغدار انسانوں کو ایمان جیسے اہم مسئلہ پر اپنے مجروح عقل کے استعمال کی اجازت دیتے۔[۲۰] گنہگار اور جرائم زدہ انسانوں کے لیے ان کے نزدیک اس سے بہتر اور کیا راستہ ہوسکتا تھا کہ وہ نجات کے لیے فرموداتِ مسیح پر انحصار کریں، جس کی مستند تعبیر و تشریح کیتھولک چرچ سے ہی حاصل کی جاسکتی تھی۔ آ گسٹائن کے ہاں عقل کا اگر کوئی استعمال تھا بھی تو بس اس حد تک کہ وہ مسلمہ معتقدات کی کوئی خوش کن تاویل کرلے۔ رہے وہ لوگ جو عقل سے تلاشِ حق کا کام لینا چاہتے ہیں یا جو اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ عقلی تحلیل و تجزیہ انھیں معرفت سے ہمکنار کرسکتا ہے تو آ گسٹائن کے خیال میں ایسے لوگ دراصل غرور کے گناہ سے آلودہ ہیں اور ان کا یہ غرور ان کی اپنی عقل و خرد کے حوالے سے ہے۔[۲۱]

عقل کو مذہب سے بے دخل کرنے اور تحلیل و تجزیہ کے دروازوں پر پہرہ بٹھانے کے بعد اصحابِ یقین اس جذبہ سے سرشار نظر آتے تھے کہ اولاً حق ان کے ساتھ ہے اور جس کے ساتھ حق ہو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسروں کو راہِ حق پر لانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھے۔ ثانیاً اہل حق کے مکاشفات اور ان کی کرامتیں گمراہوں کے لیے مشعلِ راہ ہوسکتی ہیں۔ آ گسٹائن نے ان دونوں طریقوں کو اپنے فکر و عمل سے استناد بخشا۔ انھوں نے اس خیال کی پرزور وکالت کی کہ لوگوں کو راہ راست پر لانے اور انھیں نجات کا مستحق بنانے کے لیے اگر جبر و اکراہ کا بھی سہارا لینا پڑے تو اس میں کچھ حرج

سسلی: بارھویں صدی میں تعمیر شدہ کیتھیڈرل موزیل
جس پر پہلی نظر میں کسی مدرسہ یا مسجد کا گمان ہوتا ہے۔

نہیں سمجھنا چاہیے، جیسا کہ اپنے عہد کے ایک عیسائی فرقہ ڈوناٹسٹ کی جبری اصلاح کو انھوں نے برادرانہ محبت کا لازمہ بتایا۔[۲۲] آنے والے دنوں میں اپنے منحرفین اور مخالفین کے لیے چرچ کا رویہ اتنا خون آشام ہوگیا کہ متبعین مسیح کے مختلف فرقے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ تیرہویں صدی میں جب متبعین مسیح کے ایک فرقہ نے حقیقی عیسائیت کی طرف مراجعت کی کوشش کی تو پوپ کی طرف سے نہ صرف یہ کہ اس کا مقاطعہ کیا گیا بلکہ کوئی بیس ہزار لوگ انتقامِ خداوندی کے حوالے سے بلا تکلف تہہ تیغ کر دیے گئے۔[۲۳]

آگسٹائن نے عقل بیزاری کی جو روایت تشکیل دی تھی اسے آنے والے دنوں میں گریگوری اعظم (۵۹۰ء-۶۰۴ء) نے غیر معمولی استحکام بخشا۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ دنیاوی علوم کی سخت مخالفت کی، بلکہ وہ اس خیال کی بھی شدت سے تبلیغ کرتے رہے کہ غرور جو کہ سات کبیرہ گناہوں میں سے ایک ہے، اس سے مراد دراصل حریتِ فکری ہے کہ جو شخص تقلید کے بجائے خود سوچنے کا دعویٰ کرتا ہے وہ دراصل غرور جیسے کبیرہ گناہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ بقول گریگوری اہل دانش کو چاہیے کہ وہ علم سے اجتناب کریں، جہالت اور بے علمی کے ساتھ دانش مند بنیں۔ فلسفی سبب کی تلاش میں اتنا محو ہوتا ہے کہ وہ، بقول گریگوری، اصل مسبّب الاسباب یعنی خدا سے غافل رہ جاتا ہے۔[۲۴]

عقل اور علم سے بیزاری اور مکاشفہ اور کراموں کو مذہبی زندگی کی کلید قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد عالم عیسائیت کو ایک علم مخالف اور عقل دشمن آباء پرستی نے اپنے حصار میں لے لیا۔ قدمائے یونان کی پرانی دانش گاہیں یا تو ویران ہوگئیں یا ریاست کی ایماء پر بند کردی گئیں۔ ارسطو صرف اس لیے قابل ملامت قرار پائے کہ ان کی کتاب *Categories* کسی مسئلہ کی ماہیت سمجھنے کے لیے دس سوالات قائم کرتی تھی۔ مثلاً یہ کہ شئی کا حکم کیا ہے؟ اس کی صفات کیا ہے؟ وہ کس زمان و مکاں میں واقع ہے؟ یا دوسری اشیاء سے ان کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یہ منہج فی نفسہٖ کتنا ناقص کیوں نہ ہو اس میں بنیادی طور پر سوال قائم کرنے کی ریت پائی جاتی تھی۔ سو ساتویں صدی کے عیسائی راہب Anastasius نے یہ کہہ کر ارسطو کے شائقین کو ششدر کر دیا کہ Book of Revelation 12:4 میں دس سینگ والے جس شیطان (dragon) کا تذکرہ

آیا ہے اس سے مراد دراصل Categories کے دس سوالات ہیں[۲۵]

سسلی: جب شاہی محلات مسلم تہذیب کے زیر اثر تھے۔

اہل مذاہب کا یہ حملہ صرف فلسفہ تک محدود نہ تھا، بلکہ مذہبی امور کے ساتھ ہی دنیائے فطرت کا مطالعہ بھی امکانی گمرہی کا حامل سمجھا جانے لگا تھا:

علم سے آخر فائدہ ہی کیا ہے۔ اگر ہمیں اسباب فطرت کا پتہ چل جائے تو ہمارے لیے اس میں کون سے ثواب کی بات ہے کہ دریائے نیل کہاں سے نکلتا ہے؟ یا وہ تمام باتیں جو اس آسمان کے نیچے حکماء و دانش مند کیا کرتے ہیں[۲۶]

اس علم دشمن رویہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد عالم عیسائیت تعلیم و تعلّم کی روایت سے خالی ہو گیا۔ کتابیں یا تو فنا ہو گئیں یا کلیسا کے تہہ خانوں میں مقفل کر دی گئیں۔ اب شائقین علم کے لیے تمام تر سرمایہ بائیبل اور اس کے متعلقات تھے اور بس۔ ارسطو، جالینوس اور بطلیموس کے حوالے ہی غائب نہیں ہوئے بلکہ قدیم ثقافت کی تمام علامتیں رفتہ رفتہ عالم عیسائیت سے غائب ہو گئیں۔ چرچ اور اس کی بند دماغی کے علاوہ اب کچھ بھی نہ تھا۔ یہ خیال عام تھا کہ انسان جو روح اور جسم کا مجموعہ ہے، اسے اپنے جسم کے مقابلے میں روح کی شفایابی کو ترجیح دینا چاہیے۔ سو بیماروں کے لیے حکیم یا طبیب بلانے کے بجائے پادریوں کی خدمات مستعار لی جانے لگی۔ بیماریوں کو قہرِ خداوندی بتایا گیا اور مختلف قسم کی بیماریوں سے شفایابی کے لیے مختلف عیسائی ولیوں کا وسیلہ مجرب قرار پایا۔ مثال کے طور پر دامیان (Damian) اور کوسماس (Cosmas) جن کی شہادت کے بعد ان کے جسم ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے تھے، سرجری کے ولی قرار پائے۔ Apollonia جن کی شہادت کے وقت ان کے دانت توڑ دیے گئے تھے وہ دردِ دنداں کے ولی کی حیثیت سے دیکھے گئے۔ انطاکیہ کے مارگریٹ کے بارے میں یہ روایت عام تھی کہ انھیں ایک درندے نے نگل لیا تھا۔ پیٹ کے اندر وہ صلیب کا نشان بناتے رہے اور اس طرح وہ معجزاتی طور پر باہر آ گئے۔ مارگریٹ اس مناسبت سے ولادت کے ولی سمجھے گئے۔ توہمات کی اس گرم بازاری میں جہاں سماجی زندگی میں ولیوں کا رول مسلسل عروج پر تھا ہر جانئے ولی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اور ولی بننے کے لیے یہ شرط لازم تھی کہ کم سے کم اس سے دو کرامت کا صدور ہوا ہو۔ سو ہر طرف کشف و کرامات کے چرچے عام تھے۔ خود آگسٹائن جیسا مستند شارح اپنے خطبوں میں اسٹیفن آف ہپّو کی خانقاہ میں ان کی کرامتوں کے طفیل مردوں کے جی اٹھنے کا واقعہ بیان کرتا اور عین اپنی نگرانی میں یروشلم سے لائی گئی خاک کو شفائے عام کی خاطر عوامی زیارت گاہ میں رکھوانے کا اہتمام کرتا[۲۷]

صدیوں بعد، بارہویں صدی کی ابتدا میں انگلستان کا پہلا باقاعدہ اکتشافی عالم (سائنس داں) ایڈلارڈ آف باتھ جب انطاکیہ (Antioch) پہنچا ہے تو اسے اس بات کا شدید احساس ہوا کہ صرف انگلستان ہی نہیں بلکہ تمام ہی عالم عیسائیت پر توہمات، بے عقلی اور جہالت کی دبیز دھند چھائی ہوئی ہے۔ ولیوں کے کرشموں کی داستانیں عام ہیں۔ ہرجا بھوت پریت کا ظہور ہے اور اس پُرآسیب دنیا میں اپنی حفاظت کے لیے لوگ تعویذ و طلسم کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔

تیرہویں صدی کے صقلیہ سے اسلامی آرٹ کا ایک نمونہ

قوانین فطرت سے مکمل ناآگہی نے عالم عیسائیت کو ایک وحشت زدہ خرابے میں تبدیل کردیا تھا[۲۸] ایتھنس کا آخری فلکی عالم پروکلس (Proclus) پانچویں صدی کے اواخر میں رخصت ہو چکا تھا۔ اس کے بعد عالم عیسائیت میں نہ صرف یہ کہ اکتشافی سرگرمیاں بند ہوگئی تھیں بلکہ ہر آنے والے دن کے ساتھ توہمات کے سایے گہرے ہوتے جاتے تھے۔ ایڈلارڈ جو عرب علوم کی تلاش میں انگلستان سے نکلا تھا جب برسہا برس کی سیاحت کے بعد عرب اکتشافی علوم کا سرمایہ لے کر انگلستان واپس آیا تو اسے اپنے معاشرے کی جہالت، بے حسی اور بے خبری پر سخت کوفت ہوئی۔ جہاں امراء تشدد کے خوگر تھے اور عوام منشیات کے عادی۔ ججوں میں رشوت کی وبا عام تھی۔ مشاہیر ناقابلِ بھروسہ تھے اور شہری منافقت کے شکار۔ بڑے بڑے عہد کا بے اعتبار ہونا، دوستوں کی بے وفائی اور مطلب براری کے لیے دوستی، شعارِ زندگی سمجھا جاتا تھا[۲۹]

انگلستان تو پھر بھی ایک ناقابل ذکر اور گمنام خطہ تھا جسے جدید یورپ کے عروج سے پہلے تاریخ کے کسی دور میں بھی اہمیت حاصل نہ رہی تھی۔ البتہ مغرب کی جو قوم جدید یورپ کے ظہور سے پہلے اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھی اور جو آٹھویں صدی سے لے کر یورپ کے وسیع علاقوں میں اپنی ترک تازیوں کے سبب مشہور تھی اور جس نے اپنی تجارتی اور عسکری مہموں کے سبب ایک مخصوص عرصے کے لیے ہی سہی شمالی امریکہ کے ساحلوں پر بھی اپنی کالونی قائم کرلی تھی اور جنھیں یورپ نارمن خطرے کے طور پر جانتا ہے ان کی تہذیب شناسی کا حال، جسے دسویں صدی کے ایک مستند عرب مشاہد نے بیان کیا ہے، اس عہد تاریک کی نقاب کشائی کچھ اس طرح کرتا ہے:

''یہ لوگ خدا کی غلیظ ترین مخلوق ہیں۔ یہ کھلے عام بول و براز کرنے میں کچھ شرم محسوس نہیں کرتے اور نہ ہی مادہ منویہ کے اخراج کے بعد پانی سے پاکی حاصل کرتے ہیں اور نہ ہی کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کے قائل ہیں۔ یہ

سسلی میں اسلامی طرزِ تعمیر کا ایک اور نمونہ سینٹ کٹالڈو کا چرچ

ان گدھوں کی طرح ہیں جن کی منزل کھوئی گئی ہو۔۔۔ ان میں سے ہر شخص کے پاس ایک گدا ہوتا ہے جس پر وہ بیٹھتا ہے اور اسی گدے پر فروخت کے لیے بکنے والی جاریہ بھی بیٹھتی ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی عین موجودگی میں جاریہ سے صحبت کر لینے میں بھی تکلف محسوس نہیں کرتے۔ اگر لوگوں کی ایک بھیڑ بھی داخل ہو جائے تو وہ اس کام میں تکلف محسوس نہیں کرتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خریدار جب جاریہ کے بھاؤ مول کی غرض سے آتا ہے تو وہ بیچنے والے کو اس کے ساتھ صحبت میں مبتلا پاتا ہے۔ اور وہ اس وقت تک جاریہ کو جانے نہیں دیتا جب تک کہ اپنا مطلب پورا نہ کر لے۔

روزانہ معمول کے طور پر وہ اپنے چہرے اور سر دھوتے ہیں مگر اس طرح کہ اس سے زیادہ غلیظ طریقے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور وہ کچھ اس طرح ہے۔ صبح کے وقت ایک خادمہ پانی سے بھرا ایک برتن لاتی ہے جسے وہ اپنے آقا کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ اس برتن میں وہ اپنا ہاتھ، منہ اور بال دھوتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی ناک صاف کرتا ہے، پھر اسی برتن میں کلی کرتا ہے اور اس طرح تمام گندگی اس پانی میں سمو جاتی ہے۔ جب ایک شخص فارغ ہو چکا ہوتا ہے تو یہی استعمال شدہ پانی وہ خادمہ دوسرے شخص کے سامنے رکھ دیتی ہے اور پھر دوسرا شخص بھی یہی عمل دہراتا ہے اور اس طرح وہ اسی برتن کو ایک شخص سے دوسرے شخص کے آگے رکھتی جاتی ہے، حتیٰ کہ گھر کے تمام لوگ اس میں اپنی ناک صاف کرتے، کلی کرتے اور بالوں اور چہروں کی صفائی سے فارغ ہوتے ہیں۔''[۳۰]

یہ وہی عہد ہے جب قاہرہ، بغداد اور خود مسلم اندلس کے شہر قرطبہ، طلیطلہ اور غرناطہ اپنے حمام، صاف ستھری سڑکوں اور اسٹریٹ لائٹ کے لیے مشہور تھے۔ گویا جب لندن مٹی اور پھوس کے جھونپڑوں کا ایک چھوٹا سا دور افتادہ گاؤں تھا جہاں اسٹریٹ لائٹ یا پبلک حمام کا کوئی تصور نہ تھا اس وقت، جیسا کہ برک نے لکھا ہے، قرطبہ کی نصف ملین کی آبادی کوئی ایک لاکھ تیرہ ہزار گھروں پر مشتمل تھی۔ شہر اور اس کے اطراف میں سات سو مسجدیں اور تین سو پبلک باتھ کے جال پھیلے ہوئے تھے۔[۳۱] عالم اسلام کے اکثر شہر صاف شفاف سڑکوں، ہرے بھرے باغات اور مصنوعی فواروں کا ایک دلکش نظارہ پیش کرتے۔[۳۲] اس کے برعکس یورپی شہروں کا حال یہ تھا کہ جس کسی کا جی چاہتا گھر کے عین سامنے تنگ و تاریک گلیوں میں

کوڑا کرکٹ ڈال دیتا، جس کے سبب اس سے آنے والی پیشاب اور غلاظت کی بدبو سے پورا ماحول پراگندہ رہتا۔[۴۳] کاغذ جس کے نام سے اہل مغرب ناواقف تھے، عالم اسلام میں اس کا استعمال عام تھا۔ ہر مہذب شہر کی یہ پہچان سمجھی جاتی ہے کہ وہاں سوق الوراقین یعنی اسٹیشنری کی دکانوں کا بھی ایک سلسلہ پایا جائے۔ کاغذ کے عام استعمال سے کتابوں اور کتب خانوں کی ایک نئی دل آویز دنیا قائم ہوگئی تھی[۴۴] کہا جاتا ہے کہ صرف قرطبہ میں ستر کتب خانے موجود تھے[۴۵] دسویں صدی کے مسلم اسپین میں الحکیم (متوفی ۹۷۵ء) کے ذاتی کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں موجود تھیں، جبکہ اس عہد کے عیسائی اسپین کے سب سے معروف کتب خانہ میں جوریپال (Repoll) کی خانقاہ میں واقع تھا، کتابوں کی مجموعی تعداد صرف ایک سو بیانوے تک پہنچتی تھی۔[۴۶] سوئٹزرلینڈ کی سینٹ گال (Gall) کی خانقاہ جس کے کتب خانے کا چرچا عام تھا وہاں بھی کتابوں کی تعداد چھ سو سے زیادہ نہ تھی اور وہ بھی جانوروں کی جھلّیوں اور چمڑوں سے تیار کی گئی تھیں۔[۴۷] گویا ایک طرف اگر علم وحکمت کی گرم بازاری تھی تو دوسری طرف اس سے محرومی اور تہی دستی نمایاں تھی۔ مغرب اس صورت حال کو خوف اور شوق کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ شاید کاروانِ اکتشاف کے سیلاب بلاخیز کو جو اس کی سرحدوں تک مسلسل بڑھتا چلا آتا تھا روکنا محض روایتی ترکیبوں سے ممکن نہیں، لیکن اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ مشرق کے علوم و فنون میں اس کی بڑھتی دلچسپی کہیں ایک نئی ثقافتی اور نظری شکست کا نقطۂ آغاز نہ بن جائے۔

مغرب میں طلوعِ آفتاب

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اسلام کی طرف اہل مغرب کا رویہ ابتدا سے ہی بیک وقت شوق اور خوف دونوں کا تھا۔ اہل مغرب کے لیے عالم اسلام کے اچانک پھیلاؤ اور اس کی سرحدوں کا مسلسل وسیع ہوتے جانا ایک ایسا راز تھا جس سے پردہ اٹھانے کے لیے وہ نفس اسلام کا مطالعہ ضروری سمجھتے۔ پھر اس سیلاب بلاخیز کو جس نے یروشلم کے مقدس شہر کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا، جس نے اپنی خلافت کے بالکل ابتدائی ایام یعنی ۶۵۲ء میں صقلیہ کے تجارتی شہر پر دستک دے چکا تھا اور جس کے قافلے ۷۱۱ء میں آبنائے ہرمز کو عبور کرتے ہوئے اسپین کے ساحلوں تک جا پہنچے تھے، اس کا گہرا مطالعہ اولاً تو اس لیے اہم تھا کہ اس کے بغیر کوئی مدافعانہ اسٹریٹجی تشکیل نہیں دی جاسکتی تھی، ثانیاً مغرب اس دانش اسلامی کو بھی جاننے کا شائق تھا جس نے انتہائی مختصر مدت میں حیرت انگیز طور پر مسلمانوں کو عالمی اسٹیج پر غلبہ واستیلاء عطا کردیا تھا۔ جلد ہی مغرب کا خوف صلیبی جنگوں کی شکل میں ظاہر ہوا اور جذبۂ شوق نے صقلیہ اور طلیطلہ کی دانش گاہوں میں قائم ہونے والی مسلم دانش گاہوں سے اپنی پیاس بجھائی۔ صلیبی جنگیں تو اپنے مقاصد میں کچھ زیادہ کارگر ثابت نہ ہوئیں کہ عیسائی مغرب یروشلم کے شہر پر بھی تادیر اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ سکا۔ البتہ صقلیہ اور اندلس میں دانشِ اسلامی سے مغرب نے اپنے عہد تاریک میں جو چراغ روشن کئے اس کے سبب آنے والی صدیوں میں مغرب بقعۂ نور بن گیا۔ اس غلغلہ انگیز کیفیت کو

مغربی مورخین نے کچھ تو تعصب اور کچھ تجاہل عارفانہ کے سبب نشاۃ ثانیہ کا نام دیا۔ غور وفکر کے پچھلے سانچے کچھ اس طرح ٹوٹے کہ کلیسا کی صدیوں پرانی دانش بیزار روایت بھی ہل گئی۔ تحریکِ اصلاح (Reformation) کے جلو میں مذہبی تنگ نظری اور تعصب سے تنگ آ کر روشن خیالی (Enlightenment) کا کچھ اس طرح ظہور ہوا کہ اہل مغرب نے فی نفسہٖ مذہب کو ہی خیر باد کہہ ڈالا۔ مغرب جب ایک بار حصارِ ہدایت سے باہر آ گیا یا جب اس نے خدا کے بجائے انسان کو کائنات کا محور قرار دے ڈالا تو پھر ایک طرح کی بے سمتی اس قوم کا شعار بن گئی، جس کے ہاتھوں میں اب بوجوہ تحریک اکتشاف کی کمان تھی۔

گیارہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے خوف پر شوق غالب آ چکا تھا۔ ایسا اس لیے کہ ان ہی ایام میں طلیطلہ، صقلیہ اور یروشلم کی تینوں علامتی رزم گاہوں پر پھر سے اہل کلیسا کو سبقت حاصل ہو گئی تھی۔ ۱۰۸۵ء میں طلیطلہ، ۱۰۹۱ء میں سسلی اور ۱۰۹۹ء میں یروشلم سے مسلمانوں کا قبضہ جاتا رہا تھا۔ آنے والے دنوں میں طلیطلہ، صقلیہ اور اس کے گرد و نواح کے دوسرے شہر دانشِ اسلامی کے بڑے مراکز بن کر ابھرے جنھوں نے اہل مغرب کو صرف اکتشافی علوم سے متعارف ہی نہیں کرایا بلکہ عربی کتابوں کے لاطینی ترجموں کے ذریعہ انسانی تہذیب کی کل جمع پونجی ان کے ہاتھوں میں تھما دی۔

الخوارزمی کے طرز پر مسلمہ المجریتی کا مقامی زیج جسے غالباً ایڈلارڈ آف باتھ نے لاطینی میں منتقل کیا۔ (ماخذ: بوڈلین لائبریری، آکسفورڈ)

طلیطلہ: یورپ کا پہلا دار الحکمۃ

اندلس میں مسلمانوں کی آمد ابتدا سے ہی ایک عسکری خطرے سے کہیں زیادہ علمی اور فکری چیلنج کے طور پر دیکھی گئی۔ سسلی میں مسلمانوں کو سیاسی استحکام کے حصول میں پچھتّر سال لگ گئے جبکہ اندلس میں محض پانچ برسوں کی مہم جوئی نے ایک مستحکم حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ اس غیر معمولی سبک رفتار کامیابی نے عیسائی اہل فکر کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ان کی شکست
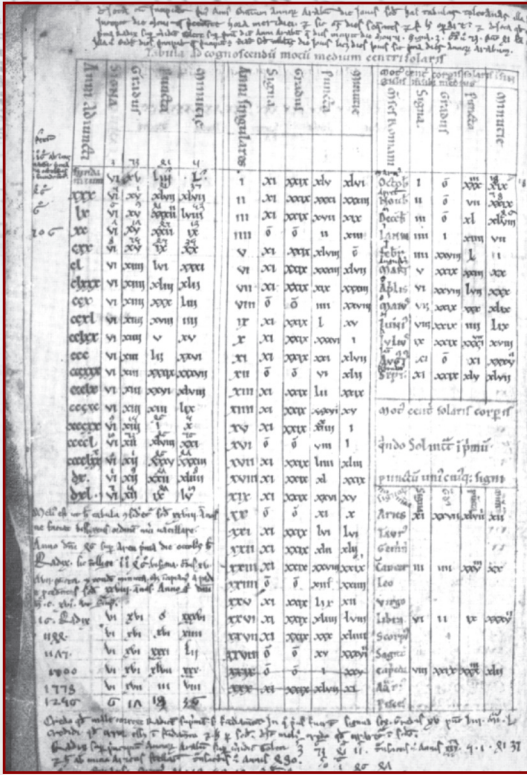
کے پیچھے محض قوت کا عدم توازن نہیں بلکہ ایک نظری اور فکری سبب بھی ہے، جس نے مسلمانوں کو غیر معمولی اعتماد سے سرشار کر رکھا ہے۔ ابھی طارق بن زیادہ کی آمد (۷۱۱ء) کو ربع صدی بھی نہ گزری تھی کہ عیسائیوں کی طرف سے اس نظری خطرے کے سدباب کے لیے ۷۲۴ء میں بائیبل کا عربی ترجمہ شائع ہو گیا۔[۳۸] غالباً اس کے پیچھے یہ جذبہ رہا ہو کہ عیسائیت کی نظری قوت اور دعوتی مشن کے ذریعے حملہ آوروں کو شکست دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جوں جوں اسپین میں مسلمانوں کے قدم جمتے گئے عیسائی دانشوروں کو اس بات کا اندازہ ہوتا گیا کہ مسلمان محض عام حملہ آور نہیں بلکہ فی زمانہ تہذیب کی کل جمع پونجی کے امین بھی ہیں۔ نویں صدی کے وسط میں عبدالرحمن ثانی کی حکمرانی میں عالم اسلام کے مختلف حصوں سے بڑے پیمانے پر علماء اور ان کے ساتھ ساتھ علوم عرب کے مسودات اندلس پہنچنے لگے، جن میں بیشتر کتابیں اکتشافی علوم، خاص طور پر فلکیات سے متعلق تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ امیر عبدالرحمن ثانی کو فلکیات اور نجوم میں خصوصی دلچسپی تھی، جس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ان کی ایما پر ابن فرناس نے ایک بڑی رصدگاہ قائم کی تھی جس میں نظام شمسی کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ آبی گھڑیوں کے ذریعہ اوقات نماز معلوم کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ ابن فرناس نے الخوارزمی کی زیج السندھ ہند کی بنیاد پر خاص قرطبہ کے لیے ایک زیج بھی مرتب کر ڈالا تھا۔ گویا مسلمانوں کے قدم جوں جوں اندلس میں جمتے گئے تسخیر و اکتشاف کی ایک نئی دنیا آباد ہونے لگی۔

عبدالرحمن سوم (۹۱۲ء-۹۶۱ء) جو اب خود کو ایک امیر یا والی کے بجائے اموی خلافت کا جانشین سمجھتے تھے، ان کے اعلانِ خلافت کے بعد اندلس کی علمی سرگرمیاں غیر معمولی طور پر تیز ہو گئیں۔ خلافت کے نئے دعویدار کی حیثیت سے خلیفہ عبدالرحمن کی فطری خواہش تھی کہ قرطبہ اپنی علمی اور سیاسی جاہ وحشمت میں قاہرہ اور بغداد سے کہیں آگے نکل جائے۔ عبدالرحمن کے عہد میں Dioscorides کی *De Materia Medica* کا پہلی مرتبہ عربی زبان میں ترجمہ ہوا اور پھر جلد ہی اس کا لاطینی ترجمہ عیسائی یورپ میں پھیل گیا۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ قرطبہ کی سرزمین پر ابوالقاسم الزہراوی (۹۳۶ء-۱۰۱۳ء)، جسے اہل مغرب Abulcasis کے نام سے جانتے ہیں، کا شہرۂ آفاق طبی مخزن تیس جلدوں میں کتاب التصریف کے نام سے شائع ہو گیا۔ زہراوی کی یہ کتاب محض قدماء کے علوم کا خزانہ نہ تھا بلکہ اس کے اپنے پچاس سالہ طبی تحقیق وتجربہ کا نچوڑ بھی تھا۔ اس عہد کے قرطبہ کا ذکر ابومسلمہ المجریتی (متوفی ۱۰۰۷ء) کے بغیر نامکمل رہے گا جس نے خوارزمی کے زیج کی روشنی میں قرطبہ کے طول البلد کے مطابق ایک ایسے عام فہم زیج کی تالیف کی جس کے لاطینی ترجمے اور پھر اس سے اکتساب پر انگلستان کے پہلے سائنس داں ایڈلارڈ آف باتھ کی شہرت قائم ہے۔ المجریتی کی غایۃ الحکیم جس کا اسپینی اور لاطینی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور استرلوب پر اس کا رسالہ مغرب میں متداول رہا۔ المجریتی کے فلکیاتی تصورات نے کوئی چار صدیوں بعد ابن شاطر کو ایک غیر بطلیموسی نظام کی تشکیل پر آمادہ کیا، جس سے اکتساب بلکہ سرقہ کے سبب آج تک کوپرنکس کی شہرت قائم ہے۔ ابن رشد جو اشبیلیہ اور قرطبہ کے قاضی رہے اور جن کی فلسفیانہ تحریروں نے یہودی مفکر

موسیٰ بن میمون اور عہد وسطیٰ کے سب سے بااثر عیسائی شارح سینٹ ٹامس ایکوناز کی تقلیبِ فکری میں اہم رول ادا کیا، ان کی تحریروں اور اس کے لاطینی تراجم کی ابتدائی آماجگاہ بھی اندلس کی سرزمین ہی رہی ہے۔ ابن زہر (Avenzoar) جن کی طبی تصنیف التیسیر ابن رشد کی الکلیات کے ساتھ مل کر فن طب کا مکمل نصاب سمجھی جاتی تھی ان کے لاطینی ترجمے بھی یورپ میں نشاۃ ثانیہ تک متداول رہے جسے ابن سینا کے القانون کے متبادل کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ خود ابن سینا جو لاطینی مترجمین کے سبب Avicenna کے نام سے جانے گئے، ان کی کتاب القانون فی الطب نے فن طب کو

نویں صدی کے قرطبہ میں عباس بن فرناس کا قائم کردہ تمثیلِ کوکبی (Planetarium) جس میں سیاروں کو واقعتاً گردش کرتا دکھایا گیا تھا۔

مشاہدے اور تجربے کی عقلی بنیاد پر استوار کرنے میں اہم رول انجام دیا، اپنے جلالت علمی کے سبب عیسائی دنیا میں معلم ثانی سمجھے جاتے تھے۔ القانون کا پہلا مکمل لاطینی ترجمہ گیرارڈ آف کریمونا کے ہاتھوں بارہویں صدی میں ہوا۔ یورپ کی دانش گاہوں میں کوئی چھ سو سال تک اس ترجمے کو درسی کتاب کی حیثیت حاصل رہی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بقول امریکی محقق Nancy Siraisi صرف سال ۱۵۰۰ء اور ۱۶۷۴ء کے درمیان اس کے ساٹھ ایڈیشن شائع ہوئے۔ کتاب الشفاء کا لاطینی ترجمہ اس سے بہت پہلے ۱۰۲۱ء میں ہو چکا تھا۔ یہ دونوں کتابیں اندلس اور اس سے باہر علمی حلقوں میں گفتگو کا موضوع تھیں۔ اس کے علاوہ مائیکل اسکورٹ کی طبع زاد تحریروں اور تراجم کے ذریعہ اور خاص طور پر روح اور جسم کی بحث کے حوالے سے ابن سینا کو طب اور مابعد الطبیعات دونوں ہی میدانوں میں حرفِ آخر کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ یہ تھا وہ مجموعی اکتشافی ماحول جس نے اہل مغرب کے لیے مسلم تہذیب میں غیر معمولی کشش پیدا کر دی تھی۔

ادھر طلیطلہ کو ایک ایسا حکمراں نصیب آ گیا تھا جس کے علمی شوق نے اسے المامون (۱۰۴۳ء-۱۰۷۵ء) کا لقب دے رکھا تھا اور جس نے طلیطلہ کو قرطبہ اور اشبیلیہ کا ہم پلّہ بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑا تھا۔ اسلام کی آمد سے پہلے بھی طلیطلہ ویسیگوتھ اسپین (Visigothic Spain) کا دار الخلافہ رہا تھا۔ ۱۰۸۵ء میں عیسائیوں کے ہاتھوں اس کی فتح کے بعد یہ سمجھئے کہ

طلیطلہ کی شکل میں عالمِ عیسائیت کو ایک ایسی موقر دانش گاہ مل گئی جس میں صدیوں کے اسلامی، یونانی، ہندی، ساسانی تہذیب وعلوم کا ارتکاز پایا جاتا تھا۔ نئے عیسائی فاتح الفانسو ششم نے عسکری فتح تو حاصل کر لی تھی البتہ تہذیبی طور پر اس پر ایک مفتوح کی نفسیات غالب تھی۔ وہ عرب علم وثقافت کا اس حد تک دلدادہ تھا کہ اس نے ایک عرب عورت سے شادی کر لی تھی۔ فتح کے بعد طلیطلہ کی جامع مسجد چرچ میں تبدیل کر دی گئی اور اس سے ملحق لائبریری عیسائی اہلِ فکر کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ مختلف اطراف واکناف سے عیسائی طلبہ اور علماء مسلمانوں کے اس علمی خزانے سے اکتساب کے لیے آنا شروع ہو گئے۔ بقول پیٹر (Peter the Venerable) عیسائی اہلِ علم نے بالآخر عربوں کی عظمت کے راز تک رسائی حاصل کر ہی لیا[۳۹]۔ آنے والے دنوں میں کوئی ڈیڑھ سو سال تک چرچ/مسجد کی یہ عمارت یورپ کے پہلے دارالترجمہ کے طور پر کام کرتی رہی، جہاں بے شمار عربی کتابوں کے لاطینی ترجمے انجام پائے اور جسے مسلمان، یہودی اور اسپینی عیسائیوں (Mozarabs) نے مشترکہ طور پر انجام دیا[۴۰]۔ کہا جاتا ہے کہ صرف ایک شخص گیرارڈ آف کریمونا (Gerard of Cremona) نے ایک اسپینی مسلمان کی مدد سے کوئی ۸۸ کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا جس میں سے دوتہائی تو اکتشافی علوم مثلاً فلکیات، ریاضی اور طب وغیرہ سے متعلق تھیں اور بقیہ کا تعلق فلسفہ و کلام سے تھا[۴۱]۔

Liber servitoris

زہراوی کی کتاب کی ۲۸ ویں جلد اپنے لاطینی قالب میں

گیرارڈ کے ترجموں نے اہلِ مغرب کو علم وفن کی ایک نئی دنیا سے متعارف کرایا۔ جلد ہی یورپ کے مختلف اطراف و اکناف سے علم کے شائقین طلیطلہ پہنچنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ انگلستانی عالم Daniel of Morley جب اکتشافی علوم کی تلاش میں پیرس پہنچا تو اسے سخت مایوسی ہوئی۔ بالآخر اس نے طلیطلہ کا رخ کیا۔ عالمِ عیسائیت میں طلیطلہ کے علماء کے علمی دبدبے کا یہ عالم تھا کہ ۱۱۵۸ء میں یہودی عالم ابراہیم بن عزرا جب طلیطلہ سے لندن پہنچا ہے تو اس کی یہ آمد انگلستان اور اس کے قرب وجوار میں Astrology کو قبولیت تامہ عطا کرنے کا سبب بن گئی۔ لاطینی کے علاوہ فرانسیسی اور مختلف یوروپی زبانوں میں اس کی درجنوں چھوٹی بڑی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ کسی نے اس فن کی علمی بنیاد پر محاکمے کی ضرورت کم ہی محسوس کی۔

مسلمانوں کا علم ہو یا ان کا فکری التباس، ایک غالب تہذیب کی حیثیت سے عیسائی یوروپ کے لیے یہ سب کچھ لائق تقلید سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ مغربی مصنّفین اپنی کتابوں کی ابتدا بھی بسم اللہ الرحمن الرحیم کے لاطینی ترجمے سے کیا کرتے، جیسا کہ Roger of Hereford راجر آف ہیرفورڈ کی تصنیف *Liber De Division Astronomiae* سے اندازہ ہوتا ہے۔

طلیطلہ اپنے سقوط سے پہلے بھی مرکز علم وفن کی حیثیت سے معروف تھا۔ مقامی عیسائیوں کو عربی زبان سے واقفیت پر کوئی تین صدیاں گزر چکی تھیں۔ اس اچانک، غیر متوقع اور سبک رفتار سقوط نے عرب تہذیب کا ایک پھلتا پھولتا گھوارہ اپنی تمام تر فکری رعنائیوں کے ساتھ عیسائیوں کے حوالے کر دیا تھا اور چونکہ فاتح اپنی مفتوح قوم کے علمی ورثے سے مرعوب اور مبہوت تھے اور ان علوم کو وہ مسلمانوں کی سطوت وجلالت کا راز سمجھتے تھے، اس لیے اقتدار کی تبدیلی سے علمی سرگرمیاں رکنے کے بجائے مزید تیز ہوگئیں۔ طلیطلہ کے نئے آرک بشپ ریمنڈ وِل (۱۱۲۶ء-۱۱۵۱ء) نے معروف اسپینی فلسفی Archdeacon Dominico Gundislavi کی نگرانی میں مترجمین کی ایک ٹیم کو اہم کتابوں کے تراجم پر مامور کر دیا۔ طلیطلہ کے ہی ایک اور عیسائی عالم جان اشبیلی (John of Seville) نے فلکیات اور نجوم سے متعلق بہت سی عربی کی کتابوں کے ترجمے کر ڈالے جن میں ابومعشر کی **کتاب المدخل الکبیر الی علم الاحکام النجوم** خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ Hugh of Santalla نے الفرغانی پر بیرونی کے نقد کا ترجمہ کر ڈالا۔ اسی طرح مارک (Mark of Toledo) نے طب سے متعلق جالینوس کی بعض کتابوں کا ترجمہ کیا[۲۲] اب تک طلیطلہ میں سیکڑوں عربی کتابوں کے جو ترجمے ہو چکے تھے جن میں فارابی، خوارزمی، بنوموسیٰ، الفرغانی، جابر بن افلح اور الرازی کی اکتشافی تصانیف شامل تھیں، یہ نئے انفرادی ترجمے ان پر اضافہ تھے۔ تیرہویں صدی تک مسلمانوں کے اکتشافی اور کلامی علوم کا قابل ذکر حصہ لاطینی اور مقامی اسپینی زبانوں میں منتقل ہو چکا تھا۔ گیرارڈ (Gerard of Cremona) جن کا تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں اور جنھوں نے کوئی پچاس سال تک اپنے قیامِ طلیطلہ کے دوران عربی سے لاطینی زبان میں ترجموں کا معیاری کارنامہ انجام دیا، ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ابتداً طلیطلہ کی سیاحت پر آئے تھے لیکن جب انھوں نے جامع طلیطلہ کے کتب خانہ میں عربی کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ دیکھا تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور انھوں نے بقیہ زندگی ان کتابوں کے مطالعہ اور ترجمہ میں گزار دی۔ طلیطلہ اور اسپین کے دوسرے شہروں میں تحریک ترجمہ کی روز افزوں ترقی کے باوجود جہاں شائقین کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ابھی کرنے کا بہت کام باقی ہے وہیں یہ ترجمے اس بات کے بھی متقاضی تھے کہ ان علوم کی بنیاد پر نئے تجربوں کی بنا ڈالی جائے۔ مثال کے طور پر فلکیات کے مباحث یا مشرقی ملکوں کے زیج، وہاں کی آب و ہوا اور موسم کا بیان مترجمین سے اس بات کے طالب تھے کہ وہ طلیطلہ، صقلیہ، بغداد اور قاہرہ کے زیج کے ترجموں کے بجائے لندن، پیرس اور اپنے دوسرے شہروں کے مطابق نئی زیج تیار کریں۔ گویا ایک نئے المناخ کی ترتیب کے بغیر، جسے بعد میں انگریزی میں Almanac کہا جانے لگا، ایک خلاقانہ اور زندہ ترجمہ کا کام نامکمل رہتا۔ مثال کے طور پر زیج الفانسو (The Alfonsine tables) جسے یورپ میں

سولہویں صدی تک مقامی زیج کی تیاری میں رہنما سمجھا جاتا رہا ہے، اس کی ترتیب کے وقت خوارزمی کی زیج کا لاطینی ترجمہ مرتبین کے سامنے موجود تھا۔ اس کے علاوہ خود طلیطلہ کے لیے ترتیب دی گئی زیج طلیطلہ کا ترجمہ بھی موجود تھا۔ اب مقامی زبان میں شاہِ قشتالہ (King of Castile) اور الفانسو دہم کی ایما پر ۱۲۷۲ء میں جونئی زیج تیار ہوئی وہ مقامی تقویم سے ہم آہنگ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ چودھویں صدی کی ابتدا میں اس زیج کے لاطینی ترجمہ کے سبب اسے تمام یورپ میں مقبولیت مل گئی[۴۳] کہ تب لاطینی تمام یورپ کی علمی زبان تھی۔

زیج طلیطلہ تو ایک علامت تھی جس نے صدیوں یورپ کے وقت اور سمت کو کنٹرول کیے رکھا، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اہل مغرب کے لیے مسلم اسپین ایک ایسا منارۂ نور تھا، جس سے وہ کسی طرح بھی بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے۔ فرانس، انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے شہروں سے طلباء جوق در جوق قرطبہ، اشبیلیہ، طلیطلہ اور بعض حالات میں صقلیہ کا سفر کرتے۔ بقول Cleugh اس وقت پورے یورپ میں اسپین جیسی کوئی دوسری جگہ نہیں تھی جو وقت کے بہترین دماغوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔[۴۴] آگے چل کر اندلس کے ان ہی شہروں کے تعلیم یافتہ فضلاء نے اپنے اپنے ملکوں میں واپس جا کر بولوگنا، پیرس اور آکسفورڈ میں علم وفن کے وہ چراغ جلائے جس سے کبھی عہد تاریک میں جینے والا یورپ Enlightenment کی تجلیوں سے جگمگا اٹھا۔ اس فکری تبدیلی کا محاکمہ تو ہم آگے کریں گے، آئیے پہلے یہ دیکھیں کہ طلوعِ آفتاب کے اس رزمیہ کی تشکیل میں تحریک اکتشاف کے دوسرے بڑے مسلم مرکز صقلیہ اور اس کے اطراف وجوانب نے کیا رول انجام دیا۔

صقلیہ: طلوعِ آفتاب کی پہلی کرن

صقلیہ میں مسلمانوں کی آمد بالکل ابتدائی ایام یعنی ۶۵۲ء میں ہوگئی تھی، البتہ ریاستی مشنری کو باقاعدہ استحکام نویں صدی میں جا کر ہوا۔ ابتداً اغلبیوں (۸۲۷ء-۹۰۹ء) پھر فاطمیین (۹۰۹ء-۹۶۵ء) اور پھر کسی قدر آزاد امارت (۹۶۵ء-۱۰۹۱ء) کے تحت صقلیہ میں اکتشافی تہذیب کی بنیادیں مستحکم ہوتی رہیں۔ یورپ کے لیے صقلیہ کو درس گاہ کی حیثیت اس وقت حاصل ہوگئی جب ۱۰۹۱ء میں اس پر نارمن عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا۔ نئے فاتحین اس امر پر حیرت زدہ تھے کہ جزیرے میں نہ صرف یہ کہ رصدگاہیں قائم ہیں، تعلیم وتعلّم کا بازار گرم ہے بلکہ مسجد کی میناروں پر نصب آلات سے فلک پیمائی اور مشاہدۂ کائنات کا کام لیا جارہا ہے۔[۴۵] عیسائی دنیا میں جن باتوں کو سرّ خداوندی میں مداخلت پر محمول کیا جاتا تھا وہ تجربات مسلمانوں کے ہاں عین مسجد کے مناروں سے انجام پا رہے تھے کہ تب نمازوں کے اوقات، قبلہ کا تعین، آفتاب کے طلوع وغروب کی باریک بیں واقفیت موقیت مسجد کی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔ دو ڈھائی سو سالوں کی مسلم معاشرت کے بعد اس منظر نامے کا پیدا ہونا باعث تعجب نہ تھا۔[۴۶]

طلیطلہ کے عیسائی فاتحین کی طرح صقلیہ کے نارمن فاتحین بھی مسلمانوں کی جلالت علمی اور اکتشافی علوم میں ان کی
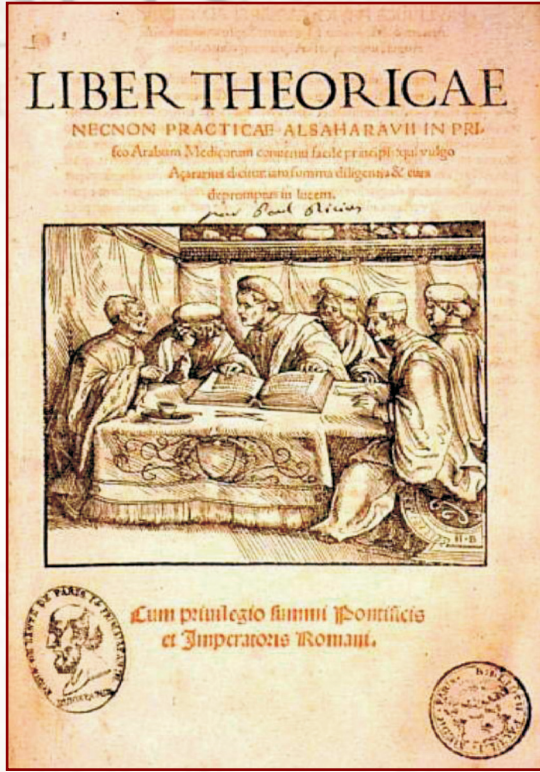
کتاب التصریف کا لاطینی سرورق جس کے صرف سولہویں صدی کے پہلے نصف میں دس سے زائد ایڈیشن شائع ہوئے۔
جلد ہی اس کا ترجمہ فرانسیسی، انگریزی اور عبرانی زبان میں بھی عام ہو گیا۔

غیر معمولی سبقت کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ صقلیہ ایک تجارتی بندرگاہ بھی تھی جس کی مرفہ الحالی میں شرق وغرب کے عرب، یہودی اور عیسائی تاجروں کا مشترکہ حصہ تھا جن کی منظم آبادیاں اس جزیرے پر موجود تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان جو اکتشافی علوم کے امین اور قائد سمجھے جاتے تھے ان کی نت نئی اختراعات و ایجادات، سفر و حضر کو بہتر اور محفوظ بنانے کے جہد مسلسل نے جزیرے کو اس خطہ میں ایک خاص مقام کا حامل بنا دیا تھا۔ نارمن فاتحین اس خوشگوار صورت حال کو بہر طور قائم رکھنا چاہتے تھے سو انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ مسلمان نہ صرف یہ کہ اس جزیرے پر اپنی معمول کی سرگرمیاں جاری رکھیں بلکہ دوسرے اسلامی بلاد و امصار سے بھی اکتشافی علماء کی یہاں آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہے۔ شاہ روجر ثانی (۱۱۳۰ء- ۱۱۵۴ء) نے شریف ادریسی کو، جس کے علم و فضل کا اس عہد میں بڑا چرچا تھا، تمام اکرامِ علمی کے ساتھ صقلیہ آنے کی دعوت دی۔ روجر ثانی جو اکتشافی علوم میں اپنی دلچسپیوں کے سبب کلیسائے روم کی نظر میں قابل ملامت رہا اور جسے اس کے ناقدین نے مسلم علوم وفنون سے اس کی قربت اور دلچسپی کے سبب بپتسمائی سلطان تک کہا، اس کی یہ بڑی خواہش تھی کہ خدا کی زمین جیسی کہ وہ ہے اپنی اصل ہیئت میں خشکی اور تری، پہاڑ اور سمندر اپنے نظامِ شمسی یا طبقِ افلاک کی تفصیلات کے ساتھ کچھ اس طرح متصور کی جا سکے کہ دیکھنے والے کو بیک نظر اس کی تفہیم حاصل ہو جائے اور یہ کہ دریاؤں، سمندروں اور وادیوں کے تفصیلی نقشے کی ترتیب ممکن ہو جائے۔ بالآخر پندرہ برس کے مستقل سفر اور شرق و غرب کے عملی مشاہدے کے بعد نزهة المشتاق فی اختراق الآفاق (کتاب الروجر) کیا مرتب ہوئی گویا عالم انسانیت کو اور خاص طور پر مغرب کو دنیا کی کلید مل گئی[۴۷] بہتوں نے اس کتاب کی مختصرات لکھی اور ادریسی کا خریطۂ عالم شرق وغرب میں صدیوں متداول رہا[۴۸]

مغربی زبانوں میں ادریسی کے خریطۂ عالم کی پہلی آہٹ اطالوی فلسفی برونیٹو لاٹینی (Brunetto Latini) کی کوششوں میں ملتی ہے۔ ادریسی کے اس نقشہ کا مغرب میں اس حد تک اثر ہوا کہ جرمن عالم البرٹس میگنس (Albertus Magnus) نے دنیا کا جو نقشہ مرتب کیا اس میں مشرق کے شہر خصوصی طور پر دکھائی دیتے ہیں، جبکہ مغرب کے اہم شہروں کا تذکرہ بھی نہیں پایا جاتا۔ جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی ترتیب میں ادریسی کے نقشہ کا کتنا ہاتھ رہا ہوگا۔[۴۹] سچ تو یہ ہے کہ ادریسی کے اس نقشہ نے مغرب میں ہیئت عالم کی تصویر ہی بدل دی۔ اب تک عیسائی یوروپ میں جو خریطۂ عالم معروف تھا، اس کے مطابق چپٹی زمین صرف تین براعظم یورپ، ایشیا اور افریقہ پر محیط تھی۔ اب جو ادریسی نے کرۂ ارض کی تمام تفصیلات کو ممکنہ مشاہدے کی بنیاد پر مرتب کر دیا تو مہیب پر اسرار بحری سفر کے مغربی شائقین کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ نئے اعتماد کے ساتھ سمندروں میں اپنی کشتیاں ڈال سکیں۔ ڈی گاما جب ۱۴۹۷ء میں اپنے بحری سفر پر نکلا تو نہ صرف یہ کہ اسے ایک مسلمان جہاز راں کی مشائیت حاصل تھی بلکہ مسلم جغرافیائی معلومات سے بھی وہ پوری طرح لیس تھا۔[۵۰] کولمبس، جسے نئے مغرب کے مؤسس کے طور پر دیکھا جاتا ہے، اس کے بحری سفر کے پیچھے بھی مسلم ملاح اور مسلم جغرافیائی معلومات کے شواہد ملتے ہیں[۵۱] اور واقعہ یہ ہے کہ اس عہد میں مسلمانوں کے اکتشافی علوم سے استفادے کے بغیر کسی بڑی مہم جوئی کا خیال ہی عبث تھا۔

ادریسی کے خریطۂ عالم کی اشاعت اور تمثیلِ کوکبی (planetarium) کے قیام سے مہذب دنیا میں صقلیہ کو جو غیر معمولی شہرت ملی تھی، اس میں مزید اضافہ فریڈرک ثانی کے عہد میں ہوا۔ اپنے دادا روجر ثانی کی طرح فریڈرک ثانی بھی اپنی تعقل پسندی، حریت فکری اور مسلمانوں کے اکتشافی علوم میں غیر معمولی دلچسپی کے سبب مغرب سے کہیں زیادہ مشرقی ذہن کے امین سمجھے جاتے تھے اور انھیں بھی بپتسمائی سلطان سے ملقب کیا جاتا تھا۔[۵۲] فریڈرک ثانی نے اپنے پچاس سالہ دورِ حکومت میں اکتشافی علوم کو مغرب میں عام کرنے کے لیے جو انقلابی اقدامات اٹھائے اور جس کے سبب انھیں دو مرتبہ پوپ کی طرف سے مقاطعہ کا سامنا کرنا پڑا اور ان اقدامات کے مغرب پر جو دور رس اثرات مرتب ہوئے اس کے سبب انھیں بجا طور پر یورپی نشاۃ ثانیہ کا مؤسس کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے سالرنو کی طبی درس گاہ کو نہ صرف یہ کہ وسعت دی بلکہ نیپلز، پاڈوا اور میسینا میں نئی دانش گاہیں بھی قائم کیں۔ کہا جاتا ہے کہ عالم عیسائیت میں نیپلز کا مدرسہ وہ پہلی دانش گاہ ہے جو ۱۲۲۴ء میں باضابطہ شاہی فرامین کے ذریعہ قائم ہوئی۔[۵۳] فریڈرک ثانی محض ایک علم دوست حکمراں ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک نئے اکتشافی دائرۂ فکر کا نقیب بھی تھا جس کی جڑیں عہد تاریک کے عالم عیسائیت کے بجائے مشرق کی جگمگاتی تہذیب میں پائی جاتی تھیں۔ اپنی بود و باش میں بھی وہ مغرب سے کہیں زیادہ مشرق کا پیرو کار تھا۔ وہ مسلمانوں کا سا لباس پہنتا، عربی زبان میں گفتگو کرتا اور مسلمان مصاحبین اور اہل علم سے اس کا دربار آباد رہتا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی رہائش گاہ بھی یروشلم کی مسلم عبادت گاہ مسجد صخرا کے طرز پر بنوائی تھی۔[۵۴] عرب اسے الامبرر کے نام سے یاد کرتے۔ عالم اسلام کے مسلمان اور یہودی علماء سے اس کی باقاعدہ مراسلت رہتی۔

زہراوی کی کتاب لاطینی قالب میں جس نے صدیوں علمِ طب میں یوروپ کی رہنمائی کی ہے۔

یوروپ کی انجمادِ فکری اور چرچ کی بند دماغی کے اس ماحول میں فریڈرک کی مشرق پسندی اور علم دوستی بہت سے تنازعات کا سبب بن گئی تھی۔ اپنے حامیوں کے لیے اگر اس کا وجود stupor mundi یا عجائب عالم کی حیثیت رکھتا تھا تو مخالفین اسے دجال گردانتے جس نے گویا بند دماغ عالم عیسائیت کی بساط لپیٹنے کا تہیہ کر رکھا ہو۔ فریڈرک بذاتِ خود مختلف علوم وفنون کا گہرا ذوق رکھتا تھا۔ کوئی نصف درجن زبانوں پر اسے قدرت تھی۔ پوپ سے اس کے باقاعدہ اختلاف رہتے۔ عقیدۂ تثلیث اور virgin birth کی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی۔ وہ اسلامی کھانوں کا شوقین اور مسلمانوں کی طرح کثرت سے نہانے دھونے کا عادی تھا۔ طرہ یہ کہ جب اس کا جلوس شاہراہوں سے گزرتا تو جلوس میں اونٹ، ہاتھی، زراف اور عقاب ہوتے۔[۵۵] گویا ہر اعتبار سے وہ شاہِ مشرق نظر آتا۔ فریڈرک کی مشرق پسندی اور اکتشافی علوم سے اس کی محبت صقلیہ تک محدود رہتی، اگر اس نے باقاعدہ دانش گاہیں نہ قائم کی ہوتیں۔ مائیکل اسکوٹ ہوں یا ایڈلارڈ آف باتھ یا اس عہد کے دوسرے یوروپی مشاہیر صقلیہ کی علمی فضا سے، جسے اہل مغرب علوم عرب (studia arabum) کہتے ہیں، سبھوں نے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ خود ٹامس ایکوناز جنھوں نے پیرس میں اپنے قیام کے دوران عیسائی الٰہیات کی تشکیل نو کا کام انجام دیا وہ نیپلز کی درس گاہ سے فارغ التحصیل تھے جہاں انھیں اسلامی فکر وفلسفہ کے مطالعہ کا موقع ملا تھا۔[۵۶]

جزیرۂ سسلی کے پڑوس میں ساحل سمندر کے دوسری جانب وینس کے قدیم تاریخی شہر میں جب کوئی شخص پہلی دفعہ داخل ہوتا ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ مشرق کے کسی قدیم شہر میں آ گیا ہو۔ پیازا سین مارکو (Piazza San Marco) سے نکلئے، ریواڈیگلی شیاوونی (Riva degli Schiavoni) سے ہوتے ہوئے ریالٹو برج (Rialto Bridge) کی طرف آ جائیں، عمارتوں کی سج دھج، ان کا طرز تعمیر کبھی آپ کو یہ احساس دلائے گا کہ شاید آپ دمشق کے مسجد اموی کے صحن میں ہیں اور کبھی ایسا محسوس ہوگا گویا آپ قاہرہ میں دریائے نیل کے کنارے کھڑے ہوں۔ اور اگر آپ ڈوجز (doges) کے محلات کے سامنے چند لمحے محو نظارہ ہو گئے تو آپ کے استعجاب میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ وینس کی یہ مشرقیت جو اس کے طرزِ تعمیر، آرٹ اور زیبائش میں نمایاں ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان اثرات سے یورپ کا کوئی قابل ذکر تہذیبی مرکز خالی نہیں۔ گو کہ وینس میں اس کا احساس کچھ زیادہ شدت سے ہوتا ہے۔[۵۷]

وینس جغرافیائی طور پر اٹلی کا حصہ ہے جو کہ اہل مغرب کے لیے نشاۃ ثانیہ کی سرزمین سمجھی جاتی ہے۔ جن لوگوں کی نظر عہد وسطیٰ کی تاریخ پر ہے وہ اس بات سے بھی ناواقف نہیں کہ اسلام کی آمد سے پہلے، بلکہ ساتویں صدی تک، استنبول کو خطہ کے مرکزی، تجارتی بندرگاہ کی حیثیت حاصل تھی۔ اسلام کی آمد کے بعد بازنطینی ریاست کی سرحدیں سکڑتی گئیں۔ اس کے اثرات کم ہوتے گئے۔ اس صورت حال نے وینس کو قسطنطنیہ کے مقابل ایک نئی تجارتی بندرگاہ کے طور پر متعارف کرایا۔ اہل وینس نے مسلمانوں سے صرف تجارت ہی نہیں کی بلکہ اس غالب تہذیب کی حتی المقدور اقتداء کی کوشش بھی کی۔ یہاں سے تجارتی مال واسباب کے ساتھ ساتھ مسلم تہذیب و ثقافت، آرٹ اور فن اندرونِ یورپ میں منتقل ہوتے رہے۔ ۸۲۸ء میں وینس کے دو تاجر اسکندریہ سے سینٹ مارک کے آثار چرا لائے۔ مشرق سے اہل وینس کے تجارتی روابط، اسلامی تہذیب کی جاہ و حشمت اور ان کی پرجلال عمارتوں کو دیکھ کر اہلِ وینس کے دلوں میں یہ خیال آنا فطری تھا کہ وہ اپنے شہر میں سینٹ مارک کی اسی قدر پرحشم یادگار تعمیر کریں گے۔ اہل وینس یا طرز تعمیر کے دوسرے یوروپی شائقین کے لیے تب یہ بات سمجھنا مشکل تھی کہ ان عمارتوں کی جاہ و حشم کے پیچھے کون سے فنی اسرار پوشیدہ ہیں، البتہ آگے چل کر طلیطلہ کے سقوط کے بعد جب جیومیٹری کی کتابیں عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوئیں اور خاص طور پر اقلیدس کی ایلیمنٹس (*Elements*) اور الخوازمی کی کتاب **الجبر و المقابلة** کے لاطینی ترجمے کی اشاعت کے بعد اہل مغرب اس راز سے آگاہ ہو گئے کہ محراب و گنبد کے پیچھے دراصل جیومیٹری کا عمل دخل ہے۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو جدید مغرب کا تمام جاہ و حشم، اس کی تمام تہذیبی عمارتیں، خواہ وہ چرچ کی بلند و بالا عمارتیں ہوں یا دانش گاہوں کی تاریخی عمارتیں، ان کا جاہ و حشم ان ہی ترجموں کے سبب ہے جو عہد وسطیٰ میں عربی سے لاطینی اور دوسری یوروپی زبانوں میں ہوتے رہے۔ جیومیٹری کا علم اگر ایڈلارڈ آف باتھ کے ترجموں کی بدولت مغرب کے کیتھڈرل اسکولوں میں نہ پڑھایا گیا ہوتا اور اگر آکسفورڈ کے چانسلر روبرٹ گروسیٹاسٹ (Robert Grosseteste) (متوفی

ابن العوّام کی کتاب الفلاحۃ جس نے یوروپ کو منفعت بخش زراعت سے آگاہ کیا۔

۱۲۵۳ء) نے زاویہ اور مثلث کے علم کو مشاہدۂ کائنات کے لیے لازم قرار نہ دیا ہوتا[۵۸] تو نہ یہ تہذیبی عمارتیں وجود میں آتیں اور نہ ہی غور و فکر کا اکتشافی منہج منقح ہو پاتا۔

علوم ریاضی کو کلیدی اہمیت مل جانے کے سبب آنے والے دنوں میں غور و فکر کا بنیادی سانچہ ہی بدل کر رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ کائنات ایک طرح کے میکانکی نظام میں مربوط ہے، جس کی دریافت انسان کو نئے انبساط سے سرشار کر سکتی ہے۔ مغربی ذہن ایک طرح کی قطعیت سے سرشار ہوا، علم کے تصورات میں بنیادی تبدیلی آگئی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آنے والے دنوں میں ریاضی کو سائنس اور فلسفہ کے زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔[۵۹]

مغرب کی تاریخ نگاری اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں رہی ہے کہ سینٹ پیٹر کے گنبد و محراب سے لے کر سینٹ پال کے گنبد تک بلکہ کہیں اس سے آگے بڑھ کر کیپٹل ہل کے گنبد کے استحکام اور تزئین کاری میں جیومیٹری کا وہی علم پوشیدہ ہے جو مغرب کو پہلی مرتبہ بارہویں صدی میں عربی زبانوں کے لاطینی ترجموں کے ذریعہ ملا۔ جیومیٹری کا علم عام ہونے سے پہلے مغرب میں نصف دائروی محرابوں کا رواج تھا،[۶۰] جس کے سبب ڈیزائن بڑی حد تک محرابوں کے سائز کا پابند رہتا۔ شہتیری محرابوں کو سہارنے کے لیے ایسی موٹی دیواریں بنائی جاتیں جن میں کھڑکیوں کی گنجائش نہ ہوتی۔ دیواروں اور محرابوں میں نہ کوئی ترتیب ہوتی اور نہ تناسب۔[۶۱] اب جو جیومیٹری کا علم عام ہونے لگا تو مسلم عمارتوں کی

خوبصورتی اور ان کے استحکام کے راز سے بھی آگہی ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۱۲۷ء میں پیرس میں واقع سینٹ ڈینس کی خانقاہ کی تعمیر نو کی گئی۔ راہب شوگر جو اس عمارت کی از خود نگرانی فرما رہے تھے، انھوں نے اس بات کا خاص التزام کیا کہ نوتعمیر شدہ عمارت نہ قدیم یونانی طرز تعمیر کا تتبع ہو اور نہ ہی اس پر رومن طرز تعمیر کی جھلک دکھائی دے۔ ان کے خیال میں یہ نوتعمیر شدہ خانقاہ opus modernum یعنی جدید طرز تعمیر کا نمونہ تھی۔ آگے چل کر اس طرز تعمیر کو گوتھک طرز کا نام دیا گیا۔[۶۲] اور اس طرح یورپ میں جدیدیت (modernism) کی پیدائش کی راہ ہموار ہوئی۔ یہ غالباً پہلی عبادت گاہ تھی جو مسلم طرزِ تعمیر سے اکتساب کے بعد عیسائی یورپ میں تعمیر ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد ایک صدی کے اندر اندر صرف فرانس میں کوئی اسّی کیتھڈرل اسی طرز تعمیر کی اقتدا میں تعمیر کیے گئے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب اقلیدس کے لاطینی ترجمے فرانس کے کیتھڈرل اسکولوں میں شاملِ نصاب ہو گئے تھے۔

مغرب اس طرز تعمیر کو گوتھک (gothic) کا نام دیتا ہے جس سے بظاہر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے اکتساب کے باوجود یہ طرز تعمیر بنیادی طور پر مغرب کی اپنی یافت ہے، البتہ جو لوگ گوتھ قوم کی تاریخ سے معمولی واقفیت بھی رکھتے ہیں ان کے لیے یہ بات مزید حیرت کا باعث ہے کہ جس قوم نے مسلسل تخریب کا بازار گرم رکھا، جس کا دامن علم و تہذیب کے کرشمہ سے خالی ہے، اس کے سر ایک نفیس اور ترقی یافتہ طرزِ تعمیر کا سہرا باندھنا آخر کہاں تک مناسب ہے۔ کرسٹوفر ورن (Christopher Wren) جنھیں لندن میں واقع سینٹ پال کے تاریخی چرچ کی تعمیر کا شرف حاصل رہا ہے اور جن کی نگرانی میں ۸۰ سے زائد تہذیبی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ وہ گہرے مطالعہ کے بعد بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلم طرز تعمیر سے الگ گوتھک طرز تعمیر کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ یہ دراصل مسلمانوں کا طرزِ تعمیر ہے جس پر غالباً تعصب اور بے خبری کے سبب گوتھک کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ہم اس طرزِ تعمیر کو گوتھک کا نام دیتے ہیں۔ (اٹلی والوں نے اس طرز تعمیر کے لیے جو رومن طرز تعمیر سے مختلف تھا یہ نام استعمال کیا) حالانکہ گوتھ قوموں کو تعمیر سے نہیں بلکہ تخریب سے دلچسپی تھی۔ میرے خیال میں عقل و فہم کا تقاضا ہے کہ اسے سارا سن (مسلم) طرز تعمیر کا نام دیا جائے۔ اس لیے کہ گوتھ اقوام نہ تو علم میں دلچسپی رکھتے تھے اور نہ ہی فنون میں۔ جب ہم لوگوں نے مغرب میں ان دونوں ہی چیزوں کو گم کر دیا تو ہم نے اسے (مسلمانوں) سے مستعار لیا۔ ان کی عربی کتابوں سے جو انھوں نے بڑی عرق ریزی سے یونانی ترجموں کی وساطت سے حاصل کیا تھا۔ وہ اپنے مذہب کے بڑے پرستار تھے اور جہاں بھی انھوں نے فتوحات کیں (اور حیرت انگیز رفتار سے کی) وہاں انھوں نے فی الفور مسجدیں اور کارواں سرائے تعمیر کیے۔ انھیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ایک الگ طرزِ تعمیر کو اختیار کریں اور اسی لیے انھوں نے عیسائی صلیب کے مقابلے میں اپنی مسجدوں کو گول (گنبد) سے آراستہ کیا۔''[۶۳]

عہدِ روجر میں صقلیہ کے تکثیری معاشرے کا عکاس چرچ کا ایک کتبہ جس میں یونانی، لاطینی، عربی اور عبرانی زبانوں میں عبارتیں کندہ ہیں۔

کرسٹوفر کے اس موقف کو اب دوسرے اہل فن بھی تسلیم کرنے لگے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریز محقق William Anderson اور فرانسیسی مصنف Jean Boney نے اپنی تحریروں میں بڑی صراحت سے گوتھک طرز تعمیر کو مسلم طرز تعمیر قرار دیا ہے۔[۶۴]

گوتھک طرز تعمیر بنیادی طور پر چار خوبیوں کے سبب معماروں کے ہاں مقبول رہا ہے۔ اولاً یہاں سیدھی سادی محرابوں کے بجائے نوکیلی محرابوں کا استعمال ہوتا ہے جس کے سبب ستونوں کی دوری حسب توفیق گھٹائی بڑھائی جاسکتی ہے۔ ثانیاً یہاں شہتیری محرابوں اور دائروں کے فن کارانہ استعمال سے چھت کا بوجھ کھمبوں پر بآسانی منتقل کردیا جاتا ہے۔ ثالثاً یہاں فلائنگ بٹریس (flying buttresses) کے خلاقانہ استعمال کی گنجائش رہتی ہے۔ رابعاً دیواریں اور ستون اس تناسب سے بنائے جاتے ہیں کہ عمارت کا بوجھ ستونوں پر قائم رہے اور دیواروں کو بڑی بڑی کھڑکیوں سے آراستہ کیا جاسکے۔ ریمس، ایمینس اور چارٹس کے مشہور کیتھڈرل میں اس تکنیک کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال ملتا ہے۔[۶۵] عہد وسطیٰ کی مغربی عمارتوں کا ان عمارتوں سے تقابلی مطالعہ کیجیے جو دمشق، قاہرہ، اندلس اور سسلی کے جزیروں پر ان سے بہت پہلے وجود میں آچکی تھیں تو ہمارے لیے اس عقدہ کی تفہیم آسان ہوجائے گی کہ نوکیلی محرابوں، چار یا چھ شہتیری دائروں کا بیک وقت استعمال مسلم طرزِ تعمیر میں معمول کی بات ہے۔[۶۶] ribbed dome کی تکنیک جو دسویں صدی کے اندلس میں سامنے آتی ہے۔[۶۷] اگر یورپ کو منتقل نہ ہوئی ہوتی تو کسی مائیکل انجیلو کے لیے ممکن نہ ہوتا کہ وہ سینٹ پیٹر کی عبادت گاہ پر اتنے بڑے دلکش گنبد کے تعمیر کی بابت سوچتا اور نہ ہی کسی کرسٹوفر ورن کے لیے یہ ممکن ہوتا کہ وہ سینٹ پال کے چرچ کو گنبد سے مزین کرپاتا اور نہ ہی امریکی کانگریس کی مرکزی عمارت پر آج کیپٹل ہل (Capitol hill) کا شاندار گنبد نظر آتا۔

ترجموں کی نئی دنیا

مسلمانوں سے مسلسل بڑھتے علمی اور تجارتی رابطوں اور عربی کتابوں کے پے درپے لاطینی ترجموں نے مغربی ذہن کی تقلیب ماہیت کا سامان کرڈالا۔ مثال کے طور پر ایڈلارڈ آف باتھ جب اپنے سات سالہ علمی سفر سے انگلستان واپس آئے تو ان کے قلب ونظر میں حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوچکی تھی۔[۶۸] ان کے لیے اب یہ بات قابل قبول نہ رہی کہ کسی مسئلہ

پر فلاں عیسائی عالم یا چرچ فادر کی رائے کیا ہے، بلکہ ان کی نظر میں اب حقیقت صرف وہی تھی جس کی تصدیق عقل کی روشنی میں تجربوں اور مشاہدوں کے ذریعہ ہوسکے۔ نیا ذہن جس کی نمائندگی ایڈلارڈ کر رہے تھے اب صرف اس بات سے قائل نہیں ہوسکتا تھا کہ آگسٹائن یا بیڈ نے یوں فرمایا ہے۔ اب اگر تقلید کے لائق کوئی قوم تھی تو وہ مسلمان مفکرین تھے، جن کے ہاں تلاش حقیقت کا منہج استقرائی کے بجائے استخراجی تھا اور جنھیں ایڈلارڈ عرب ماسٹرز کے لقب سے موسوم کرتے تھے۔

ایڈلارڈ نے اپنی کتاب *Questions Naturals* میں اس نئے منہج علمی کا خاصی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اپنے بھتیجے کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اگر تم کسی مسئلہ پر کوئی موقف اختیار کرو تو اس کے لیے کوئی عقلی دلیل ہونی چاہیے ورنہ اہل فکر (فلسفیوں) کے نزدیک ایسی گفتگو قابل اعتناء نہیں سمجھی جائے گی[۶۹] ایڈلارڈ کی تصنیف جس میں مختلف سوالات زیر بحث آئے ہیں، آنے والے دنوں میں نئے مغربی ذہن کے لیے نشان راہ بن گئی۔ بظاہر تو یہاں سوالات بہت عام سے ہیں، مثلاً انسانی چہرے پر ناک کا مقام منہ کے ٹھیک اوپر کیوں ہے؟ کسی نلکی میں بھرا پانی اسے الٹ دینے کے باوجود کیوں نہیں گرتا، جبکہ نلکی کا دوسرا کنارہ انگوٹھے سے بند کر دیا گیا ہو؟ آخر کیا وجہ ہے کہ چیزیں اپنا قالب بدلتی رہتی ہیں یا ایک جاندار جو آج چھوٹا ہوتا ہے کل طاقتور اور توانا ہو جاتا ہے؟ چاند بے نور کیوں ہے؟ کیا تاروں میں زندگی ہے؟ اور اگر ہے تو وہ زندہ کس طرح رہتے ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان جو تمام ذی روح میں ممتاز نظر آتا ہے اسے اپنی مدافعت کے لیے کوئی فطری ہتھیار کیوں نہیں عطا کیا گیا؟ جبکہ جانوروں کو سینگ، سونڈ یا قلانچیں بھرنے اور فرار ہو جانے کی صلاحیت سے نوازا گیا ہے[۷۰] ان سوالوں کو عقل اور مشاہدے کی روشنی میں جس طرح فیصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ بقول ایڈلارڈ عرب علوم سے اثر پذیری کے سبب ہے۔ مزید کہتے ہیں:

''میں نے اپنے عرب اساتذہ سے عقل کی رہنمائی میں ایک بات سیکھی ہے، جبکہ تم تقلید کے خوگر اور بزرگوں کی اقتداء کے قائل ہو، حالانکہ اقتدائے بزرگان بند دماغی کے علاوہ اور ہے کیا؟ جس طرح بے عقل جانوروں کو گلہ کا نگہبان جدھر چاہتا ہے ہنکالے جاتا ہے اور وہ بے سوچے سمجھے اسی سمت میں نکل پڑتے ہیں۔ اسی طرح اقتدائے بزرگاں تمھیں جانوروں کی طرح مختلف خطرناک سمتوں میں لیے پھرتی ہے۔

یہ لوگ (ہمارے اہل وطن) اس بات سے واقف نہیں کہ انسان کو عقل اس لیے دی گئی ہے کہ اسے حکم بنایا جائے تاکہ ہم حق و باطل میں تمیز کر سکیں۔ اگر عقل کا یہ فریضۂ منصبی نہ ہوتا کہ وہ ہمیں خیر و شر پر مطلع کرے تو یہ جو ہر شخص کو انفرادی طور پر کیونکر عطا ہوتا۔ پھر تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ جس شخص کو قانون بنانا ہے یا جس مجموعۂ افراد کو یہ کام انجام دینا ہے صرف انھیں ہی عقل سے سرفراز کیا جاتا اور عام لوگ ان کے آمرانہ احکامات کی اتباع میں ہی سکون و اطمینان پاتے۔''[۷۱]

اپنے عرب اساتذہ کی طرح ایڈلارڈ بھی عقل اور مشاہدے کی پرزور وکالت کے باوجود خدا بےزار نہ تھے۔ انھوں

نے اس بات کا برملا اظہار کیا کہ خدا پر یقین کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان کائنات میں غور وفکر سے منھ موڑ لے۔ بقول ایڈلارڈ ہر چیز خدا کی طرف سے ہے، البتہ ہمارا کام یہ ہے کہ انسانی عقل وفہم کو اس کی تمام تر رفعتوں کے ساتھ کام میں لائیں اور اس عمل میں جب ہماری عقل جواب دینے لگے تو معاملہ خدا کے سپرد کردیں۔[۲]
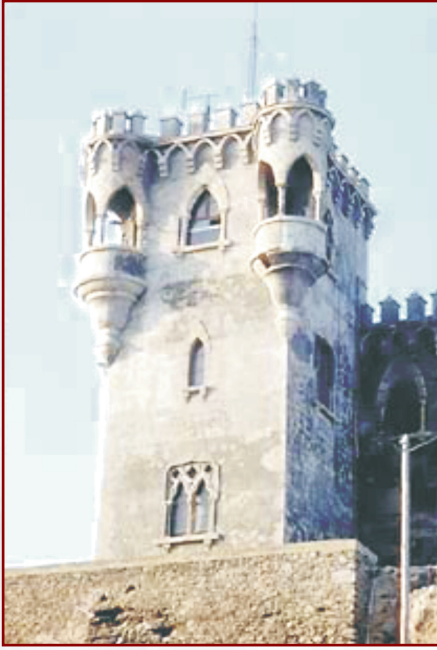
مسلم اسپین: جب مسجد اور محلات کے مناروں سے فلک پیمائی کا رواج عام تھا۔

ایڈلارڈ کے اکتشافی طرز فکر، اقلیدس اور زیج السندھ ہند کے ترجمے نے ہی کیا کم اتھل پتھل مچا رکھی تھی۔ ۱۱۵۰ء میں انھوں نے اسطرلوب کے بارے میں اپنی ایک طبع زاد کتاب شائع کردی۔[۳] اس کتاب کی اشاعت سے یوں سمجھئے کہ انگلستان میں ایک نئی اکتشافی صبح کا آغاز ہوگیا۔ ایسا محسوس ہوا گویا اسطرلوب کے چھوٹے سے آلے کی شکل میں مغرب کے ہاتھوں میں کائنات کی کلید آ گئی ہو۔ اب تک بلاد مغرب میں وقت کا تعین ایک مشکل کام تھا، خاص طور پر ابر آلود دنوں میں اوقات کے تعین کا کوئی قطعی طریقہ معلوم نہ تھا۔ وقت بے وقت چرچ کی گھنٹیاں بجتی رہتیں، اسطرلوب کے استعمال سے اب نہ صرف یہ کہ وقت کے تعین کی سائنسی بنیاد ہاتھ آ گئی، شب وروز کی تنظیم میں اس سے کام لیا جانے لگا، بلکہ مغربی انسان اب اس اعتماد سے سرشار بھی نظر آیا کہ وہ اس مہیب پراسرار کائنات میں اپنے مقام کا تعین کر سکے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عیسائی تصورِ کائنات جس میں زمین چپٹی بتائی جاتی تھی اس کی جگہ ایک بیضوی زمین نے لے لی جس کی مسافتوں کا تعین اب مغربی انسان کے لیے ممکن ہوگیا تھا۔[۴] اسطرلوب کا وجود اس حقیقت کا علامیہ تھا کہ زمان ومکان پر انسانوں کی گرفت مضبوط ہوگئی ہے۔

کائنات کے اسرار ورموز سے آگہی کی جدوجہد میں ایڈلارڈ تنہا نہ تھے۔ نہ جانے کتنے لوگ البیرونی اور ابوالفداء بننے کے شوق میں مختلف قسم کے کچے پکے فلکیاتی تجربوں میں مصروف دکھائی دیتے۔ کوئی نصف صدی پہلے والچر نے Petrus Alfonsi کی مدد سے مقامی زیج کی تیاری کی جو کوشش کی تھی وہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی تھی۔[۵] البتہ ایڈلارڈ کا کارنامہ اس اعتبار سے اہم تھا کہ انھوں نے الخوارزمی کی زیج کی بنیاد پر اپنے شہر باتھ کے لیے قدرے کامیابی کے ساتھ ایک زیج مرتب کرڈالی۔ انھیں اس کام میں المتریجی کی زیج سے بڑی مدد ملی جنھوں نے خوارزمی کی بغدادی زیج کو قرطبہ

کے مطابق ڈھال دیا تھا۔[٦] زیج، استرلوب اور زائچہ نویسی نے اہل مغرب کو جس طرب انگیز کیفیت سے دوچار کر رکھا تھا اس کا اندازہ اسی عہد کے John of Worcester کے اس بیان سے ہوتا ہے:

''میں نے اس لمحہ کا تعین کر ڈالا ہے جب عربی سال کا پہلا مہینہ، پہلا دن بلکہ پہلی ساعت شروع ہوتی ہے اور جس کے مطابق مؤقر عالم الخوارزمی نے زیج کی تشکیل کی ہے، جس سے ہفت سیارگان کی حرکت کا پتہ چلتا ہے۔ ہم نے اس علم کے مطابق تقویم اس لیے مرتب کیا ہے تاکہ یہ علم رائیگاں نہ جائے۔''[٧]

بارہویں اور تیرہویں صدی کے دوران عالم عیسائیت میں ترجموں کی اس قدر گرم بازاری رہی کہ علم جدید کا مطلب علومِ عرب کا ترجمہ سمجھا جانے لگا۔ شاید ہی کوئی قابل ذکر اہل علم ہو جس نے اس عمل میں حصہ نہ لیا ہو یا لاطینی ترجموں سے عدم التفات کو روا رکھا ہو۔ جس کے ہاتھ عربی زبان کی جو کتاب آئی وہ اوّلین فرصت میں اس کے ترجمے کے لیے بیٹھ گیا، مبادا کوئی دوسرا مترجم اس سے سبقت لے جائے۔ اسپین، سسلی، ایڈیسا اور انطاکیہ کے شہروں میں مغربی شائقینِ علم نئی عربی کتابوں اور پرانے مخطوطات کی تلاش میں پھرا کرتے۔ خاص طور پر اسپین میں تو یہ عمل بہت بعد تک جاری رہا۔ مسلم اسپین جس قدر سکڑتا جاتا مسلمانوں کے سرمایہ کی یافت کے نئے مواقع ہاتھ آجاتے۔ ترجمہ کے اس عمل کو گوکہ ریاست اور چرچ دونوں کی حمایت حاصل تھی، لیکن ترجمہ کسی منصوبہ بند عمل کا حصہ نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے عرب علوم کی جلالت علمی کا دبدبہ کام کر رہا تھا۔ سو ایک ہی موضوع پر نئی پرانی کتابوں کے مختلف ترجمے شائع ہوئے اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی کتاب کا مختلف مصنّفین نے اپنی اپنی بساط بھر ترجمہ کا حق ادا کیا۔ مثال کے طور پر علی بن عباس المجوسی کی کتاب الملکی (كامل الصناعة الطبية الضرورية) جس کا ترجمہ اسٹفن آف پیسا (Stephen of Pisa) نے (۱۱۲۷ء) *Regalis Dispositio* کے نام سے کیا۔ اس کا ترجمہ قسطنطین الافریقی کے ہاتھوں پہلے بھی ہو چکا تھا۔ اسٹفن نے اس دعویٰ کے ساتھ یہ نیا ترجمہ پیش کیا کہ پرانا ترجمہ نامکمل ہی نہیں ناقص بھی تھا۔ اسٹفن نے اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ وہ جلد ہی علوم کے ان تمام خزانوں کو، جو عربی زبان میں ہونے کے سبب اہل مغرب کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، اپنے ترجموں کے ذریعہ آشکارا کرے گا۔[٨] تیرہویں صدی تک ترجموں کی اس قدر کثرت ہوگئی کہ بقول اولیور آف برٹینی (Oliver of Brittany) صرف فلکیات پر مترجمہ کتب اور ان کے مصنّفین کا شمار کرنے کے لیے مکمل ایک دن کا وقت بھی ناکافی ہوگیا۔[٩]
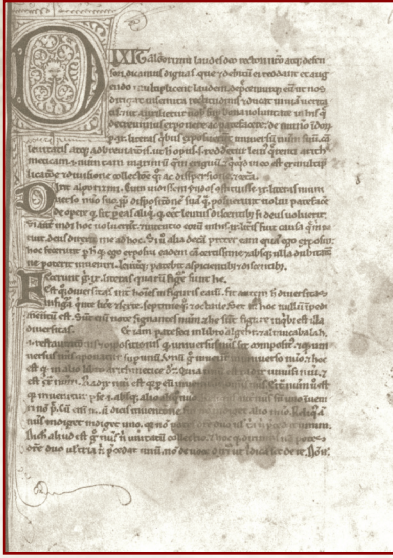
Dixit algorizmi

الخوارزمی کے لاطینی ترجمے سے ایک صفحہ

موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے ترجموں کے اس سرمایے کو احصاء العلوم کی حیثیت حاصل تھی۔ اس سرزمین پر کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس کا اجمالی یا تفصیلی ذکر ان کتابوں میں موجود نہ ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترجموں کے ان غلغلہ انگیز ہنگاموں نے جلد ہی طبع زاد، ماخوذ (adapted) اور بسا اوقات سرقہ شدہ کتابوں کے لیے بھی راہ ہموار کردی۔ مغرب کو جس شخص نے سب سے پہلے مسلمانوں کے علم الحساب یا ریاضی سے آگاہ کیا اور اس فن پر *Liber Abaci* (1202) کے نام سے باقاعدہ کتاب تصنیف کی وہ Leonardo Fibonacci of Pisa ہے، جو فریڈرک ثانی کے سسلی سے اپنی قربت کے سبب خوارزمی کی کتابوں سے آگاہ ہوا۔ لیونارڈو ان چند ابتدائی مصنّفین میں ہے جو اپنے عرب اساتذہ کا کھلے دل سے معترف ہے۔[۸۰] خوارزمی جس کے لاطینی ترجمے *Algoritmi de numero Indorum* اور لاطینی نام Algoritmi سے Algorithm موسوم ہے، اس کی بعض کتابوں کے تراجم رابرٹ آف چیسٹر کے ہاتھوں ۱۱۴۵ء میں پہلے ہی ہو چکے تھے۔ پیسا اور انطاکیہ سے لے کر طلیطلہ، پیرس اور آکسفورڈ گویا مغرب کا کوئی ایسا قابل ذکر علمی شہر نہ تھا جو تحریک ترجمہ کے علمی اثرات اور فکری ولولہ انگیزیوں کے حصار سے باہر رہ گیا ہو۔ ہمارا مقصد چونکہ یہاں نہ تو مترجمین اور ان کی کتابوں کا احاطہ مقصود ہے اور نہ ہی اس عہد کی علمی تاریخ مرتب کرنا ہے، ہم تو مختصراً صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ تحریک اکتشاف کی ابتدائی کرنیں جب گیارہویں اور بارہویں صدی کے خوابیدہ مغرب پر پڑیں تو ان کے ہاں ہمارے تعامل اور ہماری کتابوں کے ترجموں کے سبب کس طرب انگیز کیفیت کا ظہور ہوا اور یہ کہ اہل مغرب کوئی پانچ سو سالوں تک ہمارے علمی اور اکتشافی تفوق کو گاہے کھلے دل سے اور گاہے بحالت مجبوری قبول کرتے رہے۔ طوالت سے بچنے کی خاطر ہم صرف ابن الہیثم کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔

تیرہویں صدی کی ابتدا میں ابن الہیثم کی تصنیف **کتاب المناظر** (*Perspectiva* یا *De aspectibus*) کا لاطینی ترجمہ کیا شائع ہوا گویا عہد تاریک کے مغرب کی آنکھوں میں روشنی سی آ گئی۔ اس کتاب کی اشاعت سے نہ صرف یہ کہ بصریات سے متعلق قدیم یونانی علوم پر خط تنسیخ پھر گئی جس کے لاطینی ترجموں کے اشتغال میں آکسفورڈ کے چانسلر روبرٹ گروسیٹاسٹ (Robert Grosseteste) جیسے لوگوں نے عمر عزیز کا بڑا حصہ ضائع کیا تھا[۸۱] بلکہ *Perspectiva* نے مشاہدے اور تجربے کو علم کی کلید قرار دینے میں اہم رول ادا کیا۔ روجر بیکن جسے مغرب میں اکتشافی منہج کے عظیم شارح کی حیثیت

Santa Maria del Mar, Barcelona

چودھویں صدی میں
تعمیر شدہ اس چرچ میں
مسلم طرزِ تعمیر کی
شان نمایاں ہے
جہاں نوکیلی محرابوں
اور جومیٹرائی پیمائش نے
حسن و جمال اور
ہیبت و عظمت کو
یکجا کر دیا ہے۔

حاصل ہے اور جس نے عہد وسطیٰ کے مغرب پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے ہیں، ان کی حیثیت ابن الہیثم کے معنوی شاگرد کی ہے۔ بیکن ہی کیا ان کے دوسرے معاصرین مثلاً جون پیچم (John Pecham) اور ویٹیلو (Witelo) نے بھی اپنی تحریروں میں *Perspectiva* کی مکمل اتباع کی۔ بیکن پر ابن الہیثم کی جلالت علمی کا اتنا دبدبہ تھا کہ اس کے نزدیک تحقیق و تجزیہ کی درستگی کے لیے اتنا کافی تھا کہ اس کی تائید ابن الہیثم کے اقوال سے ہوتی ہو۔[۸۲] کچھ یہی حال پیچم کا بھی تھا جو اپنی تحریروں کو اعتبار بخشنے کے لیے جا بجا اس بات کا اظہار کرتے کہ ان کا یہ نقطہ نظر ''مصنف مدظلہ'' یعنی الہیثم کے موقف کے عین مطابق ہے۔[۸۳] بیکن، پیچم اور ویٹیلو تینوں کے ہاں بصارت کی سائنسی توجیہہ بعینہٖ وہی ہے جو ابن الہیثم نے کی ہے حتیٰ کہ ان تینوں نے اپنے موقف کی توضیح میں جو مثالیں دی ہیں وہ بھی الہیثم سے مستعار ہیں۔[۸۴] آنے والے دنوں میں ابن الہیثم کے ان تین مغربی شاگردوں نے بلادِ یورپ میں بصریات کے علم کو مقبول عام بنانے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ بیکن کی اہمیت کا اعتراف تو آج بھی ایک دنیا کرتی ہے۔ پیچم کی *Perspectiva Communis* اور ویٹیلو کی *Perspectiva* درسی کتابوں کی حیثیت سے عہد وسطیٰ میں متداول رہی ہے۔ ان دونوں کتابوں کے درجنوں مخطوطات کی موجودگی اس امر کا بین ثبوت ہے۔[۸۵] پیچم کی *Perspectiva Communis* کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ مغرب کی درس گاہوں میں سترہویں صدی تک اس کتاب کو الہیثمی بصریات کی مستند ٹیکسٹ بک کی حیثیت حاصل رہی۔ بلکہ آج بھی جدید بصریات کی تمام تر ترقی خواہ یہ کیمرے سے متعلق ہو یا عینکوں، دوربینوں اور خوردبینوں سے ملحق، یہ سب کچھ بڑی حد تک ابن الہیثم کی کتاب المناظر کی ہی رہین منت ہے۔

روجر بیکن کے اکتشافی طرز فکر اور مشاہداتی منہج (De Scientia Experimentali) نے روایتی طرز فکر کو اس قدر متزلزل کر دیا کہ Pope Clement IV کو اپنے ایک حکم نامہ (مجریہ ۲۲/جون ۱۲۶۶ء) کے ذریعہ بیکن کی تحریروں کو تفتیش اور مطالعہ کے لیے طلب کرنا پڑا۔ بیکن نے جواب میں اپنی کتابوں کے ساتھ پوپ کے نام جو خط روانہ کیا اس میں چرچ اسکولوں کے لیے ایک نئے نصاب کی تجویز رکھی جس میں علم السنہ، ریاضی، بصریات، الکیمی اور تجرباتی علوم کے علاوہ اخلاقی فلسفہ و دینیات کا مضمون شامل کرنے کی تجویز پیش کی۔ فطری سائنس اور خاص طور پر الکیمی، جس سے بقول روجر اس وقت کا یوروپ یکسر ناآشنا تھا، کی پرزور وکالت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

> ''لیکن اس کے علاوہ ایک علم اور بھی ہے اور یہ عناصر کی مدد سے اشیاء کی تخلیق کا علم ہے۔۔۔ جس کے بارے میں ارسطو کی کتابوں میں ہمیں کچھ بھی نہیں ملتا اور نہ ہی نیچرل فلاسفر اس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں اور نہ ہی لاطینی علماء کی بے ہنگم بھیڑ کو اس سے کچھ بھی واقفیت ہے۔ اور چونکہ عام طلباء اس علم سے قطعی ناواقف ہیں اس لیے وہ اشیاء کی ماہیت کا بھی کچھ علم نہیں رکھتے۔۔۔ اس علم کو الکیمی سے موسوم کرتے ہیں جو ہمیں بتاتا ہے کہ بے جان اشیاء اور عناصر سے مختلف چیزیں کیسے بنائی جاسکتی ہیں۔''[۸۶]

۱۴۲۰ء میں سمرقند میں قائم ہونے والی الغ بیگ کی مشہور زمانہ رصدگاہ
جب وقت پر مسلمانوں کی گرفت مضبوط تھی اور جب گرین وچ مین ٹائم کا کوئی وجود نہ تھا۔

اکتشافی علوم میں لوگوں کی عمومی دلچسپی اور مسلمانوں کے ثقافتی اور سیاسی غلبہ کے سبب لاطینی ترجموں کی بڑھتی مقبولیت نے چرچ کو بالآخر روجر کے خلاف اقدامات پر مجبور کر دیا۔ ان پر ابن رشد سے اثر پذیری کا الزام لگا اور وہ ایک طویل مدت کے لیے قید خانہ میں بند کر دیے گئے۔ لیکن اس کے باوجود نئے علوم میں لوگوں کی دلچسپی بڑھتی گئی اور ان کے متعارف کردہ اکتشافی منہج کو تلاشِ حق کی کسوٹی کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ ابن الہیثم کی طرح جنھوں نے شبہات کو تجربات اور مشاہدات سے فیصل کرنے کی بھرپور وکالت کی تھی روجر نے بھی مشاہداتی علوم کے لیے تجربات کو کلید قرار دیا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ ان تجربات سے ہی ہم صحیح نتائج تک پہنچ سکتے ہیں: ''تجربہ ہمیں نئے علوم سے روشناس کراتا ہے اور ہم پر ایک بالکل ہی نئی دنیا وا کرتا ہے اور یہ کہ اس عمل میں علم ریاضی کی بڑی اہمیت ہے۔''[87] روجر کی تعلیمی اصلاحات اگر ایک طرف عیسائی مدرسوں کو اکتشافی علوم کے مرکز میں تبدیل کرنے کا سبب بنی تو دوسری طرف ان اقدامات سے خود چرچ کی تقلیب کا بھی آغاز ہو گیا۔ کیپلر کے ظہور میں آنے سے پہلے روجر اور ان کے معاصرین پیچم اور وائٹیلو مغربی ذہن کی کمان سنبھالے رہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عہد وسطیٰ کی ان اکتشافی سرگرمیوں نے سترہویں صدی کے سائنسی انقلاب کے لیے

میدان ہموار کیا۔ اگر ابن الہیثم، البیرونی، الخوارزمی، المجریتی، الزہراوی، ابن سینا، ابن شاطر اور ان جیسے دوسرے مسلم علمائے اکتشاف کی کتابیں لاطینی میں ترجمہ ہوکر عہد وسطیٰ کے یورپ کو ایک طرب انگیز غلغلہ سے دوچار نہ کرتیں اور اگر غزالی اور ابن رشد کی فلسفیانہ تحریروں نے لاطینی مغرب کی مذہبی فکر کو متزلزل نہ کیا ہوتا تو نہ تو سترہویں صدی کا سائنسی انقلاب رونما ہوتا اور نہ ہی چرچ کی اصلاح (Reformation) کا کوئی داعیہ پیدا ہوتا۔

ترجمہ بنام سرقہ

کوئی سات سو سالوں تک مغرب مسلمانوں کی جلالت علمی سے مبہوت رہا، پھر آخر کیا وجہ ہے کہ اٹھارہویں صدی میں قوت کے میزانیہ میں تبدیلی کے ساتھ ہی مسلمانوں کے علمی احسانات پر مفروضہ عہد سیاہ کی دھند کچھ اس طرح چھا گئی کہ یورپ کی علمی تاریخ سے مسلمانوں کا تذکرہ یکسر محو ہوکر رہ گیا۔ ہمارے خیال میں اس کا ایک سبب ان اساطیر کی تشکیل تھی جس کی اٹھارہویں صدی میں ایک ابھرتے ہوئے یورپ کو ضرورت تھی، جس کا تفصیلی محاکمہ ہم اگلے صفحات میں کریں گے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ اکتشافی علوم کے مغربی مترجمین نے بڑے پیمانے پر ان کتابوں کو طبع زاد کتابوں کی حیثیت سے اپنے نام سے شائع کر دیا تھا۔ آنے والے دنوں میں علمی سرقہ کی اس گرم بازاری نے تاریخ نویسوں کے لیے بڑے مسائل پیدا کر دیے۔ ان کے لیے یہ جاننا دشوار ہو گیا کہ مختلف فن پر مشہور اور متداول یوروپی تصانیف یا ایجاد و اکتشاف کے مغربی دعوے کن عربی کتابوں اور مسلمان علماء سے ماخوذ ہیں۔ ابن عبدون نے اس خطرے کا بہت پہلے اندازہ کرلیا تھا۔ جب عربی کتابوں اور مسودات کی تلاش میں یہودی اور عیسائی شائقین سسلی، اندلس اور عالم اسلام کے مراکز کا چکر لگا رہے تھے، اسی وقت ابن عبدون نے مسلمانوں کو متنبہ کیا تھا کہ ہمیں یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں اکتشافی علوم کی کتابیں بیچنے سے احتراز کرنا چاہیے، اس لیے کہ یہ لوگ ان کتابوں کے ترجموں کو اپنے لوگوں کے ناموں سے موسوم کر دیتے ہیں، جبکہ یہ مسلمانوں کی علمی کاوشوں کا ثمرہ ہیں۔[۴۸] عربی کتابوں کے ترجموں میں چرچ اور ریاست دونوں نے مترجمین کی جس طرح حوصلہ افزائی کی بلکہ چرچ کے وابستگان اور عہدیداران بہ نفس نفیس جس طرح اس عمل میں شریک رہے اس کے پیچھے بہت سے داعیات میں ایک داعیہ یہ بھی تھا کہ جتنا جلد ممکن ہو سکے علوم کو عربوں یعنی مسلمانوں کی غلامی سے آزاد کرا لیا جائے۔[۴۹] پھر ایک ایسے معاشرے میں جہاں علم کی روایت ناپختہ اور علمی دیانت کے اصول ابھی واضح نہ ہوئے ہوں علمی سرقہ کی سنگینی کا شاید اس قدر اندازہ نہیں ہوتا۔ البتہ بڑے پیمانے پر عربی الاصل کتابوں کے سرقہ سے ہوا یہ کہ اگلی نسلوں کو اس علمی تحریک کے عربی الاصل ہونے کا کماحقہ اندازہ نہ ہوسکا، تا آنکہ سترہویں صدی کے مغنیانِ مغرب کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ، تحریک اصلاح، عہد تجلی اور دوسرے فکری انقلابات کا سرا عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کے بجائے مفروضہ ماضی بعید کے یونان سے منسلک بتائیں۔
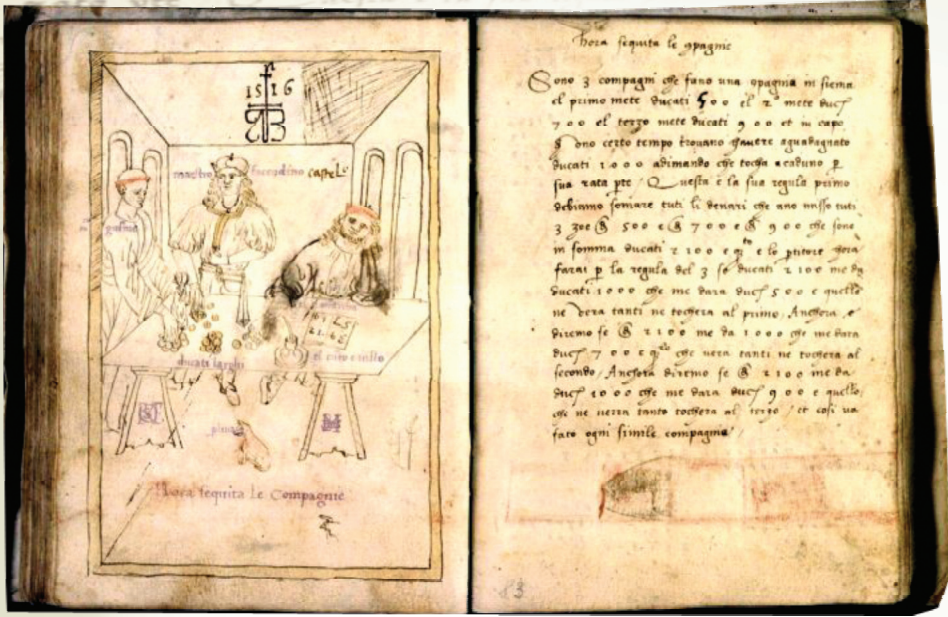
مشرق کے شاگرِ رشید لیونارڈو فبیو ناسی کی کتاب Liber Abaci (مطبوعہ ۱۲۰۲ء)۔
اس کتاب نے مغرب کو پہلی بار الجبرا اور ہندی ہندسوں سے متعارف کرایا۔ عربی زبان کا صفر لاطینی میں zephirum بنا،
پھر اطالوی میں zefiro ہوا اور پھر وینس کی مقامی زبان میں zero کہا جانے لگا۔

اسے سرقہ کہیے یا adaptation بہر حال اس کی سنگینی کم نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر روجر بیکن جا بجا ابن الہیثم کو سند کے طور پر پیش کرتے ہیں، لیکن وہ یہ بتانے سے گریزاں ہیں کہ ان کی کتابِ اکبر *Opus Majus* دراصل ابن الہیثم کی *Opticae Thesaurus* سے مستعار ہے۔[۹۰] اسی طرح Raymundus Lullus جو مسلمانوں کے خلاف اپنے تعصب کے لیے مشہور ہیں، انھوں نے علم کیمیا میں بہت سی عربی الاصل کتابوں کو اپنے نام سے شائع کر دیا۔ ابتدائی مترجمین میں قسطنطین الافریقی نے *Pantegne* کے نام سے علم طب کی جو مفصل کتاب شائع کی وہ دراصل علی بن موسیٰ المجوسی کی کتاب **كامل الصناعة الطبية** کا حرف بہ حرف ترجمہ ہے۔ مغرب میں کوئی دو سو سال تک یہ کتاب ان ہی کے نام سے متداول رہی۔ کچھ یہی معاملہ حنین بن اسحاق کی کتاب العین، اسحاق بن عمران کی کتاب المالیخولیہ اور ابن الجزاء کی کتاب الباہ کے ساتھ پیش آیا جو عرصہ ہائے دراز تک یورپ میں جالینوس روفوس اور سکندر طرالیسی (Alexander of Tralles) کی تصانیف سمجھی جاتی رہیں۔[۹۱] بعض مسلم مصنّفین کی کتابیں قدیم یونانی مصنّفین کے ناموں سے موسوم کر دی گئیں۔ مثال کے طور پر مائیکل اسکاٹ نے فلکیات پر نور الدین بطروجی اور ابن رشد کی **کتاب السماء** وغیرہ کو ملا کر ایک کتاب تیار کی جسے نیکولس دمشقی (Nicolaus Damascenus) کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔[۹۲] اس قسم کی بد دیانتی نے مسلمانوں کا صحیح مقام متعین

کرنے میں سخت دشواری پیدا کردی۔ عہد وسطیٰ کے مسلم علماء کے کارنامے جدید یورپ کے سائنس دانوں سے موسوم ہونے لگے۔ مثال کے طور پر لیونارڈو کو ہوائی جہاز کا مؤسس سمجھ لیا گیا، لیکن اس سے چھ سو سال پہلے قرطبہ میں ابن فرناس کے پہلے ہوائی سفر کی یادیں لوگوں کے ذہن سے محو ہو گئیں۔ جابر بن حیان کا علم الکیمیا اپنی تمام تر دستاویزی شہادت کے باوجود اس پروپیگنڈے کا مقابلہ نہ کرسکا کہ جدید علم الکیمیا کی ابتدا Boyle سے ہوتی ہے۔[۹۳] ابن الشاطر کا **الزیج الجدید** جس کے اکتساب بلکہ سرقہ پر کوپرنکس کے *De Revolutions* کی عمارت قائم ہے تاریخ کے صفحات میں گم ہو گئی اور کوپرنکس کو جدید دنیا کا بانی مبانی تسلیم کرلیا گیا۔[۹۴] ابن النفیس کی یہ دریافت کی کہ پھیپھڑے اور قلب کے درمیان خون کس طرح پہنچتا ہے (minor circulation of blood) مائیکل سروٹس (Michael Servetus, 1510-1553) اور کسی حد تک ولیم ہاروے (William Harvey, 1578-1657) سے منسوب کردی گئی۔[۹۵] ابن النفیس کے شاگرد ابن القف کی capillaries in blood circulation کی دریافت (Marcello Malpighi of Bologna (1628-94 سے موسوم ہوگئی۔[۹۶] ابوالقاسم الزہراوی کی **کتاب التصریف** سے اخذ کردہ بہت سے عملی نسخے مختلف مغربی علماء کے نام سے مشہور ہو گئے، مثلاً کوچرس میتھڈ (Cocher's method) جو اکھڑے ہوئے کندھوں کی درستگی کے لیے معروف ہے یا والچر پوریشن (Walcher Position) جو دردِ زہ میں کمی کے لیے مجرب سمجھا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ آلات جو مسلمانوں کی رصدگاہوں اور تجربہ گاہوں میں مستعمل چلے آتے تھے انھیں بھی بعد کے مغربی سائنس دانوں کے نام سے موسوم کردیا گیا۔ مثال کے طور پر استنبول میں تقی الدین کی رصدگاہ میں مُورل کواڈرینٹ (Mural quadrant) کا رواج عام تھا، آج اسے Tycho Brahe کے نام کی مناسبت سے Tichonicus کہا جاتا ہے۔[۹۷]

مسلمان اہل علم ابتدائی صدیوں میں اس بات سے واقف ہو چکے تھے کہ آسمان کا رنگ لاجوردی نہیں ہے۔ الکندی کے مطابق فضا جو زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہے اس لیے ایک ہلکی سی روشنی دینے لگتی ہے کہ زمینی ناری اجزاء اس حرارت کے باعث منتشر ہو جاتے ہیں، جسے انھوں نے زمین سے انعکاسِ شعاع کے سبب قبول کیا ہوتا ہے۔ سو ہمارے سروں پر جو تاریک فضا ہے وہ ضیائے ارضی اور ضیائے کوکبی کے امتزاج سے تشکیل پانے والا جھٹپٹا ہے جو لاجوردی رنگ کی شکل میں ہمیں نظر آتا ہے۔[۹۸] لیکن سائنس کے مغربی رزمیہ میں اس توجیہ کا سہرا لیونارڈو ڈاونچی اور گوئٹے کے سر رکھ دیا گیا ہے۔ مغرب میں ابن الہیثم کی تحریریں جس کثرت سے شائع ہوتی رہی ہیں اس کے بعد اس بات کی کہاں گنجائش تھی کہ حجرۂ تاریک کے موجد کے سلسلہ میں کسی اور کا نام پیش کیا جاتا۔ لیکن مغربی تاریخ نگاری میں ایسے معجزوں کی بھی کمی نہیں جہاں لیوی کو حجرۂ تاریک کے موجد کے طور پر پیش کیا گیا ہے، بلکہ لیوی تو مغرب میں بڑے موجد کے طور پر متعارف ہیں اور کیوں نہ ہوں جب ابوالوفا البوزجانی اور الخجندی کی تشکیل کردہ مثلّثات کرویہ (Spherical Triangles) اور ابن سینا کی ایجاد کردہ عصائے یعقوب (Jacob's Staff) اور الاقلیدیسی کے کسر اعشاریہ کی دریافت کا سہرا انھوں نے اپنے سر باندھ

ابن الہیثم کی کتاب المناظر کا وہ لاطینی چربہ جسے ویٹلو نے ۱۲۷۰ء میں شائع کیا۔

رکھا ہوا[99] ایک عرصہ تک علم المثلثات (trigonometry) کو Cavalieri (۱۶۳۲ء)، Girard (۱۶۲۶ء) اور Viete (۱۶۰۳ء) کی دریافت سمجھا جاتا رہا بلکہ بعض علماء اس بات پر اختلاف کرتے رہے آیا علم المثلّثات (trigonometry) کو ایک علیحدہ شاخ کے طور پر Levi Ben Geison نے متعارف کرایا یا Regiomontanus نے۔ تا آنکہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اس کے اصل صانع نصیر الدین طوسی ہیں۔[100] ادریسی کے جغرافیائی نقشے جو یورپ کی مختلف زبانوں میں حسب ضرورت شائع ہوتے رہے اور جن پر مغرب کے جہاز رانوں کا صدیوں انحصار رہا اس کتاب کی تلخیص کا لاطینی ترجمہ جب ۱۵۷۹ء میں پیرس سے شائع ہوا تو اصل مصنف کے بجائے اس پر صرف a nubian geographer لکھا گیا[101] جس سے مصنف کی مسلم شناخت پر پردہ پڑا رہا اور اس طرح جغرافیہ اور خریطہ نویسی کی ایک عظیم علمی روایت سرقہ کا شکار ہو گئی۔

سرقہ سے ذرا کم لیکن اصل مصنف سے گریز کا رجحان ان مخازن علمی میں دیکھا جا سکتا ہے، جو مختلف عہد میں متداول رہی ہیں۔ مثال کے طور پر شاہ الفانسو دہم نے اپنی سرپرستی میں علم الفلکیات کی بہترین کتابیں بشمول ابن الہیثم کی **ھیئۃ العالم** ایک موسوعہ کی شکل میں شائع کیا۔ *Libros del Saber* کے نام سے یہ ترجمہ یورپ میں صدیوں متداول رہا۔ اسی طرح پوائر باخ (Peurbach) نے سیاروں سے متعلق ایک مجموعہ (*Theoricae Novae Planetarum*) کے نام سے مرتب کیا جو بنیادی طور پر ابن الہیثم، ثابت بن قرہ اور الزرقالی کی کتابوں کی تلخیصات پر مشتمل تھا۔ ریجیومونتانوس نے بطلیموس

کی کتاب کی تلخیص کے طور پر دراصل الزرقالی اور البتّانی کی تحریروں کو پیش کیا[۲۰] کوپرنکس، گلیلیو اور کیپلر کے عہد میں یہ کتاب متداول تھی مگر کسے پتہ تھا کہ جن کتابوں کو یونانی الاصل علوم کے طور پر پیش کیا جارہا تھا وہ دراصل مسلم علماء کی صدیوں کی کاوشوں کی ماحصل تھیں۔ بعد کے مغربی طلبا کے لیے بلکہ کسی حد تک مشرق میں بھی یہ پتہ چلانا کچھ آسان نہ رہا کہ جو کتابیں اپنے اصل مصنّفین کی حیثیت سے متداول ہیں ان کا تعلق اسلام یا مسلمانوں سے ہے کہ ان کے لاطینی نام مرورِ زمانہ سے نامانوسیت کا احساس دلاتے تھے۔ مثال کے طور پر ابن النفیس، انافس کے نام سے جانے جاتے تھے، ابوالقاسم زہراوی Abulcasis بن گئے تھے، ابن سینا کا نام Avicenna قرار پایا تھا۔ جابر بن افلح Jaber یا Gaber بن گئے تھے اور ابن الہیثم Alhazen قرار پائے تھے۔ خالد بن یزید Calid، یعقوب الکندی Alkindus، رازی Rhazes، الخوارزمی Algoritmi، ابن رشد Averroes، زرقالی Arzachel، غزالی Algazel، ابومعشر Albumasar، ابن طفیل Abubacer، البطروجی Alpetragius، الفرغانی Alfraganus بنادیے گئے تھے۔ لاطینی ناموں کے اس حجاب نے علوم کی مسلم شناخت پر ابہام کا پردہ ڈال دیا۔

یوروپ میں یونیورسٹی کی آمد

اکتشافی علوم یعنی علوم عربیہ (Studia Arabum) کی عمومی غلغلہ انگیزی نے مسلم تعلیمی اداروں کے سلسلے میں بھی ایک طرح کے شوق وتجسس کو جنم دیا۔ جان آف لندن جب یروشلم کی زیارت سے واپس آئے تو ۱۱۸۰ء میں انھوں نے غریب و نادار طلباء کے لیے یوروپ کا سب سے پہلا تعلیمی ادارہ College des Dix-Huit قائم کیا۔ اس سے پہلے عیسائی مغرب میں وقف تعلیمی اداروں کا کوئی تصور نہ تھا۔[۲۱] ابتداً مغرب میں جو تعلیمی ادارے قائم ہوئے وہ ان شہروں تک محدود تھے جن کی سرحدیں عالم اسلام سے ملتی تھیں۔ مثلاً سالرنو (Salerno)، نیپلس (Naples)، بولوگنا (Bologna)، مونٹ پیلیئر (Montpelier) اور پیرس (Paris) وغیرہ۔[۲۲] مغرب کو سب سے پہلے یونیورسٹی سے اس وقت سابقہ پیش آیا جب مسلم صقلیہ کے سقوط کے بعد سالرنو (Salerno) کا مشہور زمانہ طبی کالج ان کے ہاتھوں میں آ گیا[۲۳] یا پھر طلیطلہ کے سقوط کے بعد علمی سرگرمیوں کے ایک زندہ تابندہ شہر سے ان کا رابطہ ہوا جہاں مسلمانوں کے سیاسی انخلاء کے سبب عیسائی یورپ کے مختلف علاقوں سے علم کے شائقین جمع ہونے لگے۔ آگے چل کر طلیطلہ اور سالرنو کے ان ہی فارغین نے پیرس بولوگنا، مونٹ پیلیئر اور آکسفورڈ کی دانش گاہوں میں درس وارشاد کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ مثال کے طور پر گربرٹ (Pope Sylvester) جنھوں نے مغرب میں اکتشافی طرزِ فکر کو متعارف کرانے میں بڑا اہم رول انجام دیا، اولاً بارسلونا میں اور پھر مسلم قرطبہ اور اشبیلیہ میں مسلمان اساتذہ کے شاگرد رہ چکے تھے۔ روجر بیکن نے طلیطلہ میں اکتشافی علوم کے علاوہ عربی زبان کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ آرنلڈ آف ویلینیو (Arnold of Vilieneuve) اور ریمنڈ لل (Reymond Lull) بھی مسلم اندلس کے فارغین

Johannes Hevelius (1611-1687)

علومِ عرب کا شناور یوروپی فلکیاتی عالم

میں سے تھے جنھوں نے بعد میں Montpelier کی مسند ارشاد کو آباد کیا۔ Campanus of Novara جنھوں نے ویانا کی دانش گاہ کو آباد کیا وہ بھی قرطبہ کے فارغین میں سے تھے۔ کچھ یہی حال آکسفورڈ کے معروف استاد Daniel of Morley اور آکسفورڈ کے مشہور زمانہ چانسلر رابرٹ گروسیٹاسٹ کا ہے۔ یہ دونوں بھی اندلس کے فارغین میں سے تھے۔[۶]

علومِ عربیہ کے یہ فارغین جب اپنے اپنے علاقوں میں واپس آئے تو وہ اپنے ساتھ عربی طرز کی دانش گاہوں کا خواب بھی لائے۔ چرچ کے اکابرین جواب تک ترجمے کی تحریک کا ہراول دستہ بن چکے تھے، انھوں نے بھی کیتھڈرل اسکول سے الگ باقاعدہ دانش گاہوں کے قیام کی تائید کی۔ ۱۰۸۸ء میں بولوگنا میں پہلی باقاعدہ یوروپی یونیورسٹی قائم ہوگئی۔ ۱۱۵۰ء میں پیرس، ۱۱۶۷ء میں آکسفورڈ، ۱۱۷۳ء میں سالرنو، ۱۱۸۸ء میں ریگیو، ۱۲۰۹ء میں کیمبرج، ۱۲۱۸ء میں سلامنکا اور ۱۲۲۲ء میں پیڈوا میں یونیورسٹی کی ابتدائی شکل قائم ہوگئی۔ یہ دانش گاہیں چونکہ عرب دانش گاہوں کے طرز پر بنائی گئی تھیں اس لیے ان کے طرزِ تعلیم حتیٰ کہ ان کی عمارتوں پر بھی اپنے پیش رو عرب یونیورسٹیوں کی چھاپ موجود تھی۔[۷] جارج مقدیسی نے اس بات کے تفصیلی شواہد فراہم کیے ہیں کہ مغربی دانش گاہوں میں ماجسٹر، پروفیسر اور ڈاکٹر کی درجہ بندیاں اور ان وظائف کے لیے سند کا دیا جانا دراصل عہدِ وسطیٰ کے مروّجہ مسلم طرزِ تعلیم کے زیر اثر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹریٹ دراصل لاطینی لفظ Docere کا ترجمہ ہے جو مخفف ہے Licentia Docendi کا، جس کے معنی ہوتے ہیں تدریس کی سند جو کہ اپنی عربی الاصل اصطلاح اجازۃ التدریس کا حرف بہ حرف ترجمہ ہے۔ عام طور پر اہلِ عرب اجازۃ التدریس والافتاء کی مکمل اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ پہلے درجہ میں فقیہ، پھر مفتی اور بالآخر مدرس یعنی ڈاکٹر بن جانا مسلم نصاب کا جزو سمجھا جاتا تھا۔[۸] یونیورسٹی کا یہ روایتی مسلم نظام جو عہدِ وسطیٰ میں لاطینی ترجموں کے ذریعہ یوروپ کو منتقل ہوا، آج تک مغرب ہی کیا تمام اقوام عالم میں مروّج چلا آتا ہے۔ آج اس بات پر کسے یقین آئے گا کہ جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر استعمال ہونے والے گاؤن اور ہڈ (Academic Regalia) عہدِ وسطیٰ کے یوروپ میں مسلمانوں کی اتباع میں متعارف ہوئے حتیٰ کہ کالج کا لفظ بھی اپنے عربی لفظ کلیہ کی لاطینی شکل Collegiate کا مخفف ہے۔[۹]

یوروپ میں تہذیب وتکنالوجی کی آمد

عہدِ وسطیٰ کا عالم اسلام ایک غالب اور مرفہ الحال اکتشافی تہذیب کا علامیہ تھا۔ اہلِ مغرب کو یہ بات مبہوت کیے دیتی تھی کہ بغداد، قاہرہ اور قرطبہ کے عظیم الشان شہر رسل و رسائل کی سہولت، بازاروں کی کثرت اور خام و تیار شدہ مال کی بہتات کے سبب تجارتی سرگرمیوں اور علم و فن اور ایجاد واختراعات کی چہل پہل سے ہر لحہ معمور ہیں۔ اتنے بڑے پیمانے پر شہری زندگی کی سہولتیں، غذائی اجناس کی افراط اور علمی وتفریحی مشاغل کے لیے فارغ اوقات کا ہاتھ آجانا، آخر وہ کون سا میکینزم ہے جس نے اس جاہ وحشم کو کمالِ فن کاری کے ساتھ سنبھال رکھا ہے۔ اسپین اور صقلیہ میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر سولھویں صدی کے آخر تک مغرب کے مفکرین اور علماء مسلسل اس مہم میں لگے رہے کہ اہلِ اسلام کی علمی اور اکتشافی برتری کو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی ٹکنالوجی کو اپنے ملکوں میں کس طرح درآمد کیا جائے۔ الخوارزمی کی زیج جس کی بنیاد پر مختلف مقامی زیج کی تیاری کا کام جاری رہا اور جو بالآخر گرین وچ مین ٹائم (GMT) کے قیام پر منتج ہوا، تو محض ایک علامت ہے جس سے اخذ واکتساب کی تقریباً ہزار سالہ روایت کا پتہ چلتا ہے، ورنہ زندگی کے ہر میدان میں ان ہزار سالوں کے دوران یوروپی اقوام عالم اسلام کی اتباع اور کسی حد تک خلاقانہ تقلید میں مبتلا رہی ہیں۔ مثال کے طور پر غذائی مسئلہ کو لیجئے۔ عالم اسلام میں مرفہ الحالی کا ایک سبب پیداوار کی کثرت اور ضروریاتِ زندگی کی وافر فراہمی تھی جس کے پیچھے آب پاشی کی ترقی یافتہ ترکیبوں کا فنکارانہ استعمال تھا۔ بغداد اور اس کے اردگرد دجلہ وفرات سے مصنوعی نہروں کا ایک جال بچھا دیا گیا تھا۔[۱۱۰] مرو (خراسان) میں صرف آب پاشی کے نظام کو سنبھالے رکھنے کے لیے کوئی دس ہزار لوگ کام پر مامور رہتے۔[۱۱۱] دریائے صغد جو سمرقند و بخارا سے ہو کر گزرتی، اس کے دونوں طرف میل ہا میل پر پھیلی ہوئی لہلہاتی کھیتیاں زرخیزی اور شادابی کا دل فریب منظر پیش کرتیں۔ اب جو مسلمانوں نے اندلس میں اپنے قدم جمائے تو انھوں نے آبپاشی کی ان ہی ترکیبوں کو دریائے وادیٔ کبیر اور بلنسیہ کے علاقوں میں کمال فنکاری سے استعمال کیا۔[۱۱۲] ابتدائی مراحل میں آبپاشی کی جو تکنالوجی مسلمانوں کے ذریعہ مغرب کو منتقل ہوئی ان میں سقیا اور نوریا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سقیا ایک طرح کی مشین تھی جس میں جانوروں کی دائروی گردش سے زیرزمین پانی کو آبپاشی کے لیے استعمال کیا جاتا۔ اس تکنیک کی ابتداء تو قدیم مصر میں ہوئی تھی، البتہ عہدِ وسطیٰ کے عالم اسلام میں اسے مزید ترقی اور مقبولیت ملی۔ مسلمانوں کے ذریعہ یہ طریقہ اسپین میں عام ہوا اور پھر یوروپ کے دوسرے ملکوں تک جا پہنچا۔[۱۱۳] سقیا کے استعمال سے اگر زیرزمین پانی سے آبپاشی آسان ہو گئی تھی تو وہیں نوریا ایک ایسی حیرت انگیز ایجاد تھی جو ہوا کے بہاؤ اور ندی کی لہروں سے توانائی حاصل کرتی اور جس کے ذریعہ خود بخود ندی کا پانی اونچی زمینوں تک پہنچتا رہتا۔ لکڑی کی دیو قامت چرخیاں ندیوں میں اس طرح ایستادہ کردی
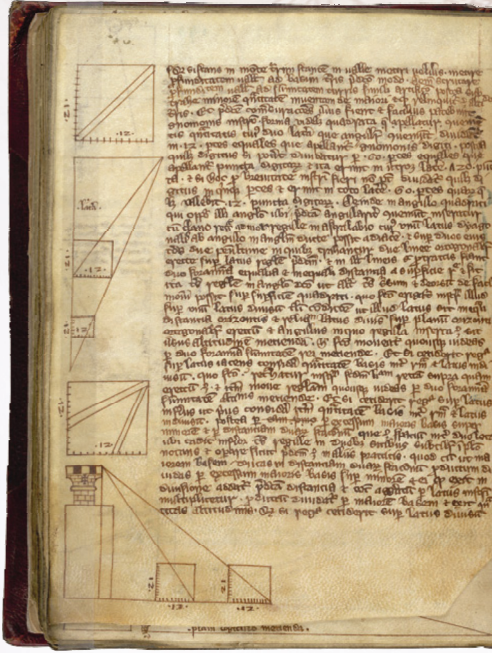
جاتیں کہ وہ پانی کی لہروں سے متحرک بھی رہتیں اور ان سے متصل کھانچوں میں پانی جمع ہو کر اوپر پہنچتا رہتا۔ یہ ایک طرح کی خود کار مشین تھی جس میں نہ کوئی ایندھن خرچ ہوتا اور نہ ہی کسی نگرانی کی ضرورت باقی رہتی۔[١١٤] طلیطلہ اور اسپین کے دوسرے شہروں میں مسلمانوں نے اس ٹکنالوجی کو متعارف کرایا۔

عہد وسطیٰ کے اس ماحول کو متصور کیجئے جہاں عربی کتابوں کے لاطینی ترجموں کے لیے غیر معمولی جوش و خروش پایا جاتا ہو، جہاں مسلمان اور عیسائی باہم برسرِ پیکار بھی ہوں اور تجارتی رشتوں میں منسلک بھی، جہاں عسکری فتح و شکست پر دھوپ چھاؤں کا سماں ہو۔ فتح (conquest) اور فتح در فتح (reconquest) کے اس ماحول میں پر رونق شہر اور متحرک کارخانے دشمن کے قبضے میں چلے جاتے ہوں اور دشمن اس بات کا اہتمام بھی کرتا ہو کہ مسلمان اہل فن اور کاریگر اپنی تمام سرگرمیوں کے ساتھ اسی شہر میں موجود رہیں، ایک ایسی فضا میں ٹکنالوجی کی منتقلی کا معاملہ سماجی لین دین کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔[١١٥]

جب یوروپ کی درسگاہوں میں علومِ عربیہ کے لاطینی ترجمے داخل نصاب تھے۔
علم المثلثات کا ایک صفحہ

عام طور پر لوگوں کی توجہ اس طرف کم ہی جاتی ہے کہ ''علوم عربیہ'' کے لاطینی ترجموں کے علاوہ اصل عربی تصانیف بھی مغربی دانشوروں کی توجہ کا مرکز رہی ہیں۔ عہد وسطیٰ کے مغرب میں اہل علم کا جلالت و دبدبہ عربی زبان کے حوالے سے قائم ہوتا۔[١١٦] اسپین اور صقلیہ تو خیر سے عرب تہذیب کے مراکز تھے، مغربی یورپ کے دوسرے علاقوں مثلاً اٹلی اور فرانس کی عیسائی دانش گاہوں میں عربی زبان کی تعلیم کا باقاعدہ رواج تھا، حتیٰ کہ ١٦١٩ء تک آکسفورڈ میں جیومیٹری اور فلکیات کے اساتذہ کے تقرر کے لیے عربی زبان سے واقفیت لازم سمجھی جاتی تھی۔[١١٧] لہٰذا اکتشافی علوم کے عربی مخطوطات جن کی موجودگی سے آج بھی کوئی قابل ذکر یوروپی لائبریری خالی نہیں، اہل مغرب کے راست اکتساب کی زد میں تھیں۔ جارج صلیبہ نے کوپرنکس کے ابن شاطر سے راست اکتساب کے سلسلے میں جو شواہد فراہم کیے ہیں[١١٨] اس سے بھی یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے مغرب میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو عربی کتابوں سے راست اکتساب کی اہلیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سترہویں صدی تک مغرب کے شائقین اکتشافی علوم کی تلاش میں عالم اسلام کے چکر لگاتے رہتے اور وطن واپسی

پر عربی مخطوطات کا وقیع ذخیرہ اپنے ساتھ لاتے۔ مشرقی اور مغربی مصادر میں ایسے علم جُو سیاحوں کے جابجا تذکرے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر فرانسیسی عالم Guillaume Postel (متوفی ۱۵۸۱ء) کو لیجیے جو عربی زبان سے اپنی گہری واقفیت کے لیے معروف ہیں، انھوں نے غالباً شاہ فرانس کی ایماء پر استنبول، فلسطین اور شام کے علاقوں کا سفر کیا تھا۔ کئی سالوں کی جدوجہد کے بعد وہ ایک بڑا قیمتی ذخیرہ لے کر فرانس واپس آئے۔ اسی طرح Jacob Golius (متوفی ۱۶۶۷ء) جو بعد میں لائیڈن یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کے پروفیسر ہوئے، ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب وہ عالم اسلام کے سفر سے واپس آئے تو انھوں نے عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں اکتشافی علوم کی کوئی تین سو کتابیں دبا رکھی تھیں۔ ایک غالب تہذیب کے مرکز کی حیثیت سے ان صدیوں میں عالم اسلام کی حیثیت مغربی شائقین کے لیے ایک انبساط انگیز مسکن و مامن کی بھی تھی۔ بعض لوگ علم کی تلاش میں مسلم علاقوں میں اپنی عمر کا بڑا حصہ گزار دیتے۔ مثال کے طور پر (۱۲۲۸ء) *Liber Abaci* کے مصنف لیونارڈو فیبوناسی (Leonardo Fibonacci) کو لیجیے جنھوں نے اپنی طالب علمانہ زندگی الجزائر، شام اور مصر میں گزاری اور وطن واپسی پر مغرب کو ریاضی، جیومیٹری اور علم الہندسہ سے متعارف کرایا۔ ایک دوسرے اطالوی عالم Patriarch Nimeh جو دیارِ بکر میں اپنے طویل قیام کے بعد ۱۵۷۷ء میں اپنے وطن فلورنس (اٹلی) کو لوٹے تو ان کا پورا کتب خانہ بھی ان کے ساتھ آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی جلالت علمی اور ایک قیمتی لائبریری کی منتقلی کے سبب Pope Gregory XIII نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اگر ان کتابوں سے راست اکتساب کرنے والے اہل علم یورپ میں موجود نہ ہوتے اور اگر عربی زبان مغربی اہل علم کے لیے مانوس نہ ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اتنے بڑے پیمانے پر کوئی سات سو سالوں تک عربی کتابوں کی حصولیابی کا سلسلہ جاری رہتا۔ بہت سی کتابیں اگر راست ترجموں کی فہرست میں جگہ نہ پا سکیں تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کتابوں سے اخذ و اکتساب کے بعد لاطینی میں طبع زاد کتابوں کی تصنیف کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ مثال کے طور پر جابر بن حیان کی خواص الکبیر، نجم الدین رماح (متوفی ۱۲۹۵ء) کی الفروسیہ والمناصب الحربیہ یا کسی مجہول مصنف کی کتاب المخزون لارباب الفنون کے اثرات *Liber Ignium* پر صاف محسوس ہوتے ہیں۔ عربی کتابوں سے راست اخذ و اکتساب کی یہ روایت صدیوں جاری رہی، حتیٰ کہ سولہویں صدی کے آخری ایام میں جب یورپ میں طبع زاد کتابوں کی روایت مستحکم ہونے لگی جب بھی یہ کتابیں مسلمانوں کی اکتشافی کتابوں کے اثرات سے آزاد نہ ہو سکیں۔ اس سلسلے کی ایک دلچسپ مثال Agostino Remelli کی مشینوں سے متعلق کتاب ہے جو ۱۵۸۸ء میں شائع ہوئی اور جس پر تقی الدین کی کتاب الکواکب الدریۃ فی البنکمات الدوریۃ مطبوعہ ۱۵۵۶ء کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

کاغذ اور پرنٹنگ پریس کی صنعت بھی اہل مغرب کو اسلامی اندلس کے راستے پہنچی۔ کہا جاتا ہے کہ اسلامی اسپین کے شہر Játiva میں کاغذ سازی کی پہلی فیکٹری ۱۱۵۰ء میں لگائی گئی۔ جلد ہی ۱۱۵۷ء میں فرانس اور ۱۲۷۶ء میں اٹلی میں کاغذ

سازی کی فیکٹریاں قائم ہوگئیں۔ اس سے پہلے مغرب محدود پیمانے پر بغداد اور دمشق سے کاغذ برآمد کیا کرتا تھا۔ دمشق کا کاغذ یورپ میں Charta Damascene اور بغداد کا کاغذ Bagdatixon کے نام سے معروف تھا۔[۱۱۹] مورخین نے اس بات کا صراحت سے تذکرہ کیا ہے کہ Játiva کے سقوط کے بعد کاغذ کی فیکٹری اپنی جاری حالت میں نئے عیسائی فاتحین کے قبضہ میں آ گئی جہاں سے اٹلی اور دوسرے یوروپی شہروں میں اس ٹکنالوجی کی منتقلی ہوسکی۔

تقی الدین کی میکانیکی گھڑی کا ڈائیگرام

مغرب کے بعض مصنّفین اب بھی اس دانستہ خام خیالی کے شکار ہیں گھڑی کی ایجاد خاص ان کی تہذیب کی پیداوار ہے۔ اس خیال کے مطابق دنیا میں پہلی گھڑی ۱۳۰۹ء میں ملان میں واقع St. Eustorgio کے چرچ ٹاور پر آویزاں کی گئی، البتہ وہ یہ بتانے سے گریزاں ہیں کہ اس کا موجد کون تھا۔[۱۲۰] گھڑی کی صنعت بھی اہل مغرب کو براہ اسپین منتقل ہوئی۔[۱۲۱]

کہا جاتا ہے کہ طلیطلہ میں دریائے تاجہ کے کنارے ۱۰۵۰ء میں الزرقالی نے ایک بہت بڑی آبی گھڑی نصب کی تھی جو سقوطِ طلیطلہ کے بعد بھی وقت نمائی کا فریضہ انجام دیتی رہی۔ تب اسے طلیطلہ کے عجائبات میں شمار کیا جاتا۔ بنوموسیٰ کی کتاب الحیل جو خودکار مشینوں سے متعلق ہے اور الجزری کی کتاب کے اسپینی ترجموں نے مختلف قسم کی ٹکنالوجی کو متعارف کرانے میں اہم رول انجام دیا۔[۱۲۲] بلکہ سچ پوچھئے تو اٹھارویں صدی تک مغرب میں گھڑی کی صنعت پوری طرح جزری کے زیر اثر رہی۔ آگے چل کر جب گھڑیاں گیئر کی تابع ہوگئیں اور میکانکی گھڑیوں کا رواج عام ہوگیا جب بھی مشرق کی ٹکنالوجی سے اس کا سلسلہ منقطع نہ ہوسکا جہاں گیئر کا استعمال سقیا اور نوریا کی آبپاشی کے علاوہ فلکیاتی آلوں میں عام تھا۔

پانی کا بہاؤ خواہ وہ دریا میں فطری روانی کے سبب ہو یا ڈیم کے ذریعہ اسے مزید مؤثر بنانے کی کوشش ہو، عالمِ اسلام میں اس کے استعمال کی روایت آٹھویں صدی میں ہی مستحکم ہوگئی تھی۔ دجلہ اور فرات پر ایسی پن چکیاں نصب تھیں جو شہر کی

وسیع آبادی کے لیے آٹے کی فراہمی کی کفایت کرتیں۔ جابر بن حیان نے **کتاب السبعین** میں ایسی بہت سی ترکیبوں کا ذکر کیا ہے جو آبی توانائی (tidal power) کے استعمال سے متعلق ہیں۔[۱۲۳] بارہویں صدی میں قرطبہ میں مسلمانوں کے ذریعہ پن چکیوں کا استعمال عام ہوا، جیسا کہ الادریسی کے تذکرے سے اندازہ ہوتا ہے۔

علم کیمیا سے مغرب کی پہلی باقاعدہ واقفیت انگریز مصنف Robert of Chester کے لاطینی ترجمہ (۱۱۴۴ء) *Liber de compositione alchimiae* کے ذریعہ ہوئی۔ اس سے پہلے مغرب اس علم سے ناآشنا تھا جیسا کہ Robert نے اپنے قارئین کو مخاطب کرتے ہوئے ابتدائیہ میں لکھا ہے: ''کیمیا کیا ہے اور یہ کن تعاملات کا نام ہے، اس سے تمہاری لاطینی دنیا اب تک واقف نہیں۔ اس کتاب میں میں اس امر کی عقدہ کشائی کروں گا۔''[۱۲۴]

چودہویں صدی کے وسط میں عیسائی اسپین کو مسلمانوں کی طرف سے ایک غیر معمولی تحفہ مل گیا جس نے آنے والی صدیوں میں عالم اسلام اور عیسائی دنیا کے مابین قوت کے میزانیہ میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کردی۔ بارود یا نفط کی ٹکنالوجی کی منتقلی کے مضمرات کا اس وقت اندازہ نہیں کیا جاسکا، البتہ آنے والی صدیوں میں اسی ٹکنالوجی کو مزید ترقی دے کر جب سفید فام عیسائی عالم اسلام کی تسخیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے تو یقینا بہت دیر ہو چکی تھی۔

تب سے اب تک مسلمان مورخین اور تجزیہ نگاروں کی توجہ اس نکتہ کی طرف کم ہی گئی ہے کہ عالم اسلام کی جاہ و حشمت اور اس کے تفوق میں علمی، فکری اور معاشی برتری کے علاوہ ایک اہم سبب عسکری ٹکنالوجی کی برتری بھی تھی۔ تاریخ کے فیصلہ کن مرحلوں میں جب بحیثیت مجموعی امت کا چراغ گل ہوا چاہتا تھا، جب سقوط بغداد کے بعد منگولوں کی پیش قدمی بلادِ شام کی طرف جاری تھی عین ان لمحات میں عین جالوت کے مقام پر بارود کے فنکارانہ استعمال نے منگولوں کو پسپا ہونے پر مجبور کیا تھا۔ میزائل اور توپ کے دہانے سے جب ہر طرف آتشیں شعلے اگلنے لگے تو منگولوں کے گھوڑے بدک گئے۔ پیادہ فوجیں اس آتشیں حملوں کے سبب پسپا ہونے پر مجبور ہو گئیں۔[۱۲۵] کچھ اسی قسم کی صورت حال ساتویں صلیبی جنگ کے موقع پر پیش آئی جس کی کمان خود لوئس نہم کر رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۲۴۹ء میں لوئس نہم نے مصر کے شہر دمیاط پر اپنا قبضہ مکمل کرلیا تھا۔ اگلے سال ۱۲۵۰ء میں انھوں نے المنصورہ پر حملہ کیا۔ یہاں مسلمانوں نے مختلف مورچوں پر بارود کے آتشیں دہانے تیار کر رکھے تھے۔[۱۲۶] لوئس اور ان کی فوج اس صورت حال سے اتنے حواس باختہ ہوئے کہ مسلمانوں نے بڑی آسانی سے لوئس نہم کو گرفتار کرلیا۔ اس شکست کے بعد نفسیاتی طور پر صلیبی معاندین کی کمر ٹوٹ گئی۔ گویا تاریخ کے دو نازک لمحات میں مسلمانوں کی تکنیکی عسکری برتری ان کے مستقبل کے تحفظ کا سبب بن گئی۔ یہ تو صرف دو واقعات تھے جن کی تفصیلات عسکری کتابچوں کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے ورنہ مقبول عام تاریخ نگاری عام طور پر ان حساس تکنیکی باریکیوں کا تذکرہ نہیں کرتی۔

جب سے مغرب ایک غالب تہذیب کے طور پر ہمارے سامنے آیا ہے اور جب سے مغربی رزمیہ کو عالمی تاریخ کے

چودھویں صدی کے لاطینی یوروپ میں مسلم تہذیب کے زیر اثر جبہ اور عماموں پر مشتمل کلاس روم کا ایک منظر

طور پر دیکھے جانے کا رواج عام ہوا ہے، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مغربی اقوام نے بارود اور بھاپ کے انجن کی ایجاد کے ذریعہ خود کو پہلے تو امیرالبحر کے منصب پر فائز کیا اور پھر پوری دنیا کی تسخیر پر چل نکلے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ چودھویں صدی تک مغرب میں بارود کے استعمال کا کوئی رواج نہ تھا۔ بشیر آغا کے ایک عسکری مخطوطہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ صلیبی حملہ آوروں کی فیصلہ کن شکست کا ایک اہم سبب بارود کا استعمال تھا۔ اس وقت تک فرنگی (Franks) اس فن سے ناآشنا تھے۔[۱۲۷] حتیٰ کہ پندرہویں صدی کے نصف اوّل میں ایک فرانسیسی سیاح Bertrandon de la Brocquiere جب دمشق پہنچا ہے تو اسے اس بات پر بڑا استعجاب ہوا کہ کاروانِ حج کے استقبال میں لوگ آتشیں گولے داغ رہے ہیں۔[۱۲۸] گو کہ بارود کی ایجاد کا سہرا چینیوں کے سر ہے، جیسا کہ نئے مغربی محققین اب اعتراف کرنے لگے ہیں، البتہ ان میں سے بہتوں کے لیے اب بھی یہ بات قابل قبول نہیں کہ مسلمانوں نے اس کے متوازن فارمولوں کو ترقی دی اور بالآخر براہ اسپین یہ ٹکنالوجی مغرب کو منتقل ہوئی۔[۱۲۹] ابتدائی ایام میں غرناطہ کے بعض مسلم ماہرین عیسائی مملکتوں میں اس فن کی تربیت دیتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ۴۲-۱۳۴۰ء میں الجزیرہ کے محاصرہ کے دوران مسلمانوں نے بارود کا

کثرت سے استعمال کیا جس سے دشمن کا نقصان تو بہت ہوا، لیکن انھیں اس طریقۂ جنگ کی تحقیق کا شوق بھی پیدا ہوا۔ بعض تاریخ نگاروں کے مطابق[۱۳۰] اس جنگ میں انگلستان کے Earl of Derby اور Earl of Salisbury بھی حصہ لے رہے تھے۔ ان دو حضرات نے بارود کی ٹکنالوجی سے اہل انگلستان کو متنبہ اور متعارف کرایا۔ ہمارے خیال میں امرائے انگلستان کے لیے محض جنگی مشاہدے یا پس اندوختہ بارود کے تجزیہ کی بنیاد پر آتشیں اسلحہ کی تیاری تو شاید ممکن نہ رہی ہو اور غالباً اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ جب عیسائی اسپین میں اس فن کے مسلم ماہرین موجود ہوں اور عربی کتابوں اور مسلمانوں کے اکتشافی علوم کے حصول کی خاطر یورپ کے مختلف علاقوں سے طلباء و شائقین کی اسپین میں آمد کا سلسلہ جاری ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ راست اکتساب کا راستہ چھوڑ کر ٹکنالوجی کی چوری کا راستہ اختیار کیا جائے۔[۱۳۱]

مسلم اندلس: ماحولیاتی آلودگی سے مبرا، دریا کی لہروں سے چلنے والی خودکار آبی مشین نوریہ، جس کی ایجاد و اشاعت نے عالمِ اسلام میں زراعتی انقلاب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

نشاۃ ثانیہ: ایک نئے اسطورہ کی تشکیل

عالم اسلام سے صدیوں کے تعامل اور علم و حرفت کے پے بہ پے منتقلی کے سبب یورپ کی اس قدر تقلیبِ ماہیت ہوگئی کہ پندرہویں صدی کے جاتے جاتے اہل یورپ ایک نئے اعتماد سے سرشار نظر آنے لگے۔ انھیں ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ تاریخ کے ایک طرب انگیز لمحہ میں جی رہے ہوں، جہاں ان کے چہار طرف انبساط انگیز سرگرمیوں کا ظہور ہو۔ آگے چل کر مغربی تاریخ نویسوں نے مغرب کی اس خوداعتمادی کو جو دراصل مشرق سے اخذ و اکتساب کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی نشاۃ ثانیہ کا نام دے ڈالا۔ اس نئے اسطورہ کی تشکیل نے تاریخ کے مغربی رزمیہ کو اعتبار بخشنے میں کلیدی رول انجام دیا۔ ذرا غور کیجیے صقلیہ اور طلیطلہ سے جب اکتشافی علوم کی کرنیں اندرونِ یورپ میں پہنچ رہی تھیں اس وقت تہذیبی طور پر مغرب کا کوئی وجود نہ تھا کہ تب یورپ کی تہذیبی شناخت ہویدا نہ ہوئی تھی۔ تب خطہ یورپ مختلف چھوٹے بڑے امراء اور متضاد و متحارب غیر منظم اور پسماندہ ریاستوں کا منتشر مجموعہ تھا۔ تب نہ تو صلیبی جنگوں کا کوئی تصور پایا جاتا تھا اور نہ ہی کسی نظری عیسائی

ملک شام میں نوریہ کی مبارک باقیات

ریاست کرسٹینڈم (Christendom) کے خدوخال واضح ہوئے تھے۔ شارلیمان کے ہاتھوں پہلی بار یورپ کے اتحاد اور اس کے نظری خدوخال کی تشکیل کی کوشش بنیادی طور پر خلافت اسلامیہ کے بالمقابل ایک متحدہ عیسائی شناخت کی تلاش سے عبارت تھی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یورپ یا مغرب کا تہذیبی تصور یا عالم عیسائیت کی نظری وحدت کا خیال بھی دراصل عالم اسلام سے تعامل اور مسابقت کا پیدا کردہ ہے۔ شارلیمان جس نے مغرب کی بنا میں کلیدی رول انجام دیا بذاتِ خود تو علم وفن سے ناآشنا تھا البتہ قدرت نے اسے غیر معمولی تنظیمی صلاحیت اور عسکری عزائم سے نوازا تھا۔ مغرب کی شیرازہ بندی کے لیے وہ علوم عرب سے استفادہ کو لازم خیال کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے عہد میں گربرٹ نے، جو آگے چل کر پوپ سلویس ثانی کے نام سے معروف ہوئے، جب ۹۰۸ء میں علوم ریاضی پر اپنا چار صفحاتی مقالہ شائع کیا تو عالم عیسائیت میں کچھ وہی غلغلہ انگیز کیفیت پیدا ہوگئی جو بقول ڈیوڈ لیوس ۱۹۰۹ء میں آئن اسٹائن کے چار طبیعاتی مقالوں کی اشاعت پر ہوئی تھی۔[۳۲] گربرٹ نے عربی- ہندی ہندسوں اور صفر کے استعمال سے جمع تفریق اور ضرب تقسیم کے بنیادی مسائل کو اہل مغرب کے لیے ہمیشہ کے لیے فیصل کر دیا۔ بڑے عددوں کی جمع وتفریق یا ضرب و تقسیم اب ان ہندسوں اور صفر کے استعمال سے اتنی آسان ہوگئی جسے رومن نمبروں میں متصور کرنا بھی مشکل تھا۔ گربرٹ کے اس غیر عیسائی شوق اور عرب ریاضی میں اس کی دلچسپی کے باعث روایتی عیسائی حلقوں میں اسے تشویش کی نظر سے دیکھا جاتا۔ ۹۹۹ء میں جب وہ پوپ کے عہدے پر فائز ہوا ہے تو بعض لوگ اس کی ریاضی میں دلچسپی کے سبب اس سے اس حد تک شاکی تھے گویا وہ کوئی دجال (Anti-Christ) ہو جو عیسائیت کی ہزار سالہ تاریخ کے آخری سرے پر کسی خدائی اسکیم کے تحت پوپ کے عہدے پر متمکن کیا گیا ہو یا پھر قرب قیامت کی نشانی ہو اور یہ کہ دنیا کا خاتمہ ہزارے کی تکمیل پر اپنے انجام کو پہنچنے والا

ہو۔لیکن کسے پتہ تھا کہ علوم عرب کا شاگرد گربرٹ دراصل مغرب کے خاتمے کا نہیں بلکہ اس کے احیاء کا داعی اور نقیب تھا۔ ابھی ڈیڑھ دو صدیاں بھی نہ گزری تھیں کہ علومِ عرب کے تراجم کی وہ گرم بازاری ہوئی کہ بارہویں صدی کا یورپ اکتشافی علوم کی درس گاہ میں تبدیل ہو گیا۔[۱۳۳] اور پندرہویں صدی کے خاتمے تک یورپ کو اپنی نئی شناخت کے اظہار کے لیے نشاۃ ثانیہ کا اسطورہ تخلیق کرنا پڑا۔

نشاۃ ثانیہ، تحریک اصلاحِ مذہب (Reformation) یا یورپ کا مفروضہ عہدِ تجلی (Enlightenment) یہ تمام اصطلاحیں تاریخ کی نہیں بلکہ تاریخ نگاری کی پیدا کردہ ہیں۔ یہ بنیادی طور پر ایک ایسے مغربی رزمیہ کے تشکیل کی کوشش ہے جو ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ انسانی تاریخ کے منتہیٰ و معراج کے ایام مغرب کے زیر قیادت ظہور پذیر ہوئے ہیں، حالانکہ ان تصورات کا معمولی تنقید و تجزیہ بھی ان کے طلسم سے پردہ اٹھانے کے لیے کافی ہے۔ اوّل تو یہ دعویٰ ہی باطل ہے کہ چودہویں صدی سے سولہویں صدی تک کے اٹلی میں مغرب کی ہمہ جہت نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوا۔ نشاۃ ثانیہ کے لیے تو یہ لازم ہے کہ وہاں تہذیب کا وہ قالب اپنی خوابیدہ شکل میں پہلے سے پایا جاتا ہو۔ اٹلی میں آخر وہ کون سی خوابیدہ مغربی تہذیب تھی جس کے احیاء کا سامان ہوتا۔ ایک تجارتی مرکز کی حیثیت سے اٹلی مسلسل عالم اسلام کی زد میں تھا۔ صقلیہ، وینیس اور بلرم (Palermo) کے علاقے مسلمان تاجروں اور اکتشافی علماء کی چلت پھرت سے مانوس تھے۔ اندرونِ یورپ تجارتی مال کی سپلائی کے لیے وینیس کی بندرگاہ کو رفتہ رفتہ قسطنطنیہ پر سبقت حاصل ہو گئی تھی۔ سو اس میں شبہ نہیں کہ یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں اٹلی کے تہذیب و تمدن پر مسلمانوں کے اثرات خاصے نمایاں تھے۔ بود و باش، رہن سہن، تہذیب و معاشرت حتیٰ کہ عورتوں کے ملبوسات بھی عربوں کا تقلیدی رنگ لیے ہوئے تھے۔ مسلم فیشن کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شرفاء کی عورتیں جب بازاروں میں نکلتیں تو مسلمان عورتوں کی طرح جلباب کا اہتمام کرتیں۔ عمارتوں کی نقاشی اور پردوں کی مرصع کاری میں خطاطی سے ملتا جلتا کچھ ایسا نقش و نگار بنایا جاتا جس پر عربی سے نابلد لوگوں کو اسلامی خطاطی کا گمان ہوتا۔[۱۳۴] اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں اندلس کی طرح اٹلی میں بھی عرب فیشن کا کچھ زیادہ بول بالا تھا۔ لیکن یہاں اور کچھ نہ تھا جس کے احیاء کی باقاعدہ کوشش کی جاتی۔ Petrarca نے جب عربی علوم اور ادبیات کے بالمقابل اہل یونان کے کتب قدیمہ کی طرف توجہ دلائی تو یہ بات اس وقت مغربی ذہن میں کوئی ارتعاش پیدا نہ کر سکی۔ Francesco Petrarca جنھیں آگے چل کر مغربی ادب کے Petrarc یعنی باوا آدم کی حیثیت حاصل ہو گئی، نے اپنے آپ کو انیس ثانی (Ennius II) کی حیثیت سے پیش کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ انھوں نے ایک طویل عرصہ کے بعد شاعری کی دیویوں کو دوبارہ اٹلی کی طرف مراجعت کی دعوت دی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیٹرارک نے ایک دن کیپیٹلائن ہل (Capitoline hill) پر ایک تقریب کا اہتمام کیا جہاں سے وہ شاعری کا تمغۂ افتخار لگائے کچھ اس انداز سے لوٹے جیسے انھوں نے بارہ سو سال پرانی شعری روایت کا احیاء کر دیا ہو۔[۱۳۵] لیکن تب پٹرارک کی اس حرکت پر کوئی عوامی غلغلہ کی کیفیت

كتاب المخزون لارباب الفنون في الفروسية ولعب الرمح ونودها

بسم الله الرحمن الرحيم وصلى الله على سيدنا محمد وآله

الباب الاول من المناصب الحربية وهو بين القربوصين اذا قابلك الفارس
قابله وجاوله وخاطبه وجول ولا نزق وخارجه ولا تهجم عليه وان
هجم عليك فلا تحقق منه واهمز جوادك عليه وجاوله وخاطبه وجول
يمين وشمال وان رمي لك رأس الرمح بين القربوصين اراد ان يدور عليك
ويرميك الى ديم الارض فما يكون جوابك له ان كان الرمح الذي ارمى لك من قدام
فاطلب يمين مع كفل فرسه فان بطلت ارمي رمحك في قربوص خصمك ورد
عليه فان هو لم يعرف يبطلك والا يقع على الارض سريعا وان دار معك
وطلب كفل فرسك فخذ رمحك اليك واخرج واطلب رأس الميدان وانظر
الاقران الباب الثاني من المناصب الحربية رماية الفارس من طوق الجوشن
اذا اردت ان ترمي خصمك من طوق الجوشن اعبر في الجولان وجاوله وخاطبه
وطابقه ولازقه وخارجه واوهمه بالطعن الكذاب من اسفل فان احس
من اسفل فخذ رمحك اليك سريعا وارمي برأس رمحك في الطوق والى كفل
فرسه اسرع ما يكون فانه يقع على الارض سريعا تحول عليه واخرج بتبطيل
يمين وشمال وقف في رأس الميدان وانظر الاقران والسلام الباب
الثالث من المناصب الحربية في رمي الفارس من زرار الجوشن قال الاستاذ
ناصر الدين الرماح في علم الفروسية اذا اردت ذلك فاعبر مع خصمك
في الجولان والملاصقة والمضايقة والملفارقة والدخول في الطعن
الحجازي واوهمه به كذاب واضرب بالعقب ابهام وخذ رمحك قدام
واصرف شمال واطلب وشمال واطلب الطعن في الصدر بين الازرار

کتاب المخزون لارباب الفنون کا پہلا صفحہ

دیکھنے میں نہ آئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ جا کی طرح ان کی یہ حرکت پانی کا مٹکا پھوڑنے کی مثل بن گئی اور پورا گاؤں اس بات سے واقف ہوگیا کہ اس خرابے کا جا Petrarc کی شکل میں ان کے درمیان موجود ہے۔

مغربی رزمیہ نگار ابھی تک قطعیت کے ساتھ یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ نشاۃ ثانیہ کا ظہور کب اور کہاں واقع ہوا۔ اہل فرانس اسے خالصتاً ایک فرانسیسی عمل سمجھتے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کے ہاں بالآخر فرانسیسی انقلاب ظہور پذیر ہوا۔ جس شخص نے پہلی بار نشاۃ ثانیہ (renaissance) کی اصطلاح استعمال کی وہ فرانسیسی تاریخ نگار میشلے ہے، اس نے اپنی مشہور زمانہ تالیف انقلابِ فرانس کی ساتویں جلد کو *La Renaissance* کا عنوان دیا۔ میشلے کی یہ تصنیف جو پہلی بار ۱۸۵۵ء میں شائع ہوئی نشاۃ ثانیہ کو کائنات اور انسان کی دریافت سے تعبیر کرتی ہے، جس کے مؤسسین میں کولمبس، کوپرنکس اور گلیلیو کے ساتھ ساتھ Rabelais، Montaigne اور شیکسپیئر بھی شریک کار بتائے گئے ہیں۔[۳۶] میشلے کا نشاۃ ثانیہ عقل کے تفوق، سچائی پر اصرار اور آرٹ اور حسن کے آمیزے سے تشکیل پاتا ہے جسے وہ چودھویں یا پندرہویں صدی کی نہیں بلکہ سولہویں صدی کے فرانس کے مخصوص ماحول کی پیداوار بتاتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے اسطورے کا دوسرا موجد Burcthardt ہے جس نے *The civilization of Reneissance in Italy* مطبوعہ ۱۸۶۰ء میں اس خیال کی آبیاری کی کہ چودھویں اور پندرہویں صدی کے اٹلی میں ایک نئی یوروپی حسیت کی تشکیل ہوئی، مغربی انسان نے پہلی بار اپنی انفرادیت کو دریافت کیا اور اس طرح مغرب کی سرزمین پر ایک نئے انسان (Renaissance Man) کا ظہور عمل میں آیا۔[۳۷] انیسویں صدی کے وسط میں جب نشاۃ ثانیہ کے متحارب اسطورے تشکیل پارہے تھے یہ وقت مغربی استعمار کے عروج کا تھا، سو اس بنیادی سوال کا جواب فراہم کیے بغیر کہ نشاۃ

ثانیہ کب اور کہاں پیش آیا، مجموعی طور پر مغرب کی نشاۃ ثانیہ کی گونج ہماری مقبول عام تاریخ نگاری کا حصہ بن گئی۔ پھر کسی کو اس بات کا خیال بھی کم ہی آیا کہ وہ اس اسطورہ کو تاریخی حقائق کی بنیاد پر چیلنج کرتا۔

خودکار گھڑی کی تکنیک (الجزری ۱۲ ویں صدی)

واقعہ یہ ہے کہ مغربی نشاۃ ثانیہ کو خواہ Michelet کی طرح کائنات کی تسخیر اور انسان کی خودشناسی سے تعبیر کیا جائے یا برخاردت کی طرح اسے فردشناسی اور Renaissance Man کا مرہونِ منت بتایا جائے، ان سب کے پس منظر میں کولمبس کا وہ بحری سفر کہیں نہ کہیں موجود ہے جس سے جدید مغرب کی ابتدا کا فسانہ تراشا گیا ہے۔ عام طور پر مغربی رزمیہ میں کولمبس ایک ایسے مہم جو شخص کی حیثیت سے سامنے آتا ہے جس کے بحری سفر نے مغرب کو نئے امکانات سے متعارف کرایا ہو۔ حالانکہ دنیا کی دریافت کا شوق جس سے کولمبس کی داستان مملو بتائی گئی ہے حقیقت سے کچھ بھی علاقہ نہیں رکھتی۔ اگر سپاٹ تاریخی حقائق کو درآنے کا موقع دیا جائے تو کولمبس کے سفر سے داستانِ شوق کا رومانی طلسم غائب ہوجاتا ہے۔ آخر اس حقیقت کو کیسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے کہ کولمبس کے سرپرست اور اس کے مالی معاونین کوئی اور نہیں عیسائی اندلس کے ازابیلا اور فرنانڈیز تھے، جو اندلس سے مسلمانوں اور یہودیوں کے خاتمے کی مؤثر قیادت کررہے تھے۔ وہ ایک ایسے یورپ کی تشکیل کے خواہاں تھے جہاں متعصب عیسائیوں کے علاوہ کسی اور مذہب وملت کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ بھلا ایسے لوگ اعلیٰ انسانی قدروں، حریت فکری یا خودشناسی اور کائنات شناسی کی علم برداری کا دعویٰ کیسے کرسکتے ہیں؟ اندلس میں جس سال مسلم ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجائی گئی اسی سال نئے حکمرانوں کی سرپرستی میں کولمبس ایک نئی صلیبی جنگ کی تیاری اور یوروپی استعمارانہ عزائم کی تکمیل کے لیے نکلے۔ کولمبس نے خود اپنے سفرنامے میں ان حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔[۱۳۸] نئے اندلسی حکمراں ایک نئی صلیبی جنگ کے لیے وسائل کی تلاش میں تھے سو انھوں نے سقوطِ غرناطہ کے فوراً بعد کولمبس کو اس مشن پر روانہ کردیا کہ وہ ان امکانات کا پتہ لگائے کہ کن زمینوں کو تاراج کیا جانا اور کن قوموں کو غلام بنانا ممکن اور مؤثر ہوسکتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ انیسویں صدی کے وسط تک اہل مغرب اس خیال سے نا آشنا تھے کہ ان کی تاریخ میں چودھویں سے سولھویں صدی تک کا عہد نشاۃ ثانیہ سے عبارت ہے۔ البتہ جب انیسویں صدی میں مشرق مغرب کے زیرنگوں آنے لگا تو مغرب کو ایک نئے رزمیہ کی تشکیل کے لیے دوسرے بہت سے اساطیر کے ساتھ نشاۃ ثانیہ کے اسطورے کے ایجاد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اطالوی مصنف Francesco Petrarca (1304-74) نے جب پہلی بار rinascita (نشاۃ ثانیہ) کی اصطلاح استعمال کی تو اس کی مراد یونانی ادبیات کے احیاء تک محدود تھی۔ Petrarca ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے عہدِ تاریک کا فلسفہ تخلیق کیا اور جس نے سقوط روما سے لے کر اپنے

کتاب الحیل (الجزری) میں خودکار فلش کی تکنالوجی کا بیان

عہد تک کے اس طویل عرصہ کو عہد تاریک کے دھندلکے میں چھپا دینے کی کوشش کی۔[۱۳۹] لیکن تب چودھویں صدی میں یورپ علوم عربیہ کے غلغلوں سے گونج رہا تھا سو اس وقت کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ آئی کہ نشاۃ ثانیہ کے تراشیدہ اسطورہ کو آگے بڑھانے کے لیے اخذ و اکتساب کی ان طویل صدیوں پر عہد تاریک کی طناب کچھ اس طرح کھینچ جائے گی کہ آنے والوں کے لیے مفروضہ نشاۃ ثانیہ کے پیچھے دیکھنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ انیسویں صدی میں مشرق کے اچانک سقوط اور مغرب کی غیر معمولی سبقت نے پرانے اسطوروں کو گویا نئی زندگی بخش دی۔ یہ خیال عام ہوا کہ مغرب کا عروج دراصل یونانی علوم و ادبیات کی دریافت اور اس کے احیاء کا رہین منت ہے۔ حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ ۱۴۵۳ء میں سقوط قسطنطنیہ کے بعد یونانی زبان کے بعض ماہرین اپنی کتابوں کے ساتھ قسطنطنیہ سے اٹلی کی طرف مہاجرت پر مجبور ہوئے تھے اور جس کے سبب اٹلی میں زبان سیکھنے سکھانے اور بعض یونانی ادبی شہ پاروں کے ترجموں کی صورت نکل آئی تھی۔[۱۴۰] یقیناً ان کتابوں میں اکتشافی علوم کی کتابیں بھی تھیں جن کے راست یونانی سے ترجموں کی صورت بہم ہوگئی تھی لیکن یہ کتابیں اپنی اضافہ شدہ اور تصحیح شدہ شکلوں میں تو پہلے ہی طلیطلہ کے مترجمین کے ہاتھوں یورپ کو پہنچ چکی تھیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اہل علم کی اس نئی کھیپ کو جو بعض قدیم مسودات کے ساتھ اٹلی کے مختلف شہروں میں آوارد ہوئے تھے انھیں نشاۃ

ثانیہ کا نقیب قرار دیا جائے کہ اگر یہ قدیم یونانی کتابیں کسی نشاۃ ثانیہ کی واقعی موجب ہوتیں تو یہ معجزہ قسطنطنیہ کے قدیم اور علمی شہر میں پیش آ چکا ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ مغرب کی تقلیبِ ماہیت خواہ اسے نشاۃ ثانیہ کا نام دیا جائے یا کچھ اور المجسطی کے ترجمے کے بجائے تحریر المجسطی کی پیداوار ہے۔[۱۴۱]

میشلے اور برخاردت کے ہاں نشاۃ ثانیہ کا تصور بظاہر تو آرٹ کے احیاء اور فرد کی خود آگہی سے عبارت ہے، لیکن ذرا گہرائی سے جائزہ لینے پر یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ Renaissance Man جسے شخصی آزادی اور حریت فکری کا نمائندہ باور کرایا گیا ہے اس کا تعلق سفید فام نسل سے ہے۔ یہ سارا فلسفہ تراشا ہی اس لیے گیا ہے تا کہ دنیا کی دوسری اقوام پر سفید فام نسل کے تفوق کو ثابت کیا جائے جس سے اب اس نقطہ نظر کے مطابق نئی دنیا کی تعمیر کا کام لیا جانا تھا۔ حالانکہ پندرھویں اور سولہویں صدی کے اطالوی مصورین کے مشہورِ زمانہ فن پاروں پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ بات افشا ہوئے بغیر نہیں رہتی کہ ان تصویروں میں کسی انفرادی آزادی، شخصی آگہی یا کائنات شناسی کے بجائے مشرق کی ثقافتی اور سیاسی بالادستی کی روحانیت پر غالب آ گئی ہے۔ اس خیال کی وضاحت کے لیے ہم یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا renaissance کریں گے۔

۱۴۹۲ء کا علامتی سال مغربی رزمیہ نگاروں کے ہاں علامتی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے کہ یہ بیک وقت سقوطِ غرناطہ اور کولمبس کے بحری سفر کا سال ہے۔ اسی سال سینٹ مارک سے متعلق اس مشہورِ زمانہ پینٹنگ پر کام کا آغاز ہوا جس کے تکمیل کی مدت کوئی پندرہ سالوں پر محیط ہے۔ Gentile اور Giovenni Bellini نے اس تصویر میں سینٹ مارک کو اسکندریہ میں تبلیغ میں منہمک دکھایا ہے۔ سینٹ مارک وینیس کے سب سے بڑے روحانی ولی ہیں جن کے آثار کے اسکندریہ سے چرائے جانے اور وینس میں اس کی منتقلی کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اس پینٹنگ پر جتنی باریک بینی سے نگاہ ڈالتے جائیں یہ تاثر گہرا ہوتا جاتا ہے کہ مغرب جس عہد کو نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے ایک نئی حسیت کا آغاز بتاتا ہے وہ دراصل ایک ایسی فضا ہے جو مشرق کی جاہ و حشمت اور اس کی تہذیبی بالادستی سے مملو ہے۔ تصویر (دیکھیے ص ۱۳۸) میں مشرقی لباس میں ملبوس خواتین، ترک اشرافیہ کا ایک بڑا گروہ اور مصر کے ممالیک شرفاء کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے مغربی ذہن میں مشرق کا مقام کتنا نمایاں اور کتنا پرحشم ہے۔ سینٹ مارک جس منبر سے تبلیغ فرما رہے ہیں اس کے پس منظر میں اسلامی طرزِ تعمیر اور نقش و نگاری سے اسے مرصع کرنا اس بات پر دال ہے کہ چودھویں اور پندرھویں صدی کے اٹلی میں جاہ و حشم کا کوئی تصور مشرقی آمیزے کے بغیر ممکن نہ تھا۔ نشاۃ ثانیہ کے عہد کی اس قبیل کی دوسری مصوری میں بھی مشرق کی جاہ و سطوت کا یہ انداز نمایاں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عہد میں مغرب اپنی کوئی ایسی آزاد صورت گری سے قاصر تھا جو مشرقی اثرات سے مملو نہ ہو۔ بالفاظ دیگر مغرب اپنے آپ کو پینٹ کرتے ہوئے دراصل مشرق کی صورت گری پر مجبور تھا کہ مشرق ہی تہذیب کی وہ کسوٹی اور آئینہ تھا جس میں مغرب کو اپنی صاف ستھری تصویر نظر آ سکتی تھی۔
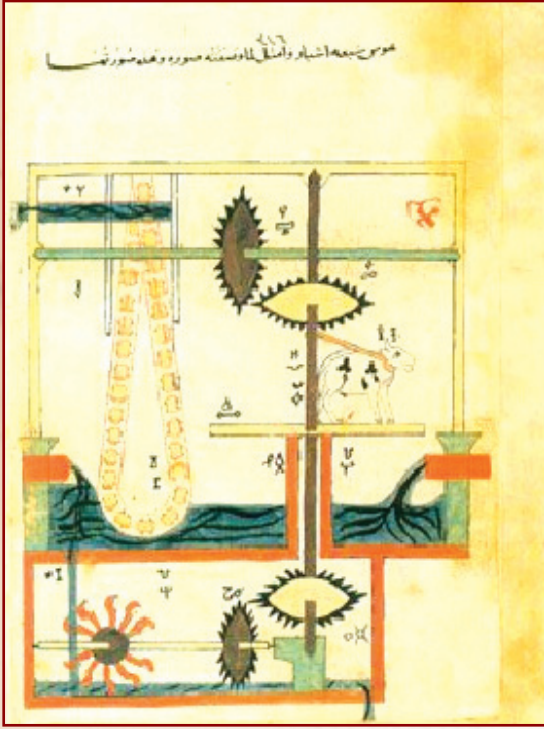
کتاب الحیل

زیرِ زمین پانی کی نکاسی کے لیے جانوروں کے استعمال کی تکنیک

نشاۃ ثانیہ کے ان فن پاروں کو ان کے تاریخی سیاق وسباق کے بغیر پڑھنا ہمیں اس عہد کے واقعی تاریخی وجدان سے محروم کرسکتا ہے۔ Gentile Bellini ایک سیدھے سادے فن کار تھے۔ یہ بات ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی کہ وہ اپنی مصوری سے نشاۃ ثانیہ کی جوت جگارہے ہیں یا ان کا برش کسی مغربی رزمیہ کی تشکیل میں مصروف ہے۔ ۱۴۷۹ء میں وینیس کے حکمراں کی ایماء پر بلینی قسطنطنیہ بھیجے گئے جہاں انھوں نے سلطان محمد کی ایک ایسی شاہکار پینٹنگ بنائی جس پر انھیں سلطان نے انعامات و اکرام سے نوازا۔ سینٹ مارک کی تصویر میں منبر کے قریب سلطان محمد کے اکرام سے سرفراز، گلے میں سونے کی چین پہنے بلینی بذات خود موجود ہیں۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اس عہد میں کسی بڑے آرٹسٹ کو اپنا اعتبار قائم کرنے کے لیے ترک سلطان کی سندتوصیف آخری حوالہ سمجھی جاتی تھی۔

اس عہد کی جو مطبوعات ہم تک پہنچی ہیں اس سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ چودھویں اور پندرھویں صدی کا اٹلی یورپ کے دوسرے خطوں کے مقابلے میں عربی زبان اور اکتشافی علوم کے لیے کہیں بہتر ماحول کا حامل تھا۔ اس وقت جب بلاک پرنٹنگ کے ذریعہ صرف وہی کتابیں شائع کی جاتی تھیں جن کی بڑے پیمانے پر مانگ ہو، ہمیں یہ جان کر حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ مقبول عام کتابوں کی فہرست میں عربی زبان کے قاعدے بھی موجود تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے یہ ایام کسی مفروضہ روحِ یورپ کی بیداری کے بجائے شرق وغرب کے تعامل کے ایام تھے جہاں مغرب مسلسل مشرق سے اخذ واکتساب میں مصروف تھا اور اہل مغرب پر یہ بات عیاں ہوتی جاتی تھی، جیسا کہ میشیل دی مونتین (Michel de Montaigne) سے منقول ہے: ''فی زمانہ دنیا میں سب سے طاقتور بلکہ کہہ لیجئے کہ سب سے مستحکم حکومت ترکوں کی ہے۔'' اور بقول مارشل ہاگسن (Marshall Hodgson): ''سولھویں صدی میں اگر کوئی سیاح مریخ سے آتا تو وہ یہ احساس کیے بغیر نہ رہ پاتا گویا ساری دنیا مسلمان ہونے پر تلی بیٹھی ہو۔''[۱۴۲]

مصوری ہو یا صنم تراشی سولہویں صدی کے اٹلی میں اس فن کا عروج معاشی مرفہ الحالی کے علاوہ سیاسی مصلحتوں کے سبب بھی تھا۔ مغربی رزمیہ نگاروں کی نگاہ میں مائیکل انجلیو اور رافیل نئی حسیت کے ترجمان ہیں جبکہ تاریخی حقائق کچھ اور ہی کہانی سناتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ۱۴۵۳ء میں محمد الفاتح کے ہاتھوں قسطنطنیہ کا سقوط عالم عیسائیت کے لیے ایک وحشت ناک خبر تھی۔[۱۴۳] عیسائی دنیا کی سب سے بڑی عبادت گاہ اوران کا قبلہ وکعبہ اب ترک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ کلیسائے روم کے لیے اس حادثہ کا ایک خوشگوار پہلو یہ تھا کہ اب قسطنطنیہ کے سقوط کے بعد عالم عیسائیت میں اسے واحد روحانی مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پاپائے روم نے ایک نئے عالیشان چرچ کا جو منصوبہ بنایا اس میں مصوروں کو یہ فریضہ تفویض کیا گیا کہ وہ روم کی روحانی برتری کا اظہار مصوری اور سنگ تراشی کے ذریعہ کریں۔ مائیکل انجلیو اور رافیل کی مصوری نے اس خیال کو مقبول عام بنانے میں اہم رول ادا کیا کہ کس طرح قسطنطنیہ سے روم کی طرف عالم عیسائیت کا مرکز منتقل ہو گیا اور کس طرح قسطنطین نے اپنے تمام اختیارات رضا کارانہ طور پر چرچ کے ہاتھوں میں منتقل کر دیے ہیں۔ Donation of Constantine جسے پروٹسٹنٹ تحریک نے متنازع قرار دیا تھا اور جس دستاویز کی صحت پر عام شکوک وشبہات وارد کیے جارہے تھے اس کے عوامی استناد کا اس سے اچھا اور کیا طریقہ ہوسکتا تھا کہ اسے عین سینٹ پیٹر کی زیارت گاہ میں تصویروں کی زبانی لوگوں کے دل ودماغ پر منقش کر دیا جائے۔[۱۴۴] اس عہد میں مصوری اور سنگ تراشی کی زبان مطبوعہ الفاظ سے کہیں زیادہ طاقتور تھی اور سینٹ پیٹر کی پرہیبت اور پرشکوہ عمارت میں زائرین کے دل ودماغ پر انمٹ نقوش ثبت کرسکتی تھی۔ سو اس عہد کے مشہور مصورین مذہبی پروپیگنڈے کے کام پر لگا دیے گئے۔ ایک طرف لوتھر کی غضبناک تحریریں تھیں جو ڈونیشن کی دستاویز کو جعلی قرار دیتیں۔ indulgence کی فروخت کو پرلے درجہ کی منافقت اور مذہبی تجارت بتاتیں اور دوسری طرف چرچ کا یہ جوابی حملہ کہ اس نے بہترین مصوروں کو تصویروں کی زبانی مذہبی پروپیگنڈے پر مامور کر رکھا تھا۔ اس وقت کے یہ مصور ایک وقتی مذہبی نزاع کا حصہ سمجھے جاتے تو بات یہیں ختم ہوجاتی، اگر Giorgio Vasari نے ان مصورین کو آرٹ کے حوالے سے تقدس نہ عطا کیا ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۵۵۰ء میں وساری نے *Lives of the Artist* کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں ایک سو بیالیس مصورین، بت تراش اور معمارین کا تذکرہ تقدیسی لب ولہجہ میں کیا گیا تھا۔ چونکہ ان میں سے بعض نامور فن کار سینٹ پیٹر کی عبادت گاہ کے حوالے سے تکریم کے سزاوار سمجھے جاتے تھے سو اس فن کو بھی یک گونہ تقدیس کا حامل سمجھا جانے لگا۔[۱۴۵] وساری غالباً پہلا شخص ہے جس نے فی نفسہٖ آرٹ کے حوالے سے Rinascita کی اصطلاح استعمال کی جس سے یہ التباس پیدا ہوا کہ غالباً یہ فن کار دانستاً ایک نئی دنیا کی جوت جگانے میں مصروف تھے۔ حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ عالم عیسائیت کے اندرونی مناقشہ میں جہاں کیتھولک علماء اور ان کے مخالفین اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اپنے موقف کا اظہار کر رہے تھے وہیں اس عہد کے مصورین اور سنگ تراشوں کو بھی چرچ نے اپنی حمایت میں کام پر لگا رکھا تھا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ لیونارڈو رافیل یا مائیکل انجلو کو محض سینٹ پیٹر سے

The Donation of Constantine

ویٹیکن میں رافیل اور اس کے شاگردوں کی مشہور زمانہ مصوری

وابستگی کے سبب تقدس کا حامل سمجھا جائے یا انھیں نئے مغربی ذہن کا بانی مبانی قرار دیا جائے۔ وساری بذات خود ایک اچھے آرٹسٹ تھے جن کی مصوری سے سینٹ پیٹر کا چرچ معمور ہے۔ اپنی مشہور زمانہ مصوری The massacre of coligny میں انھوں نے کیتھولک عیسائیوں کے ہاتھوں مخالفین کے تہ و تیغ کیے جانے کا بڑا عبرت ناک اور لرزہ بہ اندام منظر پیش کیا ہے۔ جس سے کم از کم اس حقیقت کا پتہ تو چلتا ہی ہے کہ ان renaissance artists کے پاس کسی نئی بلند نگہی کا کوئی منشور نہ تھا۔ ان کے دماغ انتہائی تنگ تھے اور مخالفین کے لیے ان کے ہاں کوئی جگہ نہ تھی، پھر کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کسی فجرِ جدید اور حریتِ فکری کا نقیب سمجھا جائے۔

یوروپ کی صورت گری اور کرسٹینڈم کا ظہور

تحریک اکتشاف کی آمد سے پہلے ایک نظری اور جغرافیائی وحدت کے طور پر یورپ کا کوئی وجود نہ تھا۔ اندلس میں طارق بن زیاد کی آمد مسلم تہذیب کے نمائندے کے طور پر ہوئی تھی۔ کسے معلوم تھا کہ اندلس اور صقلیہ پر مسلمانوں کی ترکتازیاں قدیم رومی تہذیب کے خرابے کی تقلیبِ نو پر منتج ہوگی۔ ابتداً تو اہل یورپ مبہوت اور متحیر سے رہے، لیکن جلد ہی فریڈرک اور شارلیمان جیسے دور اندیش قائدین نے تقلیداً ہی سہی اسلامی تہذیب کے بالمقابل ایک نئی یوروپی عیسائی تہذیب کی صورت گری کے انتظامات شروع کر دیے۔ ان مؤسسین کے سامنے اسلام کا سیاسی اور ملّی نظام ایک مجرب ماڈل کے طور پر موجود تھا جس کے آئینہ میں وہ عالم عیسائیت کی تنظیم نو کے منصوبے بنا سکتے تھے۔ مثال کے طور پر شارلیمان

کے عہد میں یورپ کی بقا اور اس کی وحدت کے حوالے سے عیسائی مفکرین کے سامنے یہ سوال اہمیت اختیار کر گیا کہ مسلمان ساری دنیا کو آمد اسلام کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے ہاں تاریخ کی ترتیب و تصویب ہجری کلینڈر کے تابع ہے جس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ اسلام کا ظہور تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ ہے اور یہ کہ مستقبل کی تاریخ کی کمان اب ان کے ہاتھوں میں تھمادی گئی ہے۔ ہجری کلینڈر صرف تاریخ کی پیمائش کا آلہ نہیں بلکہ اسلام کے تفوق (hegemony) کا علامیہ بھی ہے۔ سو اسلام کے مقابلہ میں عیسائی تہذیب کی بنا کے لیے لازم ہے کہ عالم عیسائیت کا بھی اپنا ایک کلینڈر ہو۔ کہا جاتا ہے کہ بیڈ (Bede) کیمشورے پر شارلیمان کے عہد میں پہلے عیسائی کلینڈر کا ڈول ڈالا گیا جس کے لیے anno domini یعنی پیدائش مسیح کو نقطۂ آغاز کے طور پر قبول کرلیا گیا۔[146] یہ اور بات ہے کہ تب عیسائی دنیا کے پاس وقت کی پیمائش کا کوئی صحیح طریقہ نہ تھا سو ایک واقعی عیسائی کلینڈر کی ترتیب کے لیے کوئی آٹھ سو سالوں تک مزید انتظار کرنا پڑا تا آنکہ کوپرنکس کے عہد میں مسلم فلکیاتی علوم سے واقفیت کے سبب اس کی راہ ہموار ہوئی اور بالآخر ۱۵۸۲ء میں جب عالم انسانیت ۵؍اکتوبر کی صبح کو بیدار ہوئی تو پوپ گریگوری۔ ۱۳ نے یہ مژدہ سنایا کہ آج ۵ نہیں بلکہ ۱۵؍اکتوبر ہے اور یہ کہ حساب و کتاب کی سابقہ غلطیوں کو درست کرلیا گیا ہے۔[147] جوں جوں یورپ میں اکتشافی تحریک کا غلغلہ بلند ہوتا گیا عالم اسلام کے مقابلہ میں عالم عیسائیت کی تشکیل کے داعیات بھی قوی تر ہوتے گئے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ مشرق عیسائیت کا بھی جائے پیدائش تھا جس پر اب اہل اسلام کی حکمرانی تھی۔ دو سو سال کی صلیبی جنگیں بھی یروشلم کے مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہی تھیں۔ سو اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا کہ یروشلم کے ارض مقدس سے دور عالم عیسائیت کے لیے ایک خیالی جغرافیائی خطہ کی صورت گری کی جائے۔ اور چونکہ مستقبل بعید میں بھی مشرق کی فتح کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا تھا سو یورپ کو عیسائیت کی فطری سرزمین قرار دینے کے لیے نئے اساطیر کی تشکیل لازم تھی۔ کتاب پیدائش میں مذکور نوح کے تین بیٹوں کے تذکرے کو اس کام پر لگایا گیا اور یہ خیال عام ہوا کہ Japheth یعنی یورپ کی اصل شناخت عیسائی ہے۔[148] آگے چل کر یہ اسطورہ اتنا کامیاب ہوا کہ عیسائیت کو مغرب کے فطری مذہب کے طور پر دیکھا جانے لگا اور اس طرح عالم اسلام کے مقابلہ میں ایک جغرافیائی عالم عیسائیت کا وجود عمل میں آگیا۔

گیارہویں صدی میں عالم عیسائیت نے اپنی بقا اور استحکام کے لیے تقسیم کار کا ایک نیا اسطورہ تشکیل دیا تھا جس کے مطابق انسانی سماج تین مختلف زمروں میں منقسم بتایا گیا۔ Decree of the three orders کے مطابق خدا نے پادریوں اور بشپ کو تو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ کارِنجات کے لیے سرگرم رہیں۔ شرفاء امراء اور Knights کے ذمہ تحفظ اور جہاد کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ رہے بے چارے مزدور عوام اور کھیتوں میں کام کرنے والے خستہ حال انسان تو انھیں، اس نقطہ نظر کے مطابق، خدا نے بنایا ہی اس لیے ہے کہ وہ ان دونوں اوپری طبقات کی خدمات میں لگے رہیں اور ان کے لیے مسلسل وسائل فراہم کرتے رہیں۔[149] کہا گیا کہ یہ سب کچھ دراصل ایک خدائی منصوبہ کا حصہ ہے۔ یہ منشائے ایزدی ہے، سو ہر شخص

مریم کے روایتی مقدس ہالے کی تزئین میں عربی نما خطاطی کی جھلک

کو چاہئے جو جہاں ہے وہیں مستعدی کے ساتھ اپنے کاموں میں لگا رہے۔ اس سے سرتابی کی بابت سوچنا گناہ عظیم سے کم نہیں۔[150] ایک طرف تو decree of the three orders نے فرد کو جبراً ریاست کی اطاعت پر لگانے کی کوشش کی اور دوسری طرف نجات پر چرچ کی اجارہ داری نے اس کے لیے ان جابرانہ مطالبات سے فرار کے تمام راستے مسدود کردیے۔ چونکہ عالم عیسائیت میں یہ خیال عام تھا کہ چرچ کی ایماء کے بغیر سالکین کی نجات کی کوئی سبیل نہیں ہوسکتی: (extra ecclesiam nulla salus) سو فرد کے لیے اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ پیدائشی طور پر جہاں پھنس گیا ہے وہیں گھٹ گھٹ کر اطاعت شعاری کے ساتھ اپنی جان دے دے۔ فریضۂ کار کی اس جبری زمرہ بندی نے عالم عیسائیت کو تو یقیناً استحکام بخشا البتہ عملی طور پر عیسائی دنیا ایک ازیت ناک fiefdom بن کر رہ گئی۔[151]

شارلیمان کے عہد سے لے کر آج تک یورپ، مغرب یا عالم عیسائیت کی نظری شناخت اسلام کی مخالفت اور معاندت کے دم سے قائم ہے۔ Japheth myth (یوروپی اسطورہ) سے لے کر دانتے الیگیری[152] تک جبکہ ترکوں کے ہاتھوں سقوط قسطنطنیہ کا واقعہ بھی پیش نہیں آیا تھا، عالم عیسائیت اپنی نظری شناخت کا اظہار اسلام کی مخالفت کے حوالے سے کرتا رہا ہے۔ اسلام یا مفروضہ اسلامی خطرہ اگر درپیش نہ ہوتا تو عالم عیسائیت کی نظری وحدت کا امکان بھی جاتا رہتا۔ اٹھارویں صدی تک جب تک عالم اسلام کی سطوت قائم تھی مغرب اپنی صورت گری اور تزئین و آرائش کے لیے مسلسل خود کو عالم اسلام کے آئینے میں دیکھتا رہا، البتہ انیسویں صدی کی ابتدا سے جب قوت کے میزانیہ میں حیرت انگیز تبدیلی آنے لگی تو اچانک مغربی مفکرین نے اہل یونان کو اپنے مبدأ و معاد کے طور پر قبول کرلیا۔ اس نئے اسطورہ کی چنگاریاں اطالوی مصنف فرانسسکو پٹرارکا کی تحریروں میں پہلے سے موجود تھیں جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں۔ اہل یونان سے

اپنا تہذیبی رشتہ جوڑنا گویا اس تاریخی عمل پر پردہ ڈالنا تھا جس سے اخذ واکتساب کی طویل یوروپی صدیاں معمور تھیں۔ انیسویں صدی کے مغربی مؤسسین جنھوں نے نشاۃ ثانیہ کا اسطورہ تخلیق کیا تھا وہ اس حقیقت کو عمداً فراموش کر بیٹھے کہ خود یونان کی عظمت اسکندریہ اور بابل کے حوالے سے قائم ہوئی تھی اور یہ کہ خود یونانی اسطورہ کے مطابق یوروپا جو ٹائر کے بادشاہ ایگینور کی بیٹی ہے اس کا جائے مقام لبنان کے ساحل پر واقع ہے۔[۱۵۳] ہمیشہ سے یونان تہذیبی اور روحانی طور پر مشرق کا حصہ رہا ہے، پھر اسے مغرب کے نظری اور تہذیبی مرکز پر فائز کرنے کی کوشش کیسے بامراد ہوسکتی تھی، لیکن جہاں سارا کام اساطیر کے سہارے انجام پا تا رہا ہو اور جس تہذیب کی نظری، جغرافیائی حتیٰ کہ مذہبی تشکیل و تجسیم بھی اساطیر کی مرہونِ منت ہوں، جہاں کیتھولک چرچ گناہ و ثواب کی تقسیم کا اختیار رکھتا ہو، جہاں نجات کے پروانے کھلے عام بکتے یا عطا کیے جاتے ہوں، جہاں یہ بات اربابِ کلیسا کے اختیار میں ہو کہ وہ جسے چاہیں ولایت کے منصب پر سرفراز کریں اور جسے چاہیں ابدی جہنم (eternal damnation) کا سزاوار قرار دیں، جہاں آئے دن کسی پہاڑ کی چوٹی پر مسیح یا ان کی والدہ کی آمد کا جلوہ نما ہلوسہ ہوتا ہو اور جہاں عین میدانِ جنگ میں عیسائیوں کو نصرت بخشنے کے لیے سینٹ جیمس ہتھیار بند ہو کر میدان میں اتر پڑتے ہوں اور فضا سنٹیا گو سنٹیا گو کی صداؤں سے گونج اٹھتی ہو[۱۵۴] ایک ایسے تہذیبی خرابے میں بھلا اساطیر سے زیادہ اور کون سی چیز مستند اور مؤثر ہوسکتی تھی۔

تاریخ کا مغربی رزمیہ

آٹھویں صدی میں اندلس اور صقلیہ کے راستے عیسائی یورپ میں داخل ہونے والی تحریک اکتشاف بالآخر ایک نئی تہذیب کی تشکیل پر منتج ہوئی۔ اس دوران اہلِ مغرب کے ابتدائی پانچ سو سال اخذ و اکتساب اور فدویانہ تقلید میں گزرے۔ اگلے تین سو سال مشرق کے خلاقانہ اتباع میں صرف ہوئے، یہاں تک کہ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں اہلِ یورپ ایک طرح کی خود اعتمادی سے سرشار نظر آنے لگے۔ بحری سفر کی سہولتوں اور شرق و غرب کی سیاحت نے انھیں اگر ایک خود اعتمادی سے سرفراز کیا تو دوسری طرف مشرق کی خوبیوں اور کمزوریوں کا بھی انھیں کسی حد تک ادراک ہونے لگا۔ ادھر صنعتی انقلاب نے اچانک انھیں importer اور صارف کے بجائے exporter کے منصب پر فائز کر دیا۔ مشرق کی لڑکھڑاتی سیاست اور عالمِ اسلام میں قرآنی دائرۂ فکر پر توہمات کے غالب آجانے سے اکتشافی ذہن کے فی الفور احیاء کا امکان جاتا رہا۔ مسلم اہلِ فکر حالات کے واقعی ادراک سے قاصر تھے اور سیاسی قیادت کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ مختصر مدتی معاشی فوائد اور فوری آمدنی کے لیے اپنی منڈیوں کے دروازے یورپ کے نئے ابھرتے تاجروں پر کھول دیں۔ بہت جلد مشرق اور بالخصوص عالمِ اسلام سے خام مال بڑے بڑے جہازوں میں بھر کر یورپ کی نئی صنعتی یونٹوں کو پہنچنے لگے۔ اس صورتِ حال نے مشرق کی معیشت کو دوبارہ سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ دوسری طرف نئی دنیا امریکہ کے

جب یوروپ کے ادب اور فیشن پر مشرق کا اسلامی رنگ غالب تھا۔
گیوانی بکاسیو کی کہانی ڈیکامیرون کا ایک تصویری مرقع جان واٹر ہاؤس کے برش سے

علاوہ مشرق اور خود عالم اسلام کے مختلف ممالک یوروپی استعمار کے نشانے پر آگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عالم اسلام کے ہزار سالہ سیاسی تفوق کا رزمیہ بالآخر انیسویں صدی میں شکست و ریخت کا شکار ہوگیا۔ انیسویں صدی اہل مغرب کے لیے بڑے طرب ناک امکانات کی حامل تھی۔ ایسا معلوم ہوا گویا اہل مغرب کے لیے تاریخ کو از سر نو لکھنے کا وقت آ پہنچا ہے۔

فرانسسکو پیٹرارکا سے لے کر فرانسس بیکن تک اور پھر برخاردت سے لے کر مارکس اور میکس ویبر تک اس خیال کا شدت سے اعادہ کیا جاتا رہا کہ جدید دنیا جیسی کہ وہ ہے، مغرب نے بنائی ہے، جس کی ابتدا علوم عربیہ کی آمد اور اکتشافی دائرۂ فکر کی تشکیل کے بجائے کولمبس کے ۱۴۹۲ء کے سفر سے ہوتی ہے۔ آنے والے دنوں میں ۱۴۹۲ء ایک مؤثر اسطورہ کے طور پر سامنے آیا اور یہ خیال عام ہوتا گیا کہ کم از کم گزشتہ پانچ سو سالوں سے دنیا سفید فام یوروپی اقوام کی قیادت میں اپنا تہذیبی سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔[۱۵۵] گو کہ یہ ایک بڑا تاریخی مغالطہ اور پرلے درجہ کا علمی فریب تھا، لیکن استعمار کی صدیوں میں اس گمراہ کن پروپیگنڈے کا کچھ اس زور وشور سے چرچا ہوا کہ مسلمانوں کا تاریخی فہم کند ہو کر رہ گیا۔ تحلیل و تجزیہ کی صلاحیتیں ماؤف ہوگئیں، پھر اصلاحِ احوال کے لیے کسی واقعی اقدام کا ڈول کیسے ڈالا جاتا۔

تاریخ کے ایک طالب علم کو سخت حیرت ہوتی ہے کہ دسویں صدی کے آخری ایام میں گربرٹ کے چار صفحاتی مقالے کی اشاعت کو تاریخ کے اہم واقعات میں شمار کرنے کی آخر بنیاد کیا ہے؟ گربرٹ کا یہ بظاہر محیر العقول کارنامہ یقیناً اہل

بلینی کی وہ شہرۂ آفاق مصوری جس میں سینٹ مارک کو مصروف تبلیغ

مغرب کے لیے حیرت واستعجاب کا باعث ہوسکتا تھا اور وہ گر برٹ کے اس علمی معرکہ کو اس کی عبقریت پر محمول کر سکتے تھے، لیکن عالمی پس منظر میں اس کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ الخوارزمی کی کتابوں اور ہندوستانی علم ہندسہ سے واقف کاروں کے لیے گر برٹ کی یہ کوشش مبتدیانہ سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اسی طرح جب فرانسس بیکن نے اکتشافی منہج کا غلغلہ بلند کیا اور اسے مغربی ذہن کا وصف بتانے کی کوشش کی تو ان کا یہ دعوائے بے دلیل بھی صرف مغربی انسان کو متاثر کر سکتا تھا، ورنہ بیکن سے بہت پہلے ابن الہیثم اس اکتشافی منہج کی تفصیلات اور برکات پر کلام کر چکے تھے اور ان کے ایک مغربی شاگرد روجر بیکن نے

دکھایا گیا ہے، اسلامی مشرق کی حشمت وجلالت سے پوری طرح مملو ہے۔

اس منہج کی افادیت پر اہل یورپ کو مطلع کر رکھا تھا۔ کچھ یہی حال کولمبس اور ڈی گاما کے بحری سفر کا بھی ہے جو یقیناً اہل مغرب کے لیے ایک طرب انگیز وقوعہ سے کم نہ رہا ہوگا۔ جس سمندر میں اب تک مسلمانوں اور اہل چین کے تجارتی جہاز متحرک تھے اب اسپین اور پرتگال جیسی ریاستوں نے بھی اس میں اپنا حصہ رسدی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔[١٥٦] ڈی گاما نے جب Cape of Good Hope کی نشان دہی کی یا متبادل بحری راستے کا پتہ لگایا، ان کا یہ قدم اہل مغرب کے لیے یقیناً ایک بڑی کامیابی تھی، البتہ عالمی منظرنامے پر اس کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ افریقی ساحل جسے Cape of Good Hope کا نام

دیا گیا ہے تو ازمنۂ قدیم سے وہیں موجود چلا آتا تھا اور مسلم جہاز راں احمد بن ماجد کا اس راستے کو عبور کرنا بھی لوگوں کے علم میں تھا۔[۱۵۷] خود اہل مغرب کے ہاں تاریخ کو پیچھے کی طرف لے جانا اور ۱۴۹۲ء سے ایک نئی دنیا کے طلوع کی خبر دینا بعد کا عمل ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم اس بات کی طرف اشارہ کر آئے ہیں کہ سولہویں صدی میں لندن کے اسٹیج ڈراموں پر ترکوں کے جلالت و جبروت کا قصہ کس طرح چھایا ہوا ہے۔ لوتھر کی تحریکِ اصلاح میں Turkish Menace کی گونج مسلسل سنائی دیتی ہے۔ سقوطِ غرناطہ کے بہت بعد تک مہذب دنیا کی تینوں بڑی سیاسی طاقتیں جو خیر سے مسلم ریاستوں پر مشتمل تھیں، یعنی مغل ہند، صفوی ایران اور عثمانی ترک ان کے دبدبہ کا شہرہ عام ہے۔ حتیٰ کہ ۱۶۸۲ء تک صورت حال یہ ہے کہ عثمانی ترک اقدامی عمل کے طور پر ویانا کے دروازوں پر جا پہنچتے ہیں۔ پھر مغرب کی پانچ سو سالہ سیادت کے مفروضے کو کیسے معتبر قرار دیا جا سکتا؟ مغرب کے واقعی عروج کے لیے ماضی بعید میں اگر کوئی واقعی تاریخ متعین کی جا سکتی ہے تو وہ ۱۷۸۹ء کا فرانسیسی انقلاب ہو سکتا ہے، لیکن ایسی صورت میں بھی معاملہ دو سو سال سے زیادہ کا نہیں بنتا۔ واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی سے پہلے یورپ کو کبھی بھی یہ اہمیت حاصل نہیں رہی کہ اسے عالمی تاریخ کے مرکز کے طور پر دیکھا جاتا، جیسا کہ ہیگل کا خیال ہے اور نہ ہی اس اسطورہ میں کوئی وزن ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل کے زمانہ سے ہی یورپ کو اخلاقی اور سیاسی برتری حاصل رہی ہے، جیسا کہ میکس ویبر کی غلط فہمی ہے۔ اور نہ ہی اس بات کے لیے کوئی تاریخی اور علمی جواز ہے کہ ۱۴۹۲ء کو عالم انسانیت کی تاریخ میں ایک اہم وقوعہ کے طور پر دیکھا جائے جس کی وکالت کارل مارکس کرتے رہے ہیں۔ اس پروپیگنڈہ کی کامیابی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود شاعر مشرق کی زبان سے بھی

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند

کا گلہ سنائی دیتا ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ جان روبرٹس نے اپنی کتاب مغرب کی فتح *(The Triumph of the West)* میں لکھا ہے کہ دنیا کی دریافت کا تمام تر سہرا یوروپی اقوام کے سر جاتا ہے، جن کے سمندری سفر سے ایک نئے عہد کا آغاز ہوا اور جن کے سبب اقوامِ یورپ پر وسیع تر دنیا وا ہو گئی۔ رابرٹس کے بقول جدید تاریخ کی پہلی اینٹ ہنری کے ہاتھوں رکھی گئی، گو کہ اسے اس وقت اس اہم ترین اقدامی عمل کا اندازہ نہ تھا:

> ''اگلی صدی میں اپنے پیشرو لوتھر کی طرح ہنری (جہاز راں) بھی اپنے اقدام سے جدید تاریخ کے آغاز کا سبب بن گیا۔ یہ سب کچھ ایک چھوٹی سی کشتی کے سبب ہوا کہ شاہ پرتگال (منوئیل) نے اپنے آپ کو شہنشاہ عرب و فارس اور حبشہ و ہند قرار دے ڈالا۔ سمندروں کا کنٹرول بہت بڑی فتح ثابت ہوئی جس نے بہت جلد پوری دنیا پر مغربی تہذیب کے غلبہ کی راہ ہموار کر دی۔''[۱۵۸]

Die Sarraceni bruchē Arabisch zung und litter. welche litter hie unden steet in rechter form gedrucket.

جب عربی بین الاقوامی زبان تھی اور یوروپ میں اس کی تعلیم کے لیے قاعدہ چھپا کرتے تھے۔

ہم پہلے بھی اس اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ پرنس ہنری کی سربراہی میں بحری مہم کا آغاز دراصل دنیائے عیسائیت کے اس بحران کے سبب تھا جو قسطنطنیہ کے زوال سے پیدا ہوا تھا۔ ۱۴۵۳ء میں مسلمانوں کے ہاتھوں قسطنطنیہ کی فتح عیسائی تاریخ کا ایک ایسا المیہ تھا جس سے دنیائے عیسائیت کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ مشرقی عیسائیت کا روحانی دارالخلافہ اب مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا۔ اس صورت حال نے ایک نئی صلیبی جنگ کے لیے پورے یورپ میں ایک اضطرابی ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ سقوط قسطنطنیہ کے صرف تین برس بعد ۱۴۵۶ء میں ایتھنس کا قدیم شہر بھی مسلمانوں کے تسلط میں آچکا تھا۔ اس صورت حال نے پوپ پیئس ثانی (Pope Pius II) کو ایک نئی صلیبی جنگ کے اعلان پر مجبور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ پرنس ہنری کو عیسائیت کے عظیم مجاہد کی حیثیت سے دیکھا گیا۔ اگر ہماری نگاہوں میں پوپ نکولس پنجم کا پہلا فرمان (dum diversas) بمطابق ۱۴۵۲ء تازہ رہے جس میں انھوں نے شاہ پرتگال کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کے امور تفویض کیے تھے اور اگر ان کا دوسرا فرمان (romanus pontifex) بمطابق ۱۴۵۵ء بھی ہو جس میں پرنس ہنری کے بحری سفر کو مذہبی حیثیت عطا کی گئی تھی تو ہمارے لیے یہ سمجھنا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ پندرہویں صدی کے آخری ایام میں سطح سمندر پر پرتگالی جہازوں کی چلت پھرت دراصل مذہبی جنگجوئیت اور مستقبل کے استعمارانہ عزائم کے سبب تھی[۱۵۹] مشاہدۂ کائنات اور تسخیر و اکتشاف کے سبب ہرگز نہ تھی، جیسا کہ مغرب کے مغنی ایک عرصہ سے ہمیں باور کراتے رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ تو پرتگالی جہازراں Bartholomeu Dias وہ پہلا شخص تھا جس نے ۱۴۸۷ء میں Cape of storms (مسمّٰی بہ Cape of Good Hope) کی دریافت کی اور نہ ہی واسکوڈی گاما کو ہندوستان کے لیے متبادل بحری راستے کی دریافت کے لئے متہم کرنے کا کوئی جواز ہے۔[۱۶۰]

گیرال ٹیبٹس نے اپنی کتاب *Arab Navigation* میں تفصیل کے ساتھ اس بات کے شواہد فراہم کئے ہیں کہ پرتگالیوں سے بہت پہلے مشرق کے جہازراں Cape سے گزرتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر عرب جہازراں شہاب
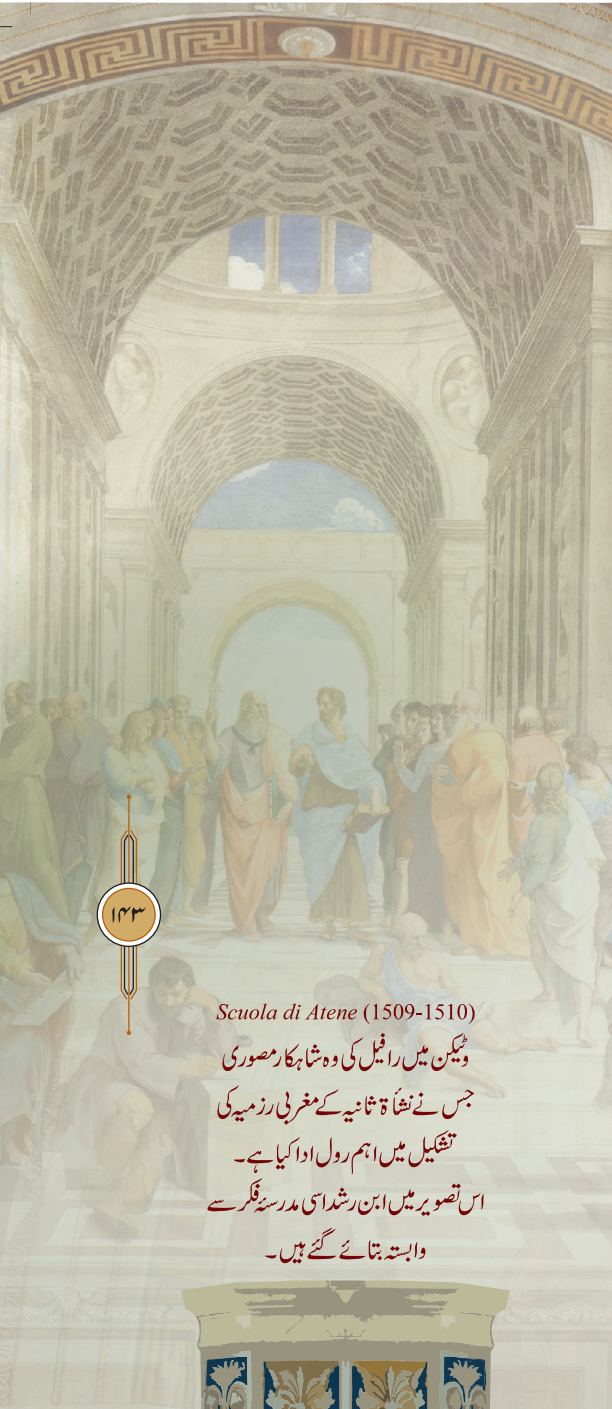
Scuola di Atene (1509-1510)
ویٹیکن میں رافیل کی وہ شاہکار مصوری
جس نے نشأۃ ثانیہ کے مغربی رزمیہ کی
تشکیل میں اہم رول ادا کیا ہے۔
اس تصویر میں ابن رشد اسی مدرسۂ فکر سے
وابستہ بتائے گئے ہیں۔

الدین احمد ابن ماجد کے پندرہویں صدی کے وسط میں Cape سے ہوتے ہوئے بحیرۂ روم براہ جبل الطارق پہنچنے کا تذکرہ جتنی تفصیل سے ملتا ہے اس سے اس بات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ پرنس ہنری کی بحری مہم جوئی پرتگالیوں کے لیے ایک نئی صبح کی آمد تھی بقیہ دنیا کے لیے نہیں کہ وہاں تو پہلے سے ہی تہذیب اپنے نصف النہار پر موجود تھی[161]

مغربی رزمیہ کی تشکیل بنیادی طور پر اس متعصب اور تنگ نظر تاریخ نویسی کی رہین منت ہے جس نے اکتشافی تہذیب کے مسلم مؤسسین کی خدمات پر خط تنسیخ پھیر رکھا ہے۔ الہیثم، الخوارزمی، ابن سینا اور البیرونی جیسے مؤسسین اگر بمشکل تاریخ کے حاشیہ پر جگہ پا سکے تو علم کیمیا کے بانی جابر بن حیان کا مسلم الاصل ہونا ہی مشکوک بنا دیا گیا۔ حالانکہ بقول مورخ کیمیا Eric John Holmyard علم کیمیا میں جابر کا مقام Boyle اور Lavoisier سے کم نہیں۔[162] جابر جن کی حیثیت جدید علم کیمیا کے بانی مبانی کی ہے ان کو اپنے اصل مقام سے معطل کرنے کے لیے اولاً کیمیا اور الکیمی میں فرق قائم کیا گیا اور پھر آخر الذکر کو توہمات کا مجموعہ سمجھ کر ناقابل اعتناء قرار دیا گیا۔ عام طور پر مسلم عالمِ کیمیا جابر بن حیان کا نام الکیمی سے وابستہ سمجھا جانے لگا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں ایک مغربی محقق رسکا نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ جابر کی تصنیف جس کا لاطینی ترجمہ *De inventione veritatis* تیرہویں صدی میں منظر عام پر آیا تھا پوٹاشیم نائٹریٹ یا بارود سے واقفیت پر دال ہے اور چونکہ اس خیال کے مطابق عرب بارود کے استعمال سے واقف نہ تھے، سو یہ تصنیف جابر بن حیان کے بجائے کسی لاطینی الاصل Geber کی سمجھنی چاہیے۔ رسکا نے بڑا غضب یہ کیا کہ علم کیمیا پر سب سے پہلی عربی الاصل لاطینی تصنیف *Liber de compositione alchimiae* (**رسالۃ مریانس الراھب الحکیم للأمیر خالد بن یزید**) کے مصنف کے سلسلے میں شکوک وشبہات وارد کر دیے۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ کتاب چودہویں صدی کے کسی عیسائی راہب کی تصنیف ہے۔[163] اور یہ کہ جس جابر کے نام سے علم کیمیا کے مختلف رسالے منسوب ہیں وہ دراصل کوئی لاطینی مصنف Geber ہے۔ رسکا کے اس نقطۂ نظر کو بالعموم مغرب میں ایک فیصلہ کن تحقیق کے طور پر اختیار کر لیا گیا۔ اس تحقیق نے مغربی رزمیہ کی تشکیل میں جس کے مطابق بارود کی ایجاد کا سہرا اہل یورپ کے سر ڈالا جاتا ہے اہم رول ادا کیا ہے۔ حالانکہ علم کیمیا کے مختلف عربی رسالے، عسکری ٹکنالوجی کی تالیفات، اکتشافی علوم کی مقبول عام کتابیں حتیٰ کہ عام تاریخی مصادر میں بھی مختلف کیمیائی علوم سے مسلمانوں کی گہری واقفیت اور تیرہویں صدی سے بارود کے فنکارانہ استعمال کی شہادت قائم ہوتی ہے۔ فواد سیزگن اور احمد الحسن کی تحریروں نے اس بے اصل مغربی پروپیگنڈے کا بڑی خوبصورتی سے پردہ چاک کیا ہے۔

یہ خیال کہ مغرب کی اکتشافی تحریک کی بنا میں مسلمانوں کی نہیں بلکہ اہل یونان کی کارفرمائی ہے بڑی حد تک فرانسس بیکن کے متعصب ذہن کی پیداوار ہے جس نے اپنی پرشور تحریروں کے ذریعہ پیٹرارک کے مردہ اسطورہ میں پھر سے نئی جان ڈال دی۔ اپنی کتاب *Novum Organum* میں بیکن نے بڑی علمی بے حیائی سے اس بات کا اعلان کیا کہ ''ہمارے

پاس جو سائنسی علوم ہیں وہ بنیادی طور پر اہل یونان سے اخذ کردہ ہیں جہاں تک ان پر رومی، عربی یا دوسرے جدید مصنّفین کے اضافے کا سوال ہے تو یہ بہت کم ہے اور اس کی کچھ زیادہ اہمیت بھی نہیں۔ ایسا اس لیے کہ یہ سب فی نفسہٖ یونانیوں سے ہی مستعار کردہ ہیں۔''[۱۶۴]

بیکن کوئی عام آدمی نہ تھے۔ اپنی واعظانہ سائنسی تحریروں کے سبب وہ مغرب کے نئے تاریخی رزمیہ کے بانی مبانی کی حیثیت سے سامنے آئے تھے۔ آنے والے دنوں میں اور خاص طور پر استعمار کی صدیوں میں انھیں جدید مغرب بلکہ کہہ لیجئے کہ جدید سائنسی اور مشاہداتی منہج کے بانی کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ گو کہ اس بات کی حقیقت تاریخی طور پر ایک سیاسی پروپیگنڈہ اور متعصّبانہ فریب نظر سے زیادہ نہ تھی کہ فرانسس بیکن سے پہلے نہ صرف یہ کہ مشاہداتی منہج کے نظریہ ساز بلکہ اس پر پوری طرح عامل مشاہیر اہل فن کی خود مغرب کے اندر کمی نہ تھی، لیکن بیکن ایک ایسے وقت میں مغربی رزمیہ کا بگل بجا رہے تھے جب آنے والے دنوں میں مغرب کی مشرق پر سبقت کے آثار صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ سو تمام تاریخی حقائق سے قطع نظر نہ صرف یہ کہ ان کا موقف قبول عام اختیار کر گیا بلکہ خود انھیں عہد جدید کے باوا آدم کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

LIBER TERTIVS. 87

VERA OCVLI DESCRIPTIO

کتاب المناظر
پہلا مکمل لاطینی ترجمہ (۱۵۷۲ء)
وہ صفحہ جس میں آنکھوں کی ساخت کی بابت کلام کیا گیا ہے۔

تاریخ کے ایک طالب علم کے لیے یہ بات سخت حیرت و استعجاب کا باعث ہے کہ *Novum Organum* اور *Advancement of Learning* میں آخر ایسا کون سا نیا مشاہداتی منہج ہے جس سے خود اہل مغرب اس سے پہلے واقف نہ تھے۔[۱۶۵] پھر بھی مغرب کے مغنیوں کا یہ کہنا ہے کہ *Novum Organum* جیسی کوئی اور دوسری تصنیف نہیں جو فکر و نظر میں اتنے بڑے انقلاب کا باعث ہوئی ہو، جس نے تعصّبات کے اس طرح پردے چاک کیے ہوں اور اتنے بہت سے نئے خیالات سے متعارف کرایا ہو۔[۱۶۶] جو کوئی بھی مغرب کی علمی، تہذیبی اور سائنسی تاریخ کا کھلی آنکھوں سے مطالعہ کرے گا اس کے لیے مشاہداتی منہج کے مغربی متاخرین مثلاً روجر بیکن، کوپرنکس، لیونارڈو ڈونچی، ویزالیس اور خود ان کے معاصرین میں

45

Ein New vnd Wol gegründt Rechenbuch/auff den Linien vñ Ziffern/ sampt der Welschen Practic vnd allerley vortheilen/neben der extraction Radicum, vñ von den Proportionen/mit vilen lustigen Fragen vñ Auffgaben/rc. Deßgleichen ein volkomner Bericht der Regel Falsi mit newen Inventionibus/Demonstrationibus/ vnd vortheilen/so biß auher für vnmüglich geschetzt/gebessert/dergleichen noch nie an tag kommen. Vnd dann von der Geometria/wie man mancherley Felder vnd ebne/auch allerley Corpora/Regularia vnd Irregularia/messen/Aream finden vñ rechnen sol. Alles durch Simon Jacob von Coburg/Bürger vnd Rechenmeister zu Franckfurt am Main/mit fleiß zusammen getragen/vnd jetzt erstmals getruckt.

Mit Röm. Keyser. Mt. Gnad vnd Freiheit nicht nachzutrucken.
Getruckt zu Franckfurt am Mayn/1565.

مغربی مصنف کی پہلی طبع زاد ارتھمیٹک کتاب

مصنف: سائمن جیکب متوفیٰ ۱۵۶۴ء

گلیلیو، کیپلر کو نظر انداز کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوگا۔ لیکن بات جب تاریخ کے مغربی رزمیہ کی ہو تو پھر مغرب کے مغنی اپنی اس تاریخ سے انکار میں ذرّہ برابر تکلف کا مظاہرہ نہیں کرتے جو مسلمانوں کے علوم و اکتساب سے مملو ہو اور جس سے یہ خطرہ ہو مبادا اس کے ذکر سے نئی تہذیب کے قائد اور مؤسس کی حیثیت سے ان کی حیثیت پر سوالیہ نشان لگ جائے گا۔ لہٰذا ان کے لیے عافیت اسی بات میں تھی کہ وہ فرانسس بیکن کی شکل میں ایک ایسے بت کی تعمیر کریں جسے جدید تہذیب کے بانی مبانی، سائنسی طرز فکر کے مؤسس اور مشاہداتی و تجرباتی منہج کے صانع کی حیثیت سے قبول کرلیا جائے اور جس کے بارے میں یہ خیال عام ہو کہ ''بھلا وہ کون ہوگا جس کے ذہن میں لارڈ بیکن کا نام سنتے ہی ایک عبقری شخص کا تصور نہ آجاتا ہو، جس کا ادب میں سب سے اعلیٰ مقام ہے جس کے ایجادات و انکشافات انتہائی گہرے اور جس کا انسانی زندگی کا مشاہدہ انتہائی اعلیٰ اور ممتاز ہے۔''[۱۶۷]

جیسا کہ ہم نے عرض کیا سترہویں صدی مغرب میں نئے عزم و اعتماد کی صدی تھی۔ یہ وہ عبوری ماہ و سال تھے جب مغرب اپنی تاریخ میں پہلی بار اسلامی مشرق کے مقابل اور حریف کے طور پر سامنے آرہا تھا۔ ادھر مشرق کی تینوں بڑی مسلم سلطنتیں عثمانی ترک، صفوی ایران اور مغل ہند معاشی زوال کی راہ پر گامزن تھے۔ اب جو مسلمانوں کی عالمی اجارہ داری میں مغرب نے اپنی شرکت کا احساس دلایا تو تاریخ کی ان تہی دست مغربی اقوام کو جن کے کشکول ماضی کے کارناموں سے خالی اور مسلمانوں کے اکتشافی علوم سے مملو تھے انھیں ایک نئی تہذیبی شناخت کی تشکیل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ نئی شناخت تاریخ کے ایک نئے رزمیہ اور ایک نئے اسطورے کی تشکیل کے بغیر ممکن نہ تھی۔ فرانسس بیکن ہی نہیں جنھیں نئے مغربی رزمیہ یا Scientific Revolution کے بانی مبانی کی حیثیت حاصل ہے بلکہ اس عہد کے دوسرے اساطین نے بھی اپنی تصنیفات میں اس تصور کو عام کرنے کی کوشش کی کہ ان کے ہاں علم و فن کی ایک ایسی صبح طلوع ہوئی ہے جس کی نظیر اب تک کی انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ نئی صبح کی یہ لے اس قدر غلغلہ انگیز ثابت ہوئی کہ بیکن نے اپنی کتاب کا نام *New*

Rechenbuch Simon Jacobs/

Soliditas

Letzlich aber soltu wissen/ daß du Radicem cubicam sehr nahe finden köndest in 100. oder 1000. theiln / nur nach deinem gefallen/ Als wañ du Radicem cubicam haben woltest auß 11. so mustu vor 11.allemal 3.mal so vil nulla setzen als der Nenner deß Bruchs (dessen ersten Figur bey der lincken hand allemal 1. seyn sol) nulla hat / als ob du den Radicem auß 11. in eitel 1000. theiln finden woltest/so müstestu für 11.setzē 000000000.wirt 11000000000. darauß extrahier Radicem cubicam / den kommenden Radicem diuidier

علومِ عربیہ کے شاگرد جیکب نے مغرب کو مربع کے رقبے کی پیمائش سے واقف کرایا۔

Atlantis اور *New Organon* رکھا۔ کیپلر نے *New Astronomy* کی تخلیق کا دعویٰ کیا اور گلیلیو نے اپنی کتاب کا نام *Two New Sciences* رکھنا پسند کیا۔ Thomas Hobbes نے اس خیال کا اظہار کیا کہ کوپرنکس، گلیلیو اور ولیم ہاروے کو نئی حسیت کا ترجمان سمجھنا چاہیے کہ بقول ان کے ان حضرات سے پہلے فطری سائنس میں کسی مسلمہ یا کلیہ کا وجود نہیں تھا، جو کچھ تھا اس کی حیثیت لوگوں کے شخصی تجربات سے زیادہ نہ تھی۔[۱۶۸] بیکن نے جا بجا اپنی تحریروں میں اس تجاہلانہ اعتماد کا اظہار کیا کہ وہ جس منہجِ علمی کی لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ قدمائے یونان بلکہ علمائے روم وعرب سے بھی مختلف ہے اور یہ کہ اب تک اس منہج پر نہ تو کوئی عمل پیرا رہا ہے اور نہ ہی اس سے اب تک کسی کو آگہی تھی۔

بیکن ایک مغربی رزمیہ کی تیاری میں بنیادی علمی دیانت کا دامن بھی چھوڑ بیٹھے یا یہ کہئے کہ ان کے ہاں کسی ایسے مزاحم عامل کے لیے سرے سے کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ انھوں نے اس بات کا برملا اعلان کیا کہ انسانی تاریخ میں تین زمانے ایسے گزرے ہیں جب علوم وفنون کو غیر معمولی عروج حاصل ہوا۔ پہلا زمانہ اہلِ یونان کا تھا، دوسرا اہلِ روم کا اور تیسرا خود ان کا اپنا ہے۔ رہی مسلمانوں کی ہزار سالہ سائنسی تفوق کی تاریخ تو یہ اس لیے ناقابلِ اعتناء ٹھہریں کہ بقول بیکن، انھوں نے علوم کی سرپرستی کے بجائے اس کی سرکوبی کا کام انجام دیا ہے۔[۱۶۹] بیکن نے اپنے عہد کو یونان وروم کے مقابلے میں افضل قرار دینے کے لیے اس تجرباتی اور مشاہداتی منہج کا حیلہ تراشا جس کی کارفرمائی انھیں تاریخ میں اس سے پہلے کہیں اور نظر نہیں آئی، یعنی ایک ایسا منہج جس کی بنیاد تجربے پر رکھی گئی ہو اور جہاں غلط نتائج کی تصحیح کی گنجائش موجود ہو۔[۱۷۰]

بیکن کے اس شورانگیز پروپیگنڈے نے مغرب کو اگر ایک طرف نئے اعتماد سے سرفراز کیا تو دوسری طرف نئے بازار کے متلاشی اور نئی شناخت کے تشنہ لبوں کو اس مکروہ پروپیگنڈے میں بڑی عافیت نظر آئی۔ آنے والے دنوں میں تاریخ کے اس نوتراشیدہ اسطورہ کی لے میں لے ملانے والوں کی کمی نہ رہی۔[۱۷۱] سترہویں صدی کے آخر تک تہذیب کی تقلیبِ جدید کا یہ شور

اتنا بڑھا کہ ولیم ٹیمپل اور ولیم ووٹن جیسے اہل فکر کے مابین بحث اس رخ پر چل نکلی کہ نئے مؤسسین کی اہمیت اپنی جگہ عہد قدیم کے مفکرین کی اہمیت سے بھی یکسر انکار کرنا مناسب نہیں۔ قدیم و جدید کی یہ بحث بالآخر ایک مفروضہ عہد قدیم (Antiquity) کی تشکیل اور کسی حد تک اس کی مدح پر منتج ہوئی۔[۱۷] اس طرح بڑی خوبصورتی اور عیاری کے ساتھ قدیم وجدید کے درمیان کی پوری تاریخ پر عہد تاریک کا پردہ ڈال دیا گیا۔ روجر بیکن سے لے کر فرانسس بیکن تک کوئی چار صدیوں کی علمی تاریخ کچھ اس طرح ہمارے ذہن سے محو کر دی گئی کہ ہم عرب اساتذہ کے پروردہ روجر بیکن کو اکتشافی منہج اور جدید مغرب کا بانی مبانی سمجھنے کے بجائے ان کے ہم نام فرانسس بیکن کو اس منصب جلیل کا سزاوار سمجھنے لگے۔

مغرب کے تراشیدہ عہد تاریک کی طویل صدیوں میں جب مشرق اور خاص طور پر عالم اسلام کی تجلّیوں سے یورپ میں زندگی کی ایک نئی صبح پیدا ہو رہی تھی کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ آنے والے دنوں میں اخذ و اکتساب کے اس عمل کو عہد تاریک کا نام دیا جا سکے گا۔ پٹرارک نے جب پہلی مرتبہ اطالوی قوم پرستی اور جرمن دشمنی کے سبب عہد تاریک کا اسطورہ تخلیق کرنے کی کوشش کی، اس وقت اس فسانے کو مغربی تاریخ نگاری میں کچھ زیادہ اہمیت نہ مل سکی۔ البتہ آگے چل کر جب Enlightenment یا تحریک تجلی کا اسطورہ تخلیق ہوا تو اس کے بالمقابل عہد تاریک کے فسانے نے فلسفیانہ اور نظری معرکہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ عہد تجلی کی اصطلاح کے پیچھے بھی دراصل اسی رزمیہ کی کارفرمائی تھی جس کے مطابق مغربی اقوام کا فطری تاریخی رول عالمی سیادت کا مرکزی اسٹیج قرار پاتا ہے۔ حالانکہ تاریخی تحلیل وتجزیہ اس بات کے ناقابل تردید شواہد فراہم کرتے ہیں کہ خود یورپ میں مزعومہ عہد تجلی کا ظہور عالم اسلام سے راست اکتساب کے نتیجہ میں ہوا۔ گوکہ یہ موضوع تفصیلی بحث کا طالب ہے، ازراہِ تذکرہ یہاں شاید اس قدر اشارہ کر دینا کافی ہو کہ مغرب کا عہد تجلیِ انسان کی جس خود اعتمادی اور تلاش حق سے عبارت ہے، یہ چیزیں مغرب کو اسی تہذیب سے حاصل ہوئی ہے جس کی طرف ناسپاسی کے لیے اس نے عہد تاریک کی اصطلاح وضع کر رکھی ہے۔ مغربی مفکرین اس بات سے ناآگاہ نہیں کہ مغرب میں بارہویں صدی کے نشاۃ ثانیہ کے دوران اندلس اور صقلیہ کے مراکز میں سائنسی کتب کے علاوہ فکری اور ادبی کتب کے تراجم بھی ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ بالکل ابتدائی ایام میں قرآن مجید کے لاطینی ترجمہ نے غالب تہذیب کے بنیادی وثیقہ کی حیثیت سے عالم عیسائیت کو ایک طرب انگیز مگر محتاط معاندانہ کیفیت سے دوچار کر رکھا تھا۔ قرآن مجید کے سلسلے میں حزم واحتیاط کا یہ رویہ برقرار رہا، البتہ قرآنی دائرۂ فکر سے مملوو کتابیں جو اکتشافی علوم، ادب اور فلسفہ سے متعلق تھیں مسلسل عہد تاریک کے مغرب کو اپنی تجلّیوں سے منور کرتی رہیں۔ مثال کے طور پر ابن طفیل (ابوبصیر) کی مشہور زمانہ تالیف حی ابن یقظان کو لیجئے جس کی اشاعت کا زمانہ ۱۱۶۰ء ہے۔ ۱۳۴۹ء میں اس کتاب کا عبرانی ترجمہ شائع ہوا اور پندرہویں صدی کے نصف آخر میں اس کے لاطینی ترجمہ کی اشاعت ہوئی۔ حی کی یہ تمثیلی کہانی جس میں وہ مشاہدۂ کائنات کے ذریعے طلب حق کی راہ پر گامزن ہے، مغربی ذہن کو خود اعتمادی سے متصف کرنے میں اہم رول ادا کرتی رہی ہے۔ اس کتاب کی

مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۶۷۱ء میں ایڈورڈ پوکوکے (Edward Pococae) کے ہاتھوں ایک نیا مقبول عام لاطینی ترجمہ شائع ہوا اور چند سال بعد ۱۶۷۴ء میں جارج کیتھ (George Keith) نے اسے انگریزی زبان میں منتقل کیا۔ اس ایک کتاب نے مغربی ذہن کو جتنا متاثر کیا ہے یہی اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے کہ مغرب کی نئی تقلیب فکری میں مشرق کا حصہ رسدی کتنا زیادہ ہے۔ Defoe کی مشہور زمانہ تالیف (۱۷۱۹ء) Robinson Crusoe پلاٹ اور دائرۂ فکر ہر دو سطح پر ابن طفیل کا ہی چربہ ہے۔ Defoe کی اس ناول نے وسو اور اس قبیل کے عہد تجلّی کے دوسرے دانشوروں کی تقلیب فکری میں کلیدی رول ادا کیا ہے جس کا اعتراف خود روسو کو بھی ہے۔

ابن مسویہ کی قرابادین جو لاطینی یوروپ میں ادویات کی تیاری میں اہم رول ادا کرتی رہی ہے

یونان کو جدید مغرب کے منبع و ماخذ کی حیثیت سے دیکھنا مغربی رزمیہ کا ایک ایسا لازمہ ہے جس کے بغیر ان کے جملہ تہذیبی اساطیر کی تشکیل ممکن نہیں۔ اوّل تو یہ خیال ہی لغو ہے کہ یورپ تاریخی، جغرافیائی اور تہذیبی اعتبار سے مشرق کے علی الرغم ایک علیحدہ وجود کا حامل رہا ہے۔ روم کی جاہ وسطوت کا عہد ہو یا عہدِ ظلمت کے فراموش کردہ مستور ایام یا پھر نشاۃ ثانیہ اور عہد تجلّی کے خوش کن ایام ہی کیوں نہ ہوں، یورپ ہمیشہ سے مشرق کا دست نگر اور افریقہ کے سواحلی علاقوں سے مربوط رہا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ مغرب کی تہذیبی بالادستی کے لیے بنائے گئے اسطورۂ یونان کو بغیر کسی تحلیل وتجزیہ کے قبول کر لیا جائے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس لغو اسطورہ کے مؤسسین جن میں کارل مارکس، ورنر سومبارٹ، ایمل درکھیم، جارج سمل اور میکس ویبر جیسے نام شامل ہیں، انھیں علم و تحقیق کی دنیا میں اب بھی احترام اور اعتبار کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مغرب کے یہ تمام مغنی اپنے تحقیق وتجزیہ کے باہمی اختلاف کے باوجود اس مفروضہ پر متفق ہیں کہ مغرب کی بالادستی دراصل مغربی ذہن کی اپنی خصوصی ساخت، جس میں عقل واکتشاف کو خصوصی مقام حاصل ہے، کے سبب ہے۔ اس جرم سے اسپنگلر اور ٹوئن بی جیسے بظاہر معروضی مورخین کے دامن بھی نا آلودہ نہیں۔[۱۷۳]

مغربی مفکرین اور تجزیہ نگاروں کی غالب اکثریت اس اسطورے کے زیر اثر پروان چڑھی ہے جس کے مطابق مغرب کا موجودہ تفوق اس کے عقلی رویے اور اکتشافی روح کے سبب ہے اور جس کے خمیر سے اس خیال کے مطابق مغرب کی موجودہ تہذیب منتج ہوئی ہے۔ یہ ایک پرفریب پروپیگنڈہ ہے جو پچھلے ڈیڑھ دوسو سالوں سے کچھ اس شدت سے جاری ہے کہ مغرب تو مغرب اہل مشرق کے بظاہر بیدار مغز اور روشن خیال مفکرین بھی اس خیال کی صداقت پر ایمان لے آئے ہیں۔ مغرب میں ان کتابوں کا کوئی واقعی احاطہ مشکل ہے جو مغربی کرشمہ کو ایک مسلمہ نظریہ کے طور پر پیش کرنے کے لیے بظاہر علمی انداز سے تالیف کی گئی ہیں، البتہ مارکس ویبر سے لے کر موجودہ عہد کے مصنّفین میں Lynn White Jr.، John Hall، Machael Mann اپنی پرزور تحریروں کے سبب مغرب کے مغنّیوں میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ دوسری طرف اس بے مہابا پروپیگنڈے نے علمی حلقوں میں ایک طرح کی مزاحمت کو بھی جنم دیا ہے۔ فی زمانہ مغرب میں ایسے محققین کی ایک نسل وجود میں آگئی ہے جو مغربی رزمیہ کو علمی بنیادوں پر چیلنج کر رہی ہے۔ ان مفکرین میں جارج صلیبہ اور جارج مقدیسی جیسے محققین بھی ہیں اور جیک گوڈی اور ہابسن جیسے تجزیہ نگار بھی اور Blaut جیسے revisionist بھی، جن کی چشم کشا تصنیف *The Colonizer's Model of the World* نے بہتوں کو تحلیل و تجزیہ کی نئی راہ سجھائی ہے۔ بلوٹ نے بڑی کامیابی کے ساتھ مغرب کے تراشیدہ تاریخی اساطیر اور فریب نظر کا پردہ چاک کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے، جیسا کہ MolefiKete Asante نے لکھا ہے کہ مغرب کے یہ مغنی:

> ''دراصل جہل مرکب کے غرور میں مبتلا ہیں، وہ اس بات سے قطعی ناآگاہ ہیں کہ وہ کس بات سے ناآگاہ ہیں لیکن اس کے باوجود وہ گفتگو کچھ اس انداز سے کرتے ہیں گویا وہ اس بات سے خوب واقف ہوں کہ ہم لوگوں کو کس بات پر آگاہ ہونا چاہیے۔''[۱۷۴]

فریب میں بڑی قوت ہے۔ مغربی رزمیہ کی تشکیل یقینا وہ پہلا موقع نہیں تھا جب اساطیر کے ہاتھوں حقائق کی شکست ہوئی ہو، ہاں یہ فرق ضرور تھا کہ اس نئے رزمیہ کی تشکیل اوہام وخرافات کے بجائے بظاہر سائنسی طرز فکر، مشاہداتی منہج اور تحلیل و تجزیہ پر رکھی گئی تھی۔ مثال کے طور پر کارل مارکس کو لیجیے جو تاریخ کے معروضی مطالعہ کے سبب اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ دنیا فیوڈل ازم کے بعد سرمایہ داری اور پھر سوشل ازم کی منطقی منزل تک جا پہنچے گی۔ تاریخ کا یہ عظیم رزمیہ جسے مارکس انسانی تاریخ کے حتمی سفر کے طور پر پیش کر رہے تھے اس کا جائے وقوع مغرب اور صرف مغرب تھا۔ اسی طرح ٹوئن بی جو دنیا کی مختلف اکیس تہذیبوں کے گہرے مطالعہ کا شرف حاصل کر چکے تھے ان کے نزدیک بھی انسانی تہذیب کا رأس المعرکہ مستقبل کے مغرب میں پیش آنا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکی بالادستی کے سبب مغرب کے جغرافیائی تصور میں وسعت ہوگئی۔ دنیا کو آئینہ دکھانے کا کام جو اب تک یورپ سے کیا جا رہا تھا اب اس میں امریکہ کو بھی خصوصی

فلکیات کے موضوع پر ٹائیکو براہی کی وہ تصنیف جس نے مغرب کو نئے اعتماد سے سرشار کیا اور جس کے سبب مورل کواڈرینٹ کا صدیوں پرانا آلہ اس کے نام سے مشہور ہوگیا۔

اعزازات کے ساتھ شامل کرلیا گیا۔[۱۷۵] کہنے والے یہاں تک کہنے لگے کہ صنعتی انقلاب جس نے مغرب کی قسمت بدل ڈالی دراصل ایک تہذیبی اور سماجی عمل تھا اور یہ کہ جو قومیں دنیا میں آگے بڑھ گئیں وہ وہی قومیں تھیں جنھوں نے تہذیبی طور پر انگلستان کا کامیابی کے ساتھ تتبع کیا تھا۔[۱۷۶] اس خیال کو تاریخ نگاری میں قبولیت مل جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کی ہمہ جہت ترقی کے لیے مغربی ثقافت اور مغربی طرزِ فکر کو لازمی سمجھا جانے لگا۔ دنیا کی وہ سادہ لوح اقوام جو کسی آزادانہ تاریخی وجدان سے خالی تھیں یا مغربی اساطیر کی اسیر ہوگئی تھیں، خوشحالی اور کامرانی کی تلاش میں پیرویٔ تہذیبِ مغرب کی راہ پر چل نکلیں۔ ایک سرابِ مسلسل ان کا مقدر بن گیا۔

مغرب نے صرف تاریخ کی تمسیخ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جغرافیائی حقائق کو بھی اپنی منشا کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی، جس کے سبب مشاہدین کے لیے دنیا اپنی اصل شکل میں نظر آنا مشکل ہوگئی۔ مرکیٹر خریطہ نگاری نہ صرف یہ کہ مغرب کو دنیا کے مرکز پر لے آئی بلکہ یورپ کا چھوٹا سا خطہ ارضی وسیع و عریض براعظموں کے مقابلے میں کہیں نمایاں دکھائی دینے لگا۔[۱۷۷] کہنے والوں نے سچ کہا ہے کہ اس طرح مغرب نے یورپ نام کے ایک فرضی براعظم کی خیالی تصویر کشی کے لیے راستہ ہموار کرلیا۔[۱۷۸] اس تصور کے مطابق یورپ کا نسبتاً چھوٹا سا جزیرہ نما (peninsula) جس کی علیحدہ کوئی جغرافیائی حیثیت نہ تھی براعظم قرار پایا جبکہ ہندوستان کا وسیع و عریض خطہ محض برصغیر (sub-continent) کا درجہ پا سکا۔

جن لوگوں کی عالمی تاریخ اور معیشت کے عہد بہ عہد ارتقاء پر نظر ہے وہ اس بات سے یقیناً ناآگاہ نہیں کہ انیسویں صدی کے طلوع سے پہلے عالمی معیشت میں یورپ کا کوئی قابلِ ذکر مقام نہ تھا۔ ہاں عالم اسلام کے علاوہ اگر کوئی قابلِ ذکر معیشت تھی تو وہ چین کی تھی جو عالمی تجارت میں اپنی شرکت کے سبب احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سترہویں صدی کے

ایک جرمن مفکر Leibniz کے بیان پر اگر اعتبار کیا جائے تو ''تقریباً ہر چیز جو خیرہ کن اور خوبصورت ہوتی ہے شرقِ ہند (East Indies) سے آتی ہے۔ واقف کاروں کا کہنا ہے کہ پوری دنیا میں چین کے مقابلے کی تجارت کہیں اور نہیں ہے''[۱۷۹] اور اگر اٹھارہویں صدی کے ایک فرانسیسی مبلغ Father du Halde کو قابل اعتبار سمجھا جائے تو ''صرف ملک چین میں جتنے وسیع پیمانے پر تجارت ہوتی ہے اس کا مقابلہ تمام یوروپ کی مشترکہ تجارت نہیں کر سکتی۔''[۱۸۰]

اس کے برعکس یورپ میں نہ تو مشرق کی سی معاشی چہل پہل تھی نہ ٹکنالوجی میں وہ انقلاب پیدا ہوا تھا جس کا مشاہدہ انیسویں اور بیسویں صدی میں ہونے لگا اور نہ ہی فطری وسائل اور اسٹریٹجک اعتبار سے یہ خطہ اہمیت کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ سولہویں صدی کے ابھرتے پرتگال یا سترہویں صدی کی ولندیزی ریاست یا اٹھارویں صدی کے تاج برطانیہ کا مقابلہ کسی بھی اعتبار سے اس عہد کی چار بڑی سیاسی اور معاشی قوت جن میں تین مسلم ریاستیں مغل ہندوستان، صفوی ایران، عثمانی ترک اور چوتھی چینی منگ یا قنگ ہے، سے نہیں کیا جا سکتا۔

سولہویں صدی میں دنیا کے بڑے شہروں کی آبادی پر ایک نگاہ ڈالنے سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مشرق اور خاص طور پر عالم اسلام کے بڑے شہروں کے مقابلے میں مغرب کے تہذیبی شہروں کی کچھ زیادہ اہمیت نہ تھی۔ مثال کے طور پر استنبول جسے اس وقت عالمی دارالحکومت کی حیثیت حاصل تھی ساٹھ لاکھ کی آبادی پر مشتمل تھا۔ اس سے کسی قدر کم بیجنگ کی آبادی تھی۔ ہندوستان کے تجارتی شہر کالی کٹ کی آبادی پانچ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی جبکہ قاہرہ اس سے قدرے کم ساڑھے چار لاکھ لوگوں کا مسکن تھا۔ اس کے مقابلے میں اس وقت پیرس کی آبادی محض سوا لاکھ تھی[۱۸۱] گویا جب مغرب نے عالمی منظرنامے پر اپنے وجود کا احساس دلانا شروع کیا تھا اس وقت بحیرۂ روم کی دوسری جانب شمالی افریقہ کی مسلم سرزمین مدنیت کے اعلیٰ ترین مظاہر سے معمور تھی۔ اہل مغرب کے دل و دماغ پر مشرق کی عظمت و سطوت کا یہ تاثر انیسویں صدی کی ابتدا تک قائم رہا حتیٰ کہ اٹھارویں صدی کا صنعتی انقلاب بھی مشرقی رزمیہ کے اس مجموعی تاثر کو زائل کرنے میں ناکام رہا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اٹھارویں صدی میں مغربی مفکرین کو اس بات کا اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ آگے چل کر مغرب کا صنعتی انقلاب عالمی منظرنامے کو اس کے حق میں اس حد تک تبدیل کر دے گا۔ *The Wealth of Nations* جو ۱۷۷۶ء کی تالیف ہے، اس کے صفحات نہ صرف یہ کہ صنعتی انقلاب کی آہٹ سے خالی ہیں بلکہ آدم اسمتھ کی اس کتاب میں اس بات کا برملا اعتراف موجود ہے کہ یورپ کے کسی بھی خطہ کے مقابلہ میں چین کہیں زیادہ دولت مند ملک ہے۔

البتہ آگے چل کر انسانی تاریخ کو کلیتاً مغربی رزمیہ کے طور پر دیکھنے کی لَے اتنی بلند ہوئی کہ مغربی مفکرین نے دنیا کو مختلف تہذیبی خانوں میں تقسیم کر ڈالا۔ کوئی غیر مہذب، کوئی وحشی اور کوئی جانوروں کے مماثل قرار پایا، جبکہ خود مغرب کے سفید فام انسان نے اپنے آپ کو تہذیب کے راس المہام پر متمکن جانا۔ پہلی دنیا (First World) کا مقام برطانیہ اور مغرب کے دوسرے ممالک بشمول امریکہ کو عطا ہوا۔ دوسری دنیا (Second World) کا لقب گندمی مائل مشرق کی ان اقوام کو عطا ہوا

METHODUS
INVENIENDI
LINEAS CURVAS
Maximi Minimive proprietate gaudentes,
SIVE
SOLUTIO
PROBLEMATIS ISOPERIMETRICI
LATISSIMO SENSU ACCEPTI.
AUCTORE
LEONHARDO EULERO,
Professore Regio, & Academiæ Imperialis Scientiarum Petropolitanæ Socio.

LAUSANNÆ & GENEVÆ,
Apud Marcum-Michaelem Bousquet & Socios.
MDCCXLIV.
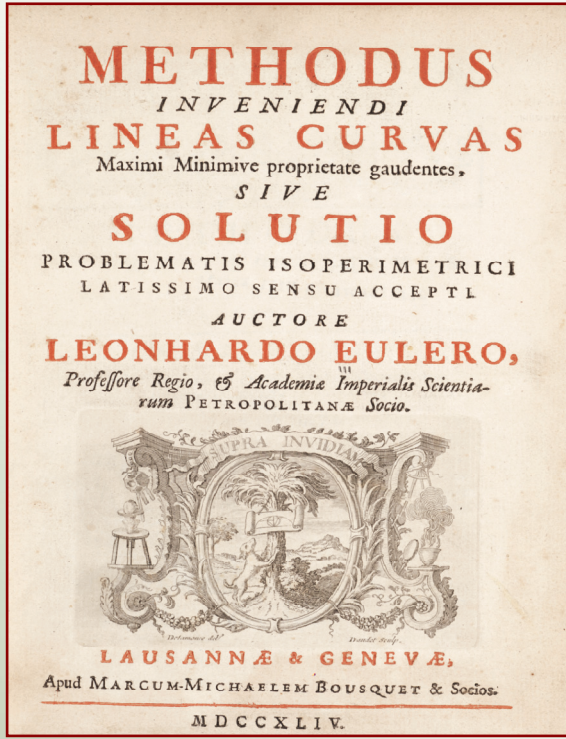
آڑی ترچھی لکیروں کی پیمائش سکھانے والی کتاب
مصنف: لیونہارڈ ڈویلر (۱۷۸۳ء۔۱۷۰۷ء)

جن کی عظمت و جلالت کی تاریخ ابھی زیادہ پرانی نہیں ہوئی تھی مثلاً عثمانی ترک۔ تیسری دنیا (Third World) میں سیاہ فام نسلوں کے علاوہ ان تمام ممالک کو شامل سمجھا گیا جن کی سرزمینیں سفید فام اقوام کی ترک تازیوں کی زد میں تھیں۔ گو کہ اس تہذیبی زمرہ مندی کی کوئی عقلی اور سائنسی بنیاد نہ تھی، لیکن تیسری دنیا کے افلاس اور پسماندگی کا اس قدر زور و شور سے چرچا ہوا کہ خود تیسری دنیا کے اہلِ فکر بھی اس پروپیگنڈے کو امرِ واقعہ سمجھنے لگے۔ آبادی کی کثرت، وسائل کی فراوانی اور فطرت کے بے پایاں انعامات کے باوجود مفروضہ تیسری دنیا کے باشندے اپنے خطہ اور اپنی تہذیب کو اسی تھوپی گئی اصطلاح سے موسوم کرنے لگے۔ کہا گیا کہ پہلی دنیا کے سفید فام افراد کو خود فطرت نے اس قائدانہ مقام پر فائز کیا ہے۔ کہا گیا کہ سیاسی، جغرافیائی، نسلی اور ذہنی ہر اعتبار سے سفید فام اقوام قیادت کے لیے موزوں ترین ہے۔ مثال کے طور پر William Falconer نے اس خیال کا اظہار کیا کہ بہترین قسم کے انسان اس آب و ہوا میں تخلیق پاتے ہیں جو شمالی سرے پر واقع ہے اور یہ کوئی اور ملک نہیں بلکہ برطانیہ ہے۔[۱۸۲] انیسویں صدی کے وسط میں جب سفید فام اقوام کی استعمارانہ سرگرمیاں عروج پر تھیں برطانیہ میں سائنسی نسل پرستی (Scientific Racism) کے علم برداروں نے انسانی کھوپڑی کے سائز اور اس کی ساخت کی بنیاد پر ذہنی برتری کے فتوے جاری کرنا شروع کر دیے۔ کہا گیا کہ کھوپڑیوں کے سائنسی مطالعہ سے یہ بات مترشح ہوئی ہے کہ سفید فام انسان کی کھوپڑی کی ہڈی پتلی ہوتی ہے جس کے سبب دماغ کے لیے پھلنے پھولنے کی کہیں زیادہ گنجائش ہوتی ہے جبکہ سیاہ فام افراد کی کھوپڑی ہڈی کی موٹائی کے سبب دماغ کے نشوونما کے لیے کچھ زیادہ گنجائش نہیں چھوڑتی۔ یہی سبب ہے کہ سفید فام لوگ گرمی کے موسم میں جلد لو کے شکار ہو جاتے ہیں، جبکہ سیاہ فام لوگوں پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔[۱۸۳] سفید فام افراد کی فطری برتری کے ثبوت میں ایک اور نامحمود سائنسی حقیقت یہ بتائی گئی کہ اہلِ مشرق کے دماغ میں جو مشرقی لوب (Eastern Lobe) ہوتا ہے

وہ مسلسل وجدان، مذہب پسندی اور لاشعور کو مہمیز کرتا رہتا ہے جبکہ مغربیوں کے دماغ میں پائے جانے والے (Western Lobe) ویسٹرن لوب سے انسانی دماغ میں مسلسل عقل، سائنس اور شعور کے سوتے پھوٹتے رہتے ہیں۔[۱۸۴] سفید فام افراد کی تقدیس کا پروپیگنڈہ اس زور وشور سے ہوا اور اس نامحمود خیال کی کچھ اس طرح تبلیغ ہوئی کہ استعمار کی صدیوں میں بالعموم یہ سمجھا جانے لگا کہ سفید فام اقوام اور خاص طور پر Anglo-Saxon نسل میں یقیناً کوئی خاص بات ہے جس کے سبب اسے اقوام عالم پر غلبہ واستیلاء حاصل ہو گیا ہے اور اپنی اسی فطری فضیلت کے سبب وہ اس بات کا سزاوار ہے کہ وہ مشرق کی پسماندہ اقوام کو بزور بازو تہذیب آشنائی پر مجبور کرے۔[۱۸۵]

Vom Quadranten. 38

Hierauß folget ein gemein Regel/ also/ Wañ du die behaltene quotienten von beyden ständen gefunden von einander zeuhest/ bleibt dañ vberig 2.- so ist die höhe vnd die weyte beyder ständ gleich 2. ists ein zweytheil/ bleiben drey/ so ist die höhe ein drittheil.

Wie du messen solt die höhe eines Thurns auff einem Berg/ so du im Thal stehest. Cap. xix.

Nun wollen wir zeigen wie man eines jeden dings höh/ das auff einem Berg steht/ in einem thal messen sol. Zum ersten lug/ das du

K ij habst

فلکیاتی علوم اور آلہ مثلاً Quadrant کے عام ہو جانے سے اہل مغرب کے لیے ٹاوروں کی اونچائی معلوم کرنا ممکن ہو گیا۔
تصویر میں جیکب کوبل (۱۴۶۰۔ ۱۵۳۳) کی علمِ جومیٹری

انیسویں صدی میں پہلی بار مغربی رزمیہ میں مشرق کے سلسلہ میں عظمت وسطوت کی جگہ تحقیر وتضحیک نے لے لی۔ اب تک پٹرارک سے لے کر فرانسس بیکن تک اور پھر میشلے اور برخاردت سے لے کر مارکس اور میکس ویبر تک مشرق کی ناسپاسی کے سلسلے میں جو نامحمود جذبات پائے جاتے تھے وہ اچانک ایک منضبط فلسفہ اور مربوط اسطورہ کے طور پر ظاہر ہونے لگا۔ اہل مغرب نے اپنے آپ کو عالمی قیادت کا سزاوار بتانے کے لیے تاریخ نگاری، عمرانیات، فلسفہ، ادب حتیٰ کہ فطری سائنس جیسے معروضی علوم کو بھی اس کام پر لگا دیا۔ انتھروپولوجی، سوشیالوجی جیسے علوم پر ہی موقوف نہیں جو بنیادی طور پر سفید فام اقوام کی فطری عظمت کے قیام کے لیے وضع کیے گئے تھے[۱۸۶] بلکہ مارکس اور ویبر[۱۸۷] جیسے باہم مختلف مگر معروضی تجزیہ نگاروں نے بھی سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کو خالصتاً مغربی تہذیب کا وصف بتایا۔ مغرب کے مقابلہ میں Orient کے نام سے ایک ایسی فرضی دنیا کا تصور وضع ہوا جہاں بقول مارکس، ایشیائی طریقۂ پیداوار Asiatic mode of production نے خوشگوار تبدیلیوں کا راستہ روکے رکھا تھا تا آنکہ مغربی سرمایہ داری نے مشرق کو اس روایتی جمود سے نجات دلانے کے لیے اقدامات کیے۔

HIERONYMI CAR
DANI, PRÆSTANTISSIMI MATHE-
MATICI, PHILOSOPHI, AC MEDICI,
ARTIS MAGNÆ,
SIVE DE REGVLIS ALGEBRAICIS,
Lib. unus. Qui & totius operis de Arithmetica, quod
OPVS PERFECTVM
inscripsit, est in ordine Decimus.

HAbes in hoc libro, studiose Lector, Regulas Algebraicas (Itali, de la Cossa uocant) nouis adinuentionibus, ac demonstrationibus ab Authore ita locupletatas, ut pro pauculis antea uulgò tritis, iam septuaginta euaserint. Neque solum, ubi unus numerus alteri, aut duo uni, uerum etiam, ubi duo duobus, aut tres uni æquales fuerint, nodum explicant. Hunc aût librum ideo seorsim edere placuit, ut hoc abstrusissimo, & planè inexhausto totius Arithmeticæ thesauro in lucem eruto, & quasi in theatro quodam omnibus ad spectandum exposito, Lectores incitarentur, ut reliquos Operis Perfecti libros, qui per Tomos edentur, tanto auidius amplectantur, ac minore fastidio perdiscant.

یوروپ میں الجبرا کی باقاعدہ آمد اور اشاعت ۱۵۴۵ء

مارکس کا فہم تاریخ بنیادی طور پر اس مفروضہ سے غذا حاصل کرتا تھا کہ مغرب اپنی ارتقائی تاریخ میں مشرق سے ممتاز اور منفرد ہے کہ یہاں سرمایہ داری کے نمو و ارتقاء کے لیے وافر امکانات پائے جاتے ہیں، جبکہ ان کے بقول مشرق میں یہ امکانات معدوم ہیں۔ سو مارکس نے مشرق میں مداخلت کے لیے نظری جواز فراہم کیا۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو میں مغربی بورژوا طبقہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے تائیداً اور تحسیناً لکھا:

''(یہ لوگ) انتہائی وحشی اقوام کو بھی تہذیب سے آشنا کرتے ہیں۔۔۔ یہ تمام اقوام عالم کو بسا اوقات سخت تعذیب (حتیٰ کہ نسل کشی) کے ذریعہ اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ تہذیب سے آشنائی حاصل کریں۔ (یعنی مغربی بن جائیں) مختصراً یہ کہ مغربی بورژوا اپنی خواہشات کے عین مطابق اپنی دنیا تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔''[۱۸۸]

مغرب کے سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کے مقابلہ میں مارکس نے تحقیراً ایشیائی طریقۂ پیداوار کا تذکرہ کیا اور اس مفروضہ کی پرزور وکالت کی کہ چونکہ یہاں شخصی ملکیت اور طبقاتی کشمکش کا فقدان ہے اس لیے تاریخ کے فطری سفر یعنی feudalism سے سرمایہ داری اور بالآخر socialism تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں پایا جاتا۔ سو اگر مغرب نے خوابیدہ مشرق کو بزور بازو تاریخی سفر پر آمادہ نہ کیا تو مشرق ہمیشہ کے لیے اسی انجماد کا شکار رہ جائے گا۔ مغرب کے دوسرے مغنّیوں کی طرح چونکہ مارکس کے ہاں بھی تاریخ کا سفر مغرب سے شروع ہوتا اور مغربی اقوام کی قیادت میں مغرب میں ہی اپنے حتمی اور منطقی انجام کو پہنچتا ہے، اس لیے دنیا کو تہذیب سے روشناس کرانا بھی مغربی انسانوں کا فریضۂ منصبی قرار پاتا ہے۔ مشرق کے نظامِ جبر اور محوری و منجمد تاریخ کے برعکس مغرب کا انسان امّ التہذیب یعنی قدیم یونان کا پروردہ بتایا گیا[۱۸۹] جس سے یہ تاثر قائم ہوتا تھا کہ یونان سے روم، روم سے کرسٹنڈم پھر نشاۃ ثانیہ اور نشاۃ سے تحریک تجلّی اور پھر صنعتی انقلاب نے مغربی

انسان کو تاریخ کے ارتقائی سفر کی جانب گامزن کر رکھا ہے، جبکہ تہذیب سے نا آشنا خوابیدہ مشرق محوری نظام جبر کا تابع اضافی سرمایہ پیدا کرنے اور پھر اس سے وابستہ سماجی اور سیاسی انقلابات کے امکانات سے یکسر محروم ہے۔ مارکس کا یہ فہم تاریخ نہ صرف یہ کہ مغربی رزمیہ کا اسیر اور اس کے فریب نظر کا پیدا کردہ ہے بلکہ مشرق سے مکمل ناواقفیت اور عالمی تاریخ سے ان کی نا آشنائی کے سبب علمی گمرہی کا باعث بھی رہا ہے۔

مغرب میں اکتشافی ذہن کا بلوغ

مئی ۱۵۴۳ء کو نیورمبرگ میں کوپرنکس کی معرکۃ الآراء کتاب *On the Revolutions of the Heavenly Spheres* شائع ہوئی اور اسی کے اگلے مہینہ جون ۱۵۴۳ء میں اینڈریاز ویسیلیس نے بیصل کے شہر میں *One the Structure of Human Body* شائع کی۔ کوپرنکس کی کتاب اگر مطالعہ کائنات کے مشاہداتی منہج کا علامیہ تھی تو Vesalius کی کتاب انسانی جسم کے باریک بیں اور معروضی مطالعہ کی نقیب تھی۔ کوپرنکس نے اپنے متقدمین طوسی، بطروجی اور ابن شاطر سے اخذ واستفادے اور ان پر اپنے اضافے کے بعد مغرب میں پہلی مرتبہ مطالعۂ آفاق کی سائنسی بنیاد فراہم کی تھی اور اسی طرح Vasalius نے اپنے متقدمین جالینوس، ابن سینا، ابن نفیس وغیرہ کی تحریروں سے مہمیز پا کر مطالعہ انفس کا ایک وقیع مرقع دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ سولہویں صدی کے یہ ایام جسے ہم نے اہل مغرب کی خود اعتمادی کے ایام سے تعبیر کیا ہے، بڑے دوررس اثرات کے حامل تھے۔ اگر تاریخ میں کسی لمحہ کو مغرب کے عروج کے لیے فیصلہ کن قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ یہی لمحہ ہے جب آیت قرآنی سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿فصلت: ۵۳﴾ کی تعبیر اس مبیّن انداز سے ہمارے سامنے آئی۔ خدا کا وہ وعدہ پورا ہوا کہ نزول قرآن کے بعد اکتشافی ذہن کا کاررواں بالآخر ایک ایسی منزل پر جا پہنچے گا جہاں انفس وآفاق کی پوشیدہ نشانیوں کو سمجھنا نہ صرف یہ کہ عام انسانوں کے لیے ممکن ہو سکے گا بلکہ وہ انفس وآفاق کے اسرار سے باخبری کے نتیجہ میں خود کو ایک ایسی طرب انگیز کیفیت کے جلو میں پائیں گے جہاں وہ خود کو **انہ ھو الحق** کہنے پر مجبور پائیں گے۔ ان دو کتابوں کا تذکرہ تو ہم نے خصوصیت کے ساتھ علامتی طور پر کیا ہے ورنہ سولہویں صدی کے نصف آخر میں شائع ہونے والی مغرب کی بیشتر کتابوں پر نوعلمی اور سب کچھ جاننے کا احساس نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر Luca Pacioli کی *Everything about Arithmat*ic, *Geomatry and Proport*ion (1498) کے عنوان سے ہی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب میں نوآگہی کے نشہ نے ایک طرح کے دانشورانہ نودولتیا پن کو جنم دیا تھا۔ اسی اعتماد نے مغربی مصنّفین کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنی کتابوں کو *New Science* یا *New Organ*on کے طور پر پیش کریں جس سے یہ تاثر قائم ہو کہ وہ دراصل علوم کی نئی شاخوں کی بنا ڈال رہے ہیں۔

A TREATISE OF ALGEBRA, BOTH Historical and Practical.

SHEWING, The Original, Progress, and Advancement thereof, from time to time; and by what Steps it hath attained to the Heighth at which now it is.

With some Additional TREATISES,

I. Of the Cono-Cuneus; being a Body representing in part a Conus, in part a Cuneus.

II. Of Angular Sections; and other things relating thereunto, and to Trigonometry.

III. Of the Angle of Contact; with other things appertaining to the Composition of Magnitudes, the Inceptives of Magnitudes, and the Composition of Motions, with the Results thereof.

IV. Of Combinations, Alternations, and Aliquot Parts.

By JOHN WALLIS, D. D. Professor of Geometry in the University of Oxford; and a Member of the Royal Society, London.

LONDON: Printed by John Playford, for Richard Davis, Bookseller, in the University of OXFORD, M. DC. LXXXV.

یورپ میں علم الجبرا کی پہلی باقاعدہ تاریخ: مطبوعہ ۱۶۸۵ء

گزشتہ صفحات میں ہم اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ مغرب میں اکتشافی ذہن کا ہزار سالہ سفر گو کہ مسلمانوں کی راست اتباع اور تقلید میں جاری رہا لیکن خود اسلام کے سلسلہ میں اہل مغرب کا عمومی رویہ معاندانہ تھا۔ ایک غالب تہذیب کی حیثیت سے علومِ عربیہ یا اکتشافی علوم تو مغرب کے لیے ہمیشہ سے دلچسپی کا باعث رہے لیکن فی نفسہ جس کتاب نے اس تہذیب کو برپا کیا تھا اس کی طرف مغربی ذہن کے تحفظات کبھی بھی ختم نہ ہو سکے۔ دوسری طرف ایک ایسے مرحلے میں جب مغرب میں انه هو الحق کے نعرۂ سپردگی بلند ہونے کا وقت آیا اور جسے مغرب میں Enlightenment یا عہد تجلی سے موسوم کیا جاتا ہے اس وقت عالمی سیادت پر مسلمانوں کی گرفت مسلسل ڈھیلی پڑتی جارہی تھی بلکہ واشگاف الفاظ میں یہ کہہ لیجئے کہ جب مغرب انه هو الحق پکار اٹھنے کے قریب آپہنچا تھا تب مشرق میں اکتشافی ذہن پر نزاع کا عالم طاری تھا۔ ۱۵۸۰ء میں جسے ہم نے علامتی طور پر فہم تاریخ کے لیے منتخب کیا ہے استنبول میں تقی الدین کی عظیم الشان رصدگاہ منہدم کی جارہی تھی۔ سولہویں صدی کے شرق وغرب کو بیک وقت ایک وسیع اور غیر منقسم منظرنامے کے طور پر متصور کرنا ہمیں اس نکتہ سے بھی آگاہ کرتا ہے کہ اکتشافی تحریک کے ہزار سالہ سفر اور اس کی عالم گیر وسعت کے بعد جب تاریخ کو ایک فیصلہ کن رخ دینے کا وقت آیا تو حیرت انگیز طور پر اکتشافی تحریک کے فطری قائد اور رسالہ محمدی کے حاملین عالمی افق سے غائب ہو گئے۔ عالم اسلام میں اساطیری، غیر اکتشافی بلکہ غیر قرآنی اور توہماتی طرز فکر کا اس قدر غلبہ ہو گیا کہ خود مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی ہی قائم کردہ رصدگاہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اکتشافی ذہن کی موت عالم اسلام کے لیے ایک اندوہ ناک سانحہ تو تھی ہی مغرب کی ابھرتی اکتشافی تحریک بھی اس کے مضر اثرات سے نہ بچ سکی۔ اب تک مغرب خود کو مشرق کے آئینہ میں دیکھتا آیا تھا۔ مشرق کے مقابلہ میں مغرب کی حنابندی کا کام ہوتا رہا تھا۔ ادب ہو یا فلسفہ، اکتشافی علوم ہوں یا تہذیبی زندگی کے مظاہر مغرب نے اپنی تزئین کاری میں ہمیشہ اسلامی مشرق کو مقابل اور حریف کے طور پر ہی سہی اپنے سامنے رکھا تھا۔

اب مشرق کے اچانک زوال سے مغرب کے لیے بھی ایک نظری بحران کی صورت حال پیدا ہوگئی۔

بیم ورجا کے اس نازک دور اہے پر جب اسلامی مشرق قیادت کے افق سے محو ہو چکا تھا اور مغرب ایک نئی تقلیب کے دردزہ میں مبتلا تھا، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اسے اہل کلیسا کا بروقت تعاون ملتا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ **انہ ھو الحق** کی صدائے خداشناس سے مغرب کی وادیاں گونج اٹھتیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، کیا عجب کہ خود عیسائیت کی تطہیر و اصلاح کا سامان بھی فراہم ہو جاتا۔ لیکن ہوا یہ کہ اس اکتشافی مہم کو اربابِ کلیسا کا تعاون تو کجا ان کے عتاب کا سامنا کرنا پڑا۔ کوپرنکس کے مطالعۂ آفاق کو چرچ نے ایک خطرے کے طور پر دیکھا۔ بائیبل کی منجمد کونیات میں زمین کو محور و مرکز کا مقام حاصل تھا اور یہ بات تسلیم شدہ چلی آتی تھی کہ یروشلم زمین کے مرکز پر واقع ہے۔ کوپرنکس کی نئی کونیات نے مروّجہ عیسائی اعتقادات کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ دوسری طرف بائبل میں صرف تین براعظموں کا تذکرہ پایا جاتا تھا۔ نئے انسانی مشاہدے نے بائیبل کی اس معلومات کو از کار رفتہ قرار دے ڈالا۔ اہل کلیسا کو ایسا محسوس ہوا گویا نئی اکتشافی تحریک ان کے راسخ العقیدہ نظری خیمہ کو خاکستر کر دے گی۔ **انہ ھو الحق** کی صدائے فطرت شناس پر لبیک کہنے کے بجائے انھوں نے اکتشافی علماء کے خلاف فتووں کا دہانہ کھول دیا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو خود کو روشن خیالی اور اصلاح پسندی کا علم بردار کہتے تھے وہ بھی اکتشافی تحریک کی مخالفت میں بند دماغ راسخ العقیدہ عیسائیوں سے پیچھے نہ رہے۔ مثال کے طور پر لوتھر نے کوپرنکس کے خلاف اپنے غیظ وغضب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا: ''یہ احمق فلکیات کے تمام تر علم کو الٹ دینا چاہتا ہے۔''[۱۹۰]

چرچ کی معاندانہ روش اور اکتشافی علماء کے خلاف ان کی منتقمانہ کارروائیوں نے بالآخر اکتشافی تحریک کی سمت کھوٹی کر دی۔ بایں ہمہ تحریک اصلاح کے محدود مقاصد اور اس عمل میں سیاسی محرکات کی آمیزش کے سبب یہاں بھی اکتشافی ذہن کی پناہ کا کوئی امکان نہ رہا۔ یورپ کی تیس سالہ مذہبی اور مسلکی جنگوں اور اس کی پیدا کردہ مایوس کن صورت حال نے بالآخر مغربی انسان کو ایک طرح کی secularity یعنی لاادریت میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ یہ تھا وہ پس منظر جب صنعتی انقلاب کے علم برداروں اور حرص و ہوس سے لبریز سرمایہ داروں کی نگاہیں تحریک اکتشاف پر پڑیں۔ انھیں اس نئی تحریک میں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کا وافر امکان نظر آیا۔ آنے والے دنوں میں قرآنی دائرۂ فکر کی پیداوار اور علومِ عربیہ کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی اکتشافی تحریک سرمایہ داری کے ہاتھوں کچھ اس طرح اغوا ہوئی کہ اب اس کی اصل الاصل مذہبی حیثیت کا احساس بھی کم ہی پایا جاتا ہے۔

مغرب زدہ علمی حلقوں میں بالعموم یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ یورپ کے صنعتی انقلاب نے سرمایہ داری کی راہ ہموار کی اور پھر سرمایہ داری نے ٹکنالوجی کے عفریت کو کچھ اس طرح کام پر لگایا کہ دیکھتے دیکھتے مغرب میں ایک نئی دنیا وجود میں آگئی۔ مغربی اہل دانش اس صورت حال کو کرشمۂ یورپ (European Miracle) سے موسوم کرتے ہیں[۱۹۱] ان حضرات کا خیال ہے کہ نئی تہذیب کا تمام جاہ وحشم، ٹکنالوجی کی نت نئی اختراعات، سفر وحضر کی جدید سہولتیں، غرض یہ کہ جدید دنیا جیسی کہ وہ ہے

یوروپی اقوام کی تعمیر کردہ ہے۔ ان حضرات کے مطابق اسلامی مشرق اپنے ہزار سالہ فکری سیادت کے ایام میں جو کچھ حاصل نہ کر سکا اسے مغرب نے صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں ممکن کر دکھایا۔ ٹکنالوجی انسانوں کی خدمت پر کچھ اس طرح مامور کر دی گئی کہ دیکھتے دیکھتے تہذیب کا ایک نیا قالب وجود میں آ گیا۔ گویا مشرق اپنے طویل تاریخی سفر میں جن اہداف کو حاصل نہ کر سکا اسے مغربیوں نے ممکن کر دکھایا۔

بظاہر اس پروپیگنڈے میں بڑا وزن معلوم ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گزشتہ پانچ سو سالوں کی تاریخی شہادت اس کی پشت پر موجود ہو، لیکن مسئلہ کا ذرا گہرائی سے جائزہ لینے پر پتہ چلتا ہے کہ اس خیال کی حقیقت بھی ایک تراشیدہ اسطورہ سے زیادہ نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ صنعتی انقلاب کے بعد بڑی سرعت کے ساتھ انسانی زندگی کے قالب میں تبدیلی آئی ہے، لیکن اس صورت حال کو کرشمۂ یورپ سے تعبیر کرنا سادہ لوحی سے کہیں زیادہ ٹکنالوجی کی تاریخ سے ناواقفیت بلکہ اس کی تمسیخ کے سبب ہے۔

Erhart Helmen. 78

Der ander sas ist / wie man die läng finden soll/auff ein jede tieff.

Der dritte vnd letste ist/ wie man außtheilet vnd einsetz die Puncten deß Innhalts.

Von der tieffe an die Visierruthen zu verzeichen/ auß der Geometria.

Ziehe ein Lini/ a b. vnd setz einen Quadraten / wie groß du wilt / an das a. der sey a c d e. vnd das Latus/ strich oder seyt/ a c. wirdt genendt der erst Diameter / oder der erst Punct in der tieffe/vnd bleibt vngetheilt/bedeut ein maß.

¶ Besihe

آدم رئیس (۱۵۵۹ء-۱۴۹۲ء) کی وہ کتاب جس نے مغرب میں عرب ریاضی کی اشاعت میں اہم رول ادا کیا۔

یہ اس زمانے میں شائع ہوئی جب یوروپ کے بعض ممالک میں عرب ریاضی کو ممنوعات میں سمجھا جاتا تھا۔

ہمیں اس حقیقت کا تو یقیناً اعتراف ہے کہ نویں صدی میں ابن فرناس کے ہوائی سفر کے پہلے تجربہ کے بعد عالم اسلام میں اس بارے میں صدیوں کوئی ہلچل دکھائی نہیں دیتی۔ ہمیں اس کمزوری کا بھی اعتراف ہے کہ اسٹیم انجن کی ٹکنالوجی پر اہلِ مغرب سے کہیں پہلے آگاہ ہونے کے باوجود ہم نے اسے دنبہ مسلّم بنانے کے لیے تو استعمال کیا لیکن عمومی فلاح کے لیے انجن میں اس کے استعمال کرنے کی طرف ہماری توجہ نہ گئی۔ اور ہاں! ہم اس بات پر بالکل شرمندہ نہیں کہ صنعتی انقلاب برپا کرنے کے لیے عالم اسلام میں بنیادی ٹکنالوجی کی موجودگی کے باوجود مسلمان تاجروں اور حکمرانوں کو کبھی اس بات کا خیال نہ آیا کہ وہ بے مہابا پیداوار کے لیے ٹکنالوجی اور فطری وسائل کا استحصال کریں۔ مشرق اگر ایک

طرف اساطیری طرزِفکر کے غلبہ کے باعث خوابیدگی اور اضمحلال کا شکار تھا تو دوسری طرف اس کی پختہ اخلاقی روایات اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ ٹکنالوجی کے استعمال میں اس شقاوتِ قلبی کا مظاہرہ کرے جس سے ماحولیات اور انسان کے مابین توازن درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ جو لوگ عالم اسلام میں سائنس کی تاریخ سے واقف ہیں ان کے لیے یقیناً یہ سمجھنا مشکل نہ ہوگا کہ ابن موسیٰ کی کتاب الحیل جو دسویں صدی عیسوی کی تالیف ہے، خود کار مشینوں کی تفصیلات سے متعلق ہے جس سے کم از کم اس بات کا تو اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان عہد عباسی میں ہی خود کار ٹکنالوجی کے فوائد سے آگاہ ہو گئے تھے۔ آبی گھڑیاں، پن چکی اور بادنماؤں کا استعمال یہاں عام تھا۔ ترک انجینئر تقی الدین جس کی مشہور زمانہ رصدگاہ کا تذکرہ ہم پچھلے صفحات میں کر آئے ہیں، اس کی تحریروں میں بھاپ کے انجن کی تفصیلات موجود ہیں۔ گیئر کی ٹکنالوجی جس پر صنعتی انقلاب میں کل کارخانوں کا انحصار تھا اس کے استعمال کی روایت مسلم دنیا میں صدیوں سے مستحکم چلی آتی تھی لیکن تب کسی کو اس بات کا خیال نہ آیا کہ وہ مشینوں کے کثرتِ استعمال کے ذریعہ پیداوار میں غیر معمولی اضافہ کرے اور اس طرح بہت سے انسانی ہاتھوں کو کام سے محروم کر دے۔ عالم اسلام کا وسیع و عریض علاقہ جو جاوا، سماترا، ہندوستان، فارس، شمالی افریقہ اور یورپ کے بعض علاقوں تک پھیلا ہوا تھا، فطری وسائل سے مالا مال تھا۔ زراعت، صنعت اور تجارت کی گہما گہمی کے ساتھ ساتھ یہاں فرد کا وجود روحانی انبساط سے مامور تھا۔ منڈیاں مصنوعات سے پٹی پڑی تھیں۔ طلب اور رسد کا توازن قائم تھا۔ مرفہ الحالی کے اس ماحول میں اس بات کی ضرورت ہی کیا تھی کہ پیداوار کو اس قدر بڑھا دیا جائے کہ اس کے فروخت کے لیے تجارتی قافلے دیس بدیس کی خاک چھانیں اور حرص وطمع کی مسلسل بڑھتی بھوک انھیں استعمارانہ کاسہ لیسیوں میں مبتلا کر دے۔ اس کے برعکس یورپ کا نیا ابھرتا خطہ جہاں ٹکنالوجی نے ایک نئے امکان کی خبر دی تھی، فطری وسائل سے تہی دست تھا۔ مثال کے طور پر کپڑے کی صنعت کے لیے اسے خام مال ہند و مصر کی قدیم منڈیوں سے درآمد کرنا ہوتا تھا۔ گویا فطری طور پر یہاں معیشت کے نمو کے وہ امکانات نہ تھے جس سے مرفہ الحال مشرق عبارت تھا۔ پھر اہل یورپ کے لیے جہاں کام کرنے والے ہاتھ بھی مشرق کے مقابلے میں خاصے کم تھے، لازم تھا کہ وہ مشرق کے مقابلہ میں بے ہاتھ مشینوں کو استعمال میں لائیں۔ رہی یہ بات کہ اس عمل سے بہت سے انسانی ہاتھ کام سے محروم ہو جاتے ہوں یا ماحولیاتی توازن متاثر ہوتا ہو تو یہ مسائل سرمایہ دارانہ دائرۂ فکر میں سرے سے قابل اعتنا نہیں سمجھے جاتے۔ لیکن محض مشینوں کے بے ہنگام شور وغل سے نہ تو مشرق کو شکست دی جا سکتی تھی اور نہ ہی محض صنعتی انقلاب کے بل بوتے پر مغربی سیادت کا قیام اور استحکام ممکن تھا، سو ان مقاصد کے حصول کے لیے بدقسمتی سے سفید فام اقوام نے ان کریہہ ہتھکنڈوں کا سہارا لیا جس کے ذکر سے ہی دل بیٹھنے لگتا ہے۔

کولمبس جس کے بحری سفر کا رومانوی تذکرہ مغربی رزمیہ کا اہم حصہ ہے اور جسے مغربی تہذیب کے نقطہ آغاز کے طور پر دیکھا جاتا ہے اس کے اصل اہداف کی طرف ہم پچھلے صفحات میں اشارہ کر چکے ہیں۔ اب ذرا ان امور کا بھی بیان

ابن بطلان (متوفی ۴۵۵ھ) کی مشہورِ زمانہ تالیف تقویم الصحۃ لاطینی قالب میں

ہو جائے کہ وسائل کی تلاش میں خواہ اس کے پیچھے صلیبی ذہنیت کارفرما رہی ہو یا محض حرص وطمع نے انھیں اوران کے سیاسی سرپرستوں کواس سفر پر آمادہ کیا ہو، واقعہ یہ ہے کہ نئی دنیا امریکہ اسپینی فاتحین (conquistadores) کی بربریت اور قتل و غارت گری سے کچھ اس طرح لالہ زار ہوئی کہ صرف پچاس سالوں کے اندر اسّی ملین کی مقامی آبادی میں سے ستر ملین کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ سولہویں صدی میں میکسیکو کی آبادی پچیس ملین نفوس پر مشتمل تھی جو سولہویں صدی کے اختتام پر گھٹ کر صرف ایک ملین رہ گئی[۱۹۲] کچھ لوگ تو یقیناً ان بیماریوں سے ہلاک ہوئے تھے جو اہلِ یورپ کی غیر صحت مندانہ معاشرت کی پیداوار تھی اور جسے یہ حضرات اپنے ساتھ نو مفتوحہ علاقوں میں لے کر آئے تھے۔ مثلاً چیچک اور خسرہ جیسی بیماریاں یوروپی اقوام میں عام تھیں۔ حفاظتی ٹیکہ کی ایجاد سے پہلے یورپ میں خال خال ہی کوئی ایسا چہرہ دکھتا تھا جو چیچک کے داغ دھبوں سے آلودہ نہ ہو۔ ان بیماریوں کے علاوہ ایک بڑی تعداد کی ہلاکت کے پیچھے یوروپی فاتحین کی شقاوت قلبی تھی۔ یہ لوگ جس اندلس کی نمائندگی کر رہے تھے وہاں ایزابیلا اور فرنانڈیڈ کی قیادت میں مسلمانوں اور یہودیوں کے انخلاء اور ان کی نسل کشی کا کام ابھی تازہ تازہ اتمام کو پہنچا تھا۔ نئی دنیا میں یہ اسپینی فاتحین اسی روش پر قائم رہے

تا آنکہ آنے والی صدیوں میں سرخ ہندیوں کی نسل تاریخ کا قصۂ پارینہ بن گئی۔[193] سولہویں صدی میں یورپ کی معیشت کو نومفتوحہ کالونیوں سے آنے والی دولت کے سبب غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ نئی دنیا کے مختلف خطوں سے سونے اور چاندی کے ذخائر جہازوں میں بھر بھر کر یورپ کو پہنچے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ سولہویں صدی کے اختتام تک صورت حال یہ ہوگئی کہ ہر سال اوسطاً کوئی ۲۷۰،۰۰۰ کلوگرام چاندی اور ۲۰۰۰ کلوگرام سونا یورپ پہنچنے لگا۔[194] ایک طرف مقامی آبادی کی منظم نسل کشی کا پروگرام جاری تھا اور دوسری طرف قیمتی معدنیات کے ذخائر کے حصول کے لیے افرادی قوت کی ضرورت بھی بڑھتی جاتی تھی، سو اس مسئلہ کا حل یہ نکالا گیا کہ افریقہ کے صحت مند اور توانا انسانوں کو جبراً اس کام پر مامور کیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ صرف ۱۵۲۵ء سے ۱۵۵۰ء کے درمیان کوئی چالیس ہزار سیاہ فام افریقی باشندوں کو جبراً غلام بنالیا گیا اور انھیں سفید فام یورپی اقوام کی طمع اور حرص کی تکمیل کے لیے نئی دنیا میں کام پر لگا دیا گیا۔[195] نہ جانے کتنے خاندان اجڑے، کتنی زندگیاں تباہ ہوئیں، تب کہیں جا کر یورپ کی مرفہ الحالی کو استحکام نصیب ہوا۔

بارود، خود کار مشینوں، مقناطیسی سمت نما اور بھاپ کی قوت کا ادراک اسلامی مشرق کے لیے کوئی نیا تجربہ نہ تھا لیکن تب بارود اور بندوق کا استعمال میدان جنگ کا نقشہ پلٹنے کے لیے استعمال ہوتا۔ کسی کے دل میں یہ خیال بھی نہ آتا کہ وہ سرسبز وشاداب زمینوں پر قبضہ کی لالچ میں اپنے ہی جیسے انسانوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دے اور ہزاروں لاکھوں کلومیٹر کے رقبے کو اپنے حرص و ہوس کے لیے مخصوص کر لے۔ اسپینی اور پرتگالی حملہ آوروں کی کامیابیوں نے یورپ کی دوسری اقوام کو بھی استعمارانہ مہم جوئی کی راہ دکھائی۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ انگریز، ولندیزی، فرانسیسی، جرمن، آسٹریائی اقوام عالمی سطح پر برپا ہونے والی لوٹ کھسوٹ میں شریک و سہیم بن گئیں۔ بحرالکاہل سے لے کر بحر ہند اور بحر ہند سے لے کر بحر اوقیانوس تک کا علاقہ اقوام یورپ کی مسلسل بڑھتی طمع کا میدان جنگ بن گیا۔ امریکہ کے نومفتوحہ علاقوں اور آگے چل کر مشرقی نوآبادیات نے یورپ کے کشکول کو صرف سونے چاندی اور دوسرے قیمتی دھاتوں سے مالا مال نہیں کیا بلکہ ان ممالک کے لاکھوں میل کے سرسبز وشاداب زراعتی علاقے بھی اقوام یورپ کے قبضے میں آگئے، جہاں سیاہ فام افریقی غلاموں کو یورپ کی مرفہ الحالی پر شب و روز مامور کر دیا گیا تھا۔

غلاموں کی خرید و فروخت فی نفسہٖ ایک انتہائی منافع بخش تجارت کی شکل میں سامنے آئی۔ عروج یورپ کا رزمیہ غلاموں کی آہ و بکا سے کس قدر مملو ہے اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سولہویں صدی میں صرف نکاراگوا میں چار لاکھ لوگ غلام بنالیے گئے تھے۔[196] پیرو اور میکسیکو میں سونے، چاندی کی کانیں سیاہ فام افریقی غلاموں کے دم سے آباد تھیں جہاں غلاموں کو استحصالی نظام میں پرونے کے لیے بڑے بڑے مراکز قائم تھے۔ برازیل میں شکر اور دوسرے اجناس کی وسیع و عریض کھیتی بھی غلاموں کے دم سے قائم تھی۔ ایک طرف سونے چاندی کی ریل پیل نے بین الاقوامی بازار میں یوروپ کے قوت خرید میں زبردست اضافہ کر دیا تھا[197] تو دوسری طرف لاکھوں غلاموں کی محنت کا ثمرہ
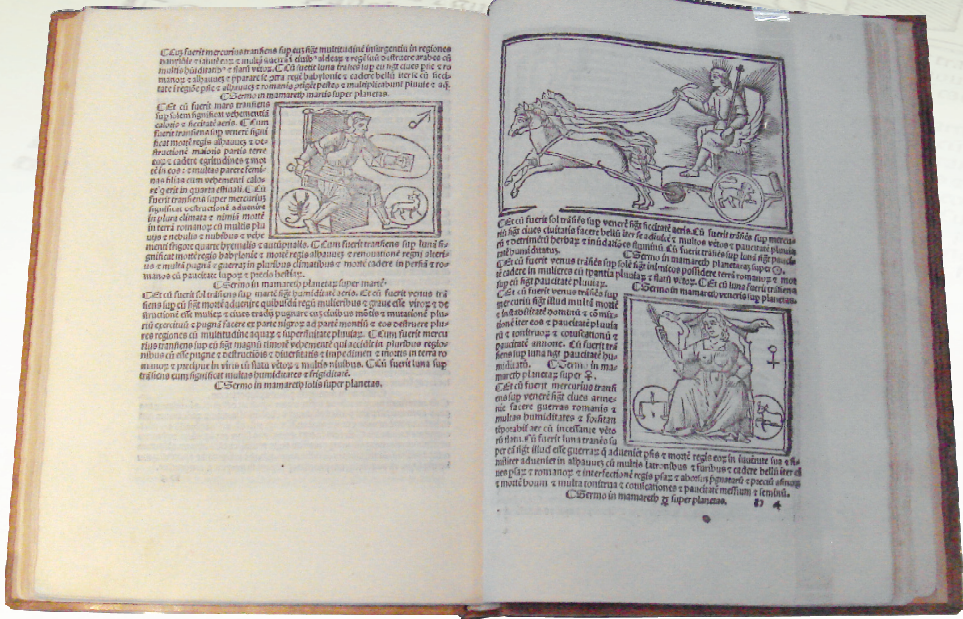
De Magnis Conjunctionibus

ابو معشر جعفر ابن محمد البلخی کی کتاب اپنے لاطینی قالب میں (مطبوعہ وینس، ۱۵۱۵ء)

مسلسل ان کی جھولی میں گر رہا تھا۔ دولت کی اس ارزاں اور بے رحم فراوانی نے مغرب میں ایسے مہم جو سرمایہ داروں کا ایک طبقہ پیدا کیا جو مزید منفعت کے خیال سے نئی نئی ایجادات و اختراعات کے لیے وافر پیسے خرچ کر سکتا تھا۔ یہ تھا وہ پس منظر جس نے مغرب میں اس کرشمہ کو جنم دیا جسے ہم تہذیب کے جدید قالب سے موسوم کرتے ہیں۔

اکتشافی تحریک جو کبھی فرد کی زندگی کو معانی سے معمور کرتی، اسے انفس و آفاق کے باہمی ارتباط پر مطلع کرتی، سرمایہ داری کے ہاتھوں کچھ اس طرح بے سمت ہوئی کہ اس کی تعمیر کردہ دنیا پر ایک نئے عہد ظلمت کا گمان ہونے لگا۔ ٹکنالوجی کی نئی پیش قدمیاں، رسل و رسائل کی سہولتیں اور کائنات کی تسخیر یقیناً قابل تحسین وقوعہ تھا لیکن فجر جدید کا یہ مژدہ بنیادی طور پر صرف اہل مغرب کے حصہ میں آیا تھا جس کی بے رحم قیمت ادا کرنے پر مشرقی اقوام مجبور تھے۔ گویا مغرب میں فجر جدید کا نوید جانفزا مشرق میں ظلمت شب کے قیام سے عبارت تھا۔ مغرب کی مرفہ الحالی مشرق کے افلاس اور استحصال کے سبب قائم ہوئی تھی۔ مغرب کو خوب معلوم تھا کہ فطری اور منطقی طور پر مشرق کو تہہ و تیغ کیے بغیر اس کی کرشماتی دنیا قائم نہیں رہ سکتی۔ سرخ ہندی تو امریکہ سے فنا ہو گئے لیکن مشرق کی اقوام اور خاص طور پر عالم اسلام کی سرزمین آج بھی اس کے بہیمانہ حملوں سے لہولہان ہے۔

ایک ایسی تہذیب کو جو حق و انصاف کی بنیاد پر اپنے آپ کو سہارنے کی صلاحیت سے محروم ہو جس کے ہاں کام کرنے والے ہاتھ اور فطری وسائل نسبتاً کم پائے جاتے ہوں وہ اپنی سطوت کے لیے ظلم و استحصال کے علاوہ اور کون سا راستہ اختیار کر سکتا ہے؟ تہذیب کا یہ رنگ و روپ بظاہر خواہ کتنا ہی خوشنما کیوں نہ ہو اس کی تحسین تو کجا اسے انگیز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مغرب کے ان تمام مغنّیوں نے جو عروجِ مغرب کا سبب مغربیوں کی بلند نگہی اور ان کی عقلیت پسندی کو قرار دیتے آئے ہیں، ہمیں اصل صورت حال کے ادراک سے روکے رکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جدید دنیا ہماری کوششوں سے وجود میں آئی ہے، یہ صبح جسے تم دیکھتے ہو ہمارے ہی مرغ کے بانگ کے سبب قائم ہے۔ مغرب کے یہ مغنی ہمیں یہ تو ضرور بتاتے ہیں کہ ہمارا قافلہ مست خرامی کا شکار کب اور کیوں کر ہوا، ایک نظری بے سمتی کیوں کر ہمارا مقدر بن گئی۔ (*What Went Wrong*) جس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ شاید ان کے ہاں اب تک سب کچھ صحیح ہوتا چلا آیا ہے۔ البتہ ان کی نگاہِ ناشناس اس حقیقت کے ادراک سے قاصر ہے کہ مغرب میں تحریکِ اکتشاف کی بے سمتی میں ان موسسین مغرب کا کلیدی رول ہے جن کے بظاہر علمی لب و لہجے نے ناآگہی کا عمومی ماحول تیار کیا ہے اور جس کے سبب ہم آج خود کو ایک نئے عہد ظلمت میں گھرا پاتے ہیں۔

حواشی وحوالے

۱۔ سولھویں صدی میں عالم عیسائیت ترکوں سے کس قدر لرزہ براندام رہتا تھا اس کا اندازہ ان ترک مخالف تحریروں سے ہوتا ہے جو بڑی کثرت کے ساتھ اس صدی میں شائع ہوتی رہیں۔ خاص طور پر ہنگری اور آسٹریا پر ترکوں کے حملوں کے بعد جرمنی میں عدم تحفظ کا احساس عام تھا۔ اس صورت حال نے عیسائی ذہن میں ایک بحران کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ بیشتر عیسائی مفکرین ترکوں کی بے پناہ قوت اور عالم عیسائیت کی طرف ان کی مسلسل بڑھتی ترک تازیوں کو عذاب خداوندی پر محمول کرتے اور اس صورت حال کے ازالے کے لیے خدا سے معافی اور اصلاحِ احوال کا نسخہ تجویز کرتے۔ اس قسم کے مخالفانہ اور معاندانہ ادب کی کثرت کے سبب جرمن زبان میں اس قبیل کی تحریروں پر مشتمل Türkenbüchlein کی ایک مخصوص صنف وجود میں آ گئی تھی۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے:

John W. Bohnstedt, *The Infidel Scourge of God: The Turkish Menace as seen by German Pamphleteers of the Reformation Era* in Transactions of the American Philosophical society held at Philadelphia for promoting useful knowledge, New Series- volume 58, part9, 1968, The American Philosophical Society, Independence Square, Philadelphia, December, 1969.

۲۔ Vorwort zu dem Libellus de ritu et moribus Turcorum, WA 30/2:206.3-17 (H-B, 259) quoted in Adam S. Francisco, *Martin Luther and Islam*, Brill, Leiden 2007, p.2.

۳۔ ملکہ ایلیز ابتھ اوّل کی کامیاب سفارت کاری کے نتیجہ میں انگلستان کو ترک عثمانیوں کے فطری حلیف کے طور پر دیکھا جانے لگا تھا۔ شاہ مراقش احمد المنصور جو ترک خلیفہ کی عمل داری میں تھے، انھوں نے انگلستان کے ساتھ نہ صرف یہ کہ بہت سے تجارتی اور عسکری معاہدے کیے بلکہ ۱۵۹۶ء میں کاڈیز (Cadiz) پر حملے میں انگریزوں کی بھرپور معاونت بھی کی۔ ۱۶۰۳ء میں انھوں نے ملکہ ایلیز ابتھ اوّل کو یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ وہ دونوں مشترکہ طور پر امریکہ کو اسپین کے قبضہ سے نکال کر اپنی

کالونی بنالیں، البتہ مستقبل کی ان فتوحات میں مراقش کی حیثیت غالب اور فیصلہ کن فریق کی رہے۔ ایسا اس لیے کہ گرم علاقوں میں قیام کے لیے انگریزوں کے مقابلے میں مراقشی فوجی فطری طور پر کہیں مناسب ہیں:

"Those of your countrie doe not fynde themselfes fitt to endure the extremetie of heat there..., where our men endure it very well by reason that heat hurtes them not."

گو کہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی، البتہ اس مراسلت سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ سترہویں صدی کی ابتدا تک مسلمان ایک غالب قوت کی حیثیت سے دیکھے جاتے تھے۔ بلکہ برنارڈ لوئس کو تو باقاعدہ اس بات کی شکایت رہی ہے کہ مسلمانوں میں مغرب کی مخالفت کا جو رویہ پایا جاتا ہے اس کا سبب ان کی یہی تاریخی عظمت ہے جس کے سبب ان کے لیے یہ ہضم کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ کل تک جو لوگ ہمارے زیر دست تھے آج انھیں ہم پر کیوں کر تفوق حاصل ہو گیا ہے۔ لوئس اس نفسیات کو Clash of Civilization کا سبب قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے: "The Roots of Muslim Rage" i*n From Bable to Dragoman*s. مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: Nabil Matar, *Turks, Moors and Englishman in the Age of Discovery*.

۴۔ مسلمانوں کی جلالت و عظمت کا طلسم اچانک رخصت نہیں ہو گیا، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ ترکوں کی سیاسی قوت سے تو یورپ لرزہ براندام رہتا ہی، مغل جو اکتشافی علوم میں عثمانیوں اور صفویوں کے مقابلے میں خاصے پیچھے تھے، ان کی ثقافت سے انگریزوں کی مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ انیسویں صدی کے نصف اوّل تک انگریز مغل ثقافت اختیار کرنے اور ان کی عورتوں سے شادی رچانے کو اپنی شان سمجھتے۔ ایک ایسی ثقافت جو صدیوں سے مختلف قالب میں دنیا کے مختلف حصوں پر غالب رہی ہو اس کے مقابلے میں ایک نوزائیدہ قوت کے لیے، جو چہار دانگ عالم میں اپنی سبقت کے لیے ہاتھ پیر مار رہی ہو، فریق مقابل کی تاریخ سے مرعوب اور متاثر رہنا فطری تھا۔ اس بارے میں ولیم ڈیل رمپل نے اپنی کتاب *The White Mugh*al میں بڑا چشم کشا تذکرہ کیا ہے۔

۵۔ Hobson, John M, *The Eastern Origins of Western Civilisati*on, Cambridge University Press, 2004, pp.145-6.

۶۔ صلیبی جنگوں کی شروعات سے پہلے جب یورپ میں مسلمانوں کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے میں وہ شدت نہ آئی تھی ارباب کلیسا پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی تھی کہ مسلمان ایک ایسے مشن کے علم بردار ہیں جو رسالہ عیسوی سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ اور یہ ان دو قوموں میں باہم قدر مشترک تلاش کی جا سکتی ہے۔ پوپ گریگوری ہفتم نے ۱۰۷۶ء میں سلطان الناصر (الجزائر) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا:

’’خدائے ذوالجلال جو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ تمام ہی انسان نجات سے باریاب ہوں اسے اس بات سے زیادہ کوئی بات

دسویں صدی عیسویں کے مسلم ماہر طب ابن سرابیون کی کتاب کا وہ لاطینی ترجمہ جس کا عربی اصل اب ناپید ہے۔

پسند نہیں کہ انسان سب سے پہلے خدا سے محبت کرے اور پھر اس کے بعد اپنے ہم نفسوں سے۔۔۔ہم اور آپ دونوں ہی دوسری قوموں کے مقابلے میں اس بات کے کہیں زیادہ سزاوار ہیں کہ ایک دوسرے سے محبت والفت کا معاملہ رکھیں۔ ایسا اس لیے کہ ہم دونوں ایک خدا کے ماننے والے ہیں۔ گوکہ ہمارے طریقے مختلف ہیں۔ وہی خدا جس کی ہم ہر روز تمام زمان ومکاں کے حاکم کی حیثیت سے حمد وثنا کرتے ہیں اور جیسا کہ مسیح کا فرمان ہے اسی کی ذات ہمارے لیے باعث طمانیت ہے جس نے دونوں کو ایک بنایا۔'' (He is our peace who hath made both one)

گوکہ پوپ گریگوری نے اپنے عقیدے کے اظہار میں کسی تکلف سے کام نہیں لیا البتہ مسلمانوں کے ساتھ جس نظری یگانگت کا اظہار کیا ہے اس سے اس بات کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بغض وعناد کی عمومی فضا میں حقائق کی معرفت رکھنے والے لوگ عنقا نہیں تھے۔ ملاحظہ کیجئے: E.Caspar, ed., Das Register Gregors VII, Bk. III, no.21, Epistolae Seletae in usum scholarum ex Monumentis Germaniae Historicis separation editae (Berlin, 1955), ii(1), p.288 (citing Eph. 2,15). محولہ Bernord Hamilton, *Knowing the Enemy: Western understanding of Islam at the time of the Crusades*.

۷۔ اہل علم اس بات سے ناواقف نہیں کہ مروّجہ عیسائیت رسالہ عیسوی کے بجائے سینٹ پال کے تراشیدہ اساطیر وعقائد کی مرہون منت ہے۔ کیرن آرم اسٹرانگ تو پال کو پہلے عیسائی کے نام سے ملقب کرتی ہیں۔ ہائم مکوبی نے اپنی کتاب *Paul: The Myth Maker* (1986) میں ناقابل تردید دلائل کی روشنی میں پال کو مروّجہ عیسائیت کا بانی مبانی قرار دیا ہے۔ میکوبی اور اس قبیل کے دوسرے محققین کا کہنا ہے کہ پال نے قدیم یونانی مذہبی تصورات کو جس طرح عیسائیت کے سر منڈھ دیا ہے اور جس طرح انھیں بائبل کی تعبیر ہی میں نہیں بلکہ اس کے متن میں بنیادی مقام حاصل ہے، اس کے سبب عیسائیت کو اب پال کے حصار سے باہر لانا ممکن نہیں۔

جولوگ مذاہب کی تاریخ پر نظر رکھتے ہیں وہ اس بات سے خوب واقف ہیں کہ مروّجہ عیسائیت کی تشکیل میں پال نے دینِ یہود سے خالقِ کائنات کا تصور مستعار لیا، اہلِ فارس سے ثنویت لی، اہل یونان سے تثلیت، قدیم مشرک اقوام سے بپتسمہ لیا، متھرا ازم سے تصورِ کفارہ لیا، شمس پرستوں سے صلیب اور ہیلینسٹک تہذیب سے مادّے اور روح کا وہ ثنویانہ دائرۂ فکر لیا، جس نے بالآخر ایک ایسی عیسائیت تشکیل دی جسے قومِ یہود کے علاوہ بھی دوسری اقوام عالم کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ پال کی تعبیرات کے زیر اثر نئے عہد نامہ کے مرتبین نے دین کا ایک ایسا قالب تیار کر ڈالا جہاں شریعت موسوی منسوخ سمجھی گئی۔ کہا گیا کہ راست بازی کے لیے شریعت کی کوئی ضرورت نہیں کہ مسیح نے ہمارے لیے جو قربانی دی ہے اس کے بعد اب ان کے نام لیواؤں کو ان کی پناہ میں نجات کی ضمانت حاصل ہوگئی ہے، جیسا کہ پال نے گلیتیوں (Galatians) کے نام اپنے ایک مکتوب باب ۳، ۱۱ تا ۱۳ میں لکھا ہے۔ متھرا ازم کا سایہ مروّجہ عیسائیت پر اتنا گہرا ہے کہ اسے فی الواقع متھرا ازم کی ہی اصلاح شدہ شکل سمجھنا چاہئے۔ عبادت کے لیے اتوار کے دن کی تخصیص ہو یا ۲۵ ردسمبر کو یوم پیدائش کے حوالے سے حرمت کا مستحق سمجھنا یا یوکرسٹ (Eucharist) کے موقع پر مسیح کی بہ نفیس نفیس موجودگی کی باتیں ان سب کا تعلق اسی متھرا ازم سے ہے۔

پال اور مسیح بنیادی طور پر دو دائرۂ فکر کی شخصیتیں ہیں۔ مسیح کی دعوت کا لب لباب خدا کی بادشاہی کا قیام ہے جبکہ پال کی عیسائیت، وفات مسیح اور ان کی حیاتِ ثانیہ کو مرکزی نکتہ کے طور پر پیش کرتی ہے۔ پال مسیح سے کہیں زیادہ اس روح القدس (Holy Spirit) کا سہارا لیتے ہیں جس کی موجودگی سے ان کے اپنی شخصیت کو اعتبار ملتا ہے اور جو انھیں عہد نامۂ قدیم کی طرف ایک منفی رویہ اپنانے اور غیر یہودی اقوام میں اس دین کی تبلیغ پر مامور کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ پال کا مسیح وہ تاریخی شخصیت نہیں جسے خدا نے اہل یہود کی طرف بھیجا بلکہ ان کے اپنے تخیل اور مکاشفہ کا پیدا کردہ وہ مسیح ہے جس نے انھیں شاہراہِ دمشق پر آلیا اور جس روحانی تجربہ کے بعد انھوں نے ایک نئی عیسائیت کے قیام کی ضرورت محسوس کی۔ بائبل میں پال کے اس مکاشفہ کا ذکر کچھ اس طرح بیان ہوا ہے:

''ابھی وہ راستہ میں دمشق سے کچھ دور ہی تھا کہ اچانک آسمان سے ایک بجلی کوندی اور اس کے اردگرد سب کچھ منور کرگئی۔ وہ زمین پر آگرا اور اسے ایک آواز سنائی دی۔ پال پال آخر تم میری مخالفت پر کمربستہ کیوں ہو۔ اس نے پوچھا آخر بتائیے تو آپ ہیں کون؟ آواز آئی میں مسیح ہوں، جسے تم ستانے پر کمربستہ ہو۔ اب اٹھو اور شہر میں جاؤ، تمھیں بتایا جائے گا کہ تمہیں کرنا کیا ہے۔ جو لوگ پال کے ساتھ اس سفر میں شریک تھے وہ اس پورے واقعہ میں حیرت واستعجاب کی تصویر بنے رہے۔ انھوں نے آواز تو سنی تھی لیکن انھیں یہ اندازہ نہ ہوا کہ یہ کہاں سے آئی تھی۔ پال اب زمیں سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا لیکن جو اس نے آنکھ کھولی تو کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ لوگ اسے اسی حالت میں دمشق میں لے آئے۔ تین دن تک اس کی بصارت سلب رہی۔ اس نے نہ کچھ کھایا اور نہ پیا۔'' (Acts 9:1-31)

باب ۲۶ میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس موقع پر مسیح نے باقاعدہ پال کو تفصیلاً خطاب کیا اور اسے غیر یہودی اقوام میں دعوت کی

ابن الوردی کی کتاب خریدۃ العجائب و فریدۃ الغرئب جس نے شرق وغرب میں عالمی المانک (المناخ) کی اشاعت کی طرح ڈالی۔

توسیع واشاعت کے کام پر مامور بھی فرمایا۔ پال کا یہ ذاتی انبساط انگیز تجربہ ایک شخص کا تجربہ نہیں بلکہ عیسائیت کی اجتماعی روحانی میراث ہے، جس کے بغیر ہم فی زمانہ دین مسیح کو متشکل نہیں کر سکتے۔ نئے عہد نامہ کی چاروں بنیادی کتابیں اسی روحانی اور ذہنی پس منظر میں مرتب کی گئیں۔ ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ پال سے الگ ہو کر خود بائیبل کو متصور کر سکیں۔ ایسا اس لیے کہ کہ بائیبل کی چاروں کتابیں ۷۰ عیسوی سے ۱۱۰ عیسوی کے درمیان مدوّن ہوئیں جبکہ پال کے خطوط جو بائیبل کے متن کا حصہ سمجھی جاتی ہیں، ۵۰ عیسوی سے ۶۰ عیسوی کے مابین تحریر کردہ ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بائیبل کے یہ مرتبین اس کے اوّلین مؤسس اور مبلغ پال کے ذاتی رجحانات سے الگ ہو کر عیسائیت کو متصور کر پاتے۔ عیسائی فکر میں کسی نئی ابتدا کی بات پال کی تعبیرات کو خیر باد کہے بغیر ممکن نہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ ایسا کرنے سے مروّجہ عیسائیت کا پورا ڈھانچہ زمیں بوس ہو جاتا ہے۔

۸۔ Charles Merrill Smith, *The Pearly Gates Syndicate*, New York, 1971, pp.27-28.

۹۔ J.N. Hillgarth (ed.), *The conversion of Western Europe: 350-750*, New Jersy,1969, p.46

۱۰۔ حوالہ مذکور، ص ص ۴۸-۴۴۔

۱۱۔ *The New Columbia Encyclopedia*, 61,۔

۱۲۔ اس عظیم الشان کتب خانہ میں جن اہم کتابوں کے تلف ہو جانے کا تذکرہ مورخین نے کیا ہے ان میں Porphyry کی ۳۶

مجلدات، Gnostic Basilides کی کتابیں اور Ptolemy Philadelphus کے جمع کردہ ۲۷۰،۰۰۰ تاریخی وثائق تھے۔ گبن نے لکھا ہے کہ کتب خانہ کی تباہی کے کوئی بیس سال بعد زائرین پر خالی الماریاں دیکھ کر حسرت و یاس کی کیفیت طاری ہوجاتی۔ ملاحظہ کیجئے: Edward Gibbon, The *Decline and Fall of the Roman Empire*, ch.28.

دنیا کی تہذیبی اور نسلی تقسیم
پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کا مفروضہ نقشہ

مزید دیکھئے: Lloyd Graham, *Deceptions and Myths of the Bible*, Carol Publishing Group Edition, 1999, p.444.

۱۳۔ Charles Homer Haskins, *The Renaissance of the 12th Century*, Cleveland & New York, 1927, p.96.

۱۴۔ Barbara G. Walker, *The Woman's Encyclopedia of Myths and Secrets*, San Francisco, 1983, p.208

۱۵۔ John H. Smith, *The Death of Classical Paganism*, New York, 1976, p.223.

۱۶۔ ۴۱۰ء میں گوتھک عیسائی حملہ آوروں کے ہاتھوں سقوط روما نے عیسائی ذہن کو اپنی تاریخ کے سب سے بڑے بحران سے دوچار کر دیا۔ روم کی بند دماغ عیسائی تہذیب جہاں ارباب کلیسا نے غور وفکر پر پہرے لگا دیے تھے، ایک مدت سے روبہ زوال تھی، البتہ کسی کو یہ اندازہ نہ تھا کہ جس ریاست کو وہ لازوال تقدیس کا حامل سمجھے بیٹھے ہیں اچانک یوں منتشر ہوجائے گی۔ سقوط روم سے مغربی عیسائی دنیا میں وہی بحرانی صورت حال پیدا ہوگئی جو عباسی بغداد کے سقوط اور اَوش وِٹس میں اہل یہود کی منظم تباہ کاری کے وقت دیکھنے میں آیا تھا۔ ہر خاص و عام سوالی تھا کہ آخر اپنی ہی مقدس سلطنت کو تباہ ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہے۔

آگسٹائن اگر اس صورت حال کا معروضی تجزیہ کر پاتے اور اگر اس عہد کے دوسرے عیسائی فرقوں مثلاً ڈوناٹسٹ کی طرح وہ بھی چرچ کے اخلاقی زوال اور معاشرے کی عام بند دماغی کا ادراک رکھتے تو توقع تھی کہ احتساب کا عمل ایک نئی ابتداء کی راہ دکھاتا۔ ڈوناٹسٹ اس بات کی پہلے ہی سے شکایت کر رہے تھے کہ جو چرچ خود ہی گناہوں میں مبتلا اور خباثت سے آلودہ ہو اس کے عطا کردہ بپتسمہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ آگسٹائن نے چرچ کی اصلاح وتطہیر کے بجائے اسے جوں کا توں قبول کیے لینے کو مطلوب خداوندی بتایا۔ سقوط روم کے اسباب کے سلسلے میں ان کا تجزیہ معروضی اور علمی کے بجائے واعظانہ اور مولویانہ

مرکیٹر کا مروجہ خریطۂ عالم جہاں مغرب کے چھوٹے چھوٹے غیر اہم ممالک جغرافیائی طور پر بڑے دکھائے گئے ہیں
اور وسائل سے مالا مال مشرق بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔

تھا جس نے ایک نئی ابتداء کے تمام تر امکانات ختم کر دیے۔ The City of God میں انھوں نے اس خیال کی وکالت کی کہ خدا کی دنیا دو شہروں پر مشتمل ہے۔ ایک آسمانوں کی خدائی دنیا اور دوسری ہماری زمینی دنیا۔ ثانی الذکر جہاں گنہگار اور متقی ایک ساتھ رہتے ہیں، مثالی معاشرے کا منظر نہیں پیش کر سکتے کہ ایک مثالی معاشرہ اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب گنہگاروں کو جہنم رسید کر دیا گیا ہو اور جس کا لطف اہل ایمان دنیائے آخرت کے خدائی شہر میں لے سکیں گے۔ اس سرزمین پر اہل ایمان کے لیے مثالی خدائی معاشرے کا قیام باعث مسرت نہیں بلکہ ان کی اصل خوشی تو اس امر میں ہے کہ وہ آخرت کی خوشیوں کے بھروسے دنیا کی صعوبتوں پر راضی رہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آگسٹائن کو اصلاح وتطہیر کے خیال سے اِبا آتی تھی، ان کے لیے یہ قبول کرنا انتہائی مشکل تھا کہ معاشرے میں برپا سیاسی جبر اور انارکی اور معاشی ناہمواری اصلاح کی طالب ہے۔ مثال کے طور پر مسئلہ غلامی کے خلاف انھوں نے کوئی قدم اٹھانے کے بجائے اسے یہ کہہ کر جواز بخشا کہ یہ غلاموں پر خدا کا عذاب ہے۔ آگسٹائن کا یہ متصوفانہ فکر جو صورت حال کی تبدیلی کے بجائے اس کو انگیز کرنے کی ترغیب دیتا ہے، گو کہ حضرت مسیح کی بنیادی تعلیمات سے مغائر ہے، لیکن آنے والے دنوں میں یہ قنوطی اور pacifist طرزِ فکر عیسائی ذہن کا نقیب بن گئی۔

۱۷۔ Augustine, *Confessions and Enchiridion*, trans. Albert C.Outler, Philadelphia, 1955, pp.341-42.

۱۸۔ Augustine, *On Christian Doctrine*, trans. D.W. Robertson, Jr., Indianapolis, 1958, pp.65-66.

۱۹۔ Augustine, *Confessions*, trans. F.J, Sheed, New York, 1942, p.201.

۲۰۔ بائیبل کے مطالعہ میں آگسٹائن کا سارا انحصار لاطینی تراجم پر تھا۔ یونانی اور عبرانی زبان سے ان کی واقفیت بہت کم تھی۔ اب جو انھوں نے رومیوں کے نام پال کے مکاتیب کا مطالعہ کیا تو انھیں باب ۵، آیت ۱۲ کو سمجھنے میں سخت الجھن پیش آئی، وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہر انسان آدم کے توسط سے گناہوں کا مرتکب اور اس سے مملو ہے، یعنی گناہ انسان کی سرشت میں داخل ہے اور اس کی حیثیت بنیادی طور پر ایک ازلی گنہگار کی ہے۔ اگر بائیبل کے یونانی نسخوں تک آگسٹائن کی راست رسائی ہوتی تو شاید ان کے لیے سمجھنا آسان ہوتا کہ بائبل کے مطابق انسانی دنیا میں گناہ کا داخلہ آدم کی لغزش کے سبب ہوا اور یہ کہ اب شر ایک ایسی قوت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے خلاف برسرپیکار ہے۔ اصل یونانی نسخوں سے عدم واقفیت کے سبب آگسٹائن نے انسان کے پیدائشی گنہگار ہونے کا جو عقیدہ وضع کیا اسے آگے چل کر عیسائی فکر میں قبولیت عامہ مل گئی۔

۲۱۔ S. Stead, *Philosophy in Christian Antiquity*, Cambridge, 1994, p.223

۲۲۔ آگسٹائن کے نزدیک عیسائیت کی سرکاری تعبیر کے علاوہ کوئی اور تعبیر لائقِ گردن زدنی تھی۔ ان کے عہد میں Donatists کے خلاف سخت تشدد سے کام لیا گیا۔ ملاحظہ کیجیے: H. Darke, *Constantine and the Bishops: The Politics of Intolerance*, Baltimore & London, 2000, p.407

۲۳۔ اس قسم کے مذہبی مظالم کی مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے: Stephen O'Shea, *The Perfect Heresy, Life and Death of the Cathars*, London, 2000.

۲۴۔ محولہ Charles Freeman, *The Closing of the Western Mind*, London, 2002, p.310 مزید دیکھئے: Robert Markus, *Gregory the Great and his World*, Cambridge, 1997

۲۵۔ Lim, Richard. *Public Disputation, Power and Social Order in Late Antiquity*, Berkeley and London, 1995, pp.174-175

۲۶۔ Ramsay MacMullen, *Christianity and Paganism in the Fourth to Eighth Centuries*, New Haven and London, 1997, pp.86-9.

۲۷۔ ملاحظہ کیجیے: Ibad., p.94.

۲۸۔ عالم عیسائیت پر آسیب کا سایہ اتنا گہرا تھا کہ لوگوں کو ہر طرف خواہ وہ سمندر ہو یا دریا، جنگل ہوں یا پہاڑ، صحرا ہوں یا مقابر ہر طرف شیاطین اور جنوں کی چلت پھرت کا گمان ہوتا۔ دنیا اہل اکتشاف کے بجائے اصحابِ کشف کی تجربہ گاہ بن گئی تھی سوان کا یہ فطری وظیفہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ بھوت و پریت کی مضرت رسانیوں سے انسانوں کو تحفظ فراہم کریں۔ ملاحظہ کیجیے: P.Horden and N.Purcell, *The Corrupting Sea*, Oxford, 2000, p.411.
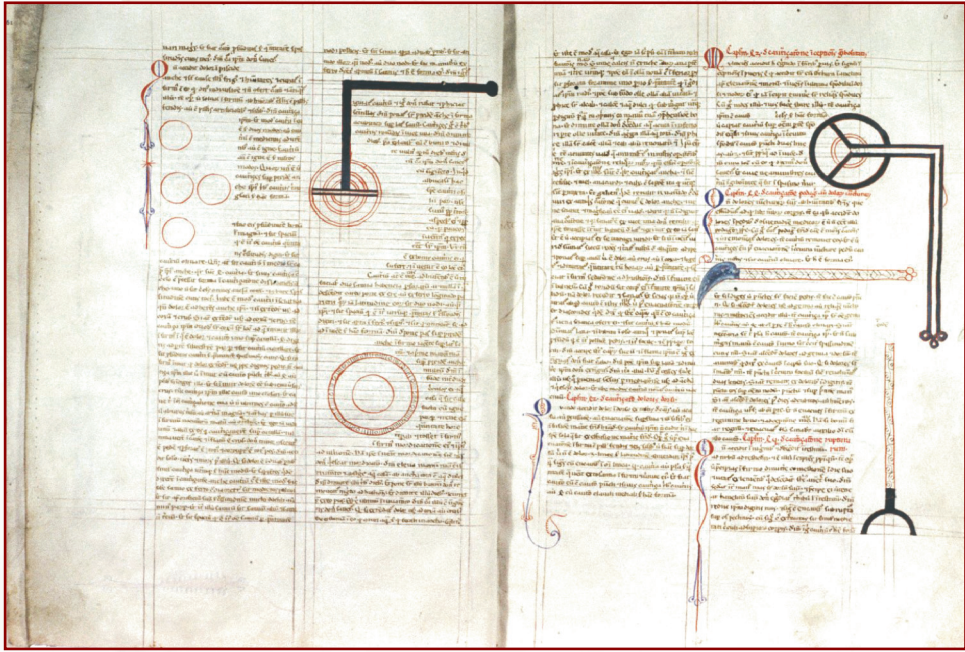
الزہراوی کے آلات جراحی لاطینی ترجموں میں

۲۹۔ Dorothee Metlitzki, *The Matter of Araby in Medieval England*, Yale University Press, 1977, p.33

۳۰۔ Richard Frye, *Ibn Fadlan's Journey to Russia: A tenth-century traveler from Baghdad to the Volga River*, New Jersey, 2006, pp.64-65.

آٹھویں صدی میں انگلینڈ پر پہلے وائیکنگ (Viking) حملے کے بعد کوئی تین سو سال کا عرصہ اسکینڈ نیویائی وائیکنگ کا عہد کہلاتا ہے۔ یہ لوگ موجودہ ناروے، ڈنمارک اور سویڈن کے رہنے والے تھے جو اپنی جنگجویانہ فطرت کے سبب یورپ کے وسیع علاقوں کو تاراج کرتے رہتے تھے۔ بحری سفروں اور تجارت کے سبب جب عربوں سے ان کا رابطہ بڑھا تو عربوں نے انھیں روس کا نام دیا۔ یہی نام آگے چل کر ملک روس کا وجہ تسمیہ بنا۔ اہل اندلس انھیں تحقیراً مجوس کہتے، البتہ فرانس اور سسلی میں انھیں نارمن کے نام سے جانا جاتا۔ یورپ کے بیشتر حصے چونکہ ان کے حملے کی زد میں رہتے اس لیے اگر اہل یورپ ان کے تذکرے میں تعصب سے کام لیتے ہیں تو کچھ عجب نہیں۔ ابن فضلان جو خلیفہ مقتدر کے حکم پر شاہ بلغاریہ کی جانب سفارت کو گیا تھا اور جس نے اس قوم کا حال اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے، نسبتاً معروضی ہے۔ ابن فضلان ان کے ڈیل ڈول اور وجاہت کی تعریف کرتا ہے البتہ تہذیب سے ان کی ناآشنائی پر خاموش نہیں رہ پاتا۔

۳۱۔ James Burke, *The Day the Universe Changed: How Galileo's Telescope Changed the Truth and*

other *Events in History that Dramatically altered our Understanding of the World, Boston,* 1995 p.38.

۳۲۔ Reader's Digest *History of Man: The Last Two Million Years*, London, 1973, p.622.

۳۳۔ غیر صحت مند اور متعفن طرز زندگی عہد وسطیٰ کے مغربی انسانوں کا شعار تھی۔ اسپین اور صقلیہ سے آنے والے مسلم ثقافتی اثرات کی مخالفت میں متشدد عیسائیوں کی طرف سے جو اعتراضات سنائی دیتے تھے ان میں ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ مسلم تہذیب کے زیر اثر ہمارے نوجوان مسلمانوں کی طرح طہارت پسند اور نہانے دھونے کے عادی ہوتے جارہے ہیں۔ مغرب میں اس وقت نہ تو حمام کا کوئی تصور تھا اور نہ ہی طہارت اور صفائی کے اصولوں سے انھیں آگہی تھی بلکہ آج بھی جب انھیں دنیا پر تہذیبی اور سیاسی غلبہ حاصل ہے۔ وہ آب دست سے انکاری اپنی سابقہ روش پر گامزن ہیں۔ ذرا اس عہد کو متصور کیجئے جب عہد وسطیٰ کے مغرب میں صابن کی دستیابی عام نہ تھی، ٹائلٹ پیپر تو کجا لوگوں کو لکھنے کے لیے کاغذ دستیاب نہ تھا اس وقت زیر حاجت طہارت کے بغیر تعفن پر قابو کیسے پایا جاتا ہوگا، خاص طور پر ایسی صورت حال میں جب یورپ میں انڈر ویئر کے استعمال کا رواج بھی نہ تھا کہ Fernand Braudel کی تحقیق کے مطابق یورپ میں انڈر ویئر کے استعمال کا رواج اٹھارویں صدی کے نصف آخر سے شروع ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لوگ گھاس اور پتوں سے زیر حاجت مقام کی صفائی کرتے، جیسا کہ چودھویں صدی کے مشہور انگریزی شاعر لینگ لینڈ کی نظم Piers Plowman کے یہ سطور ہمیں بتاتے ہیں:

And seten [sat] so til evensong, and songen umwhile [from time to time], Til Glotoun hadde yglubbed [guzzled] a galon and a gille.
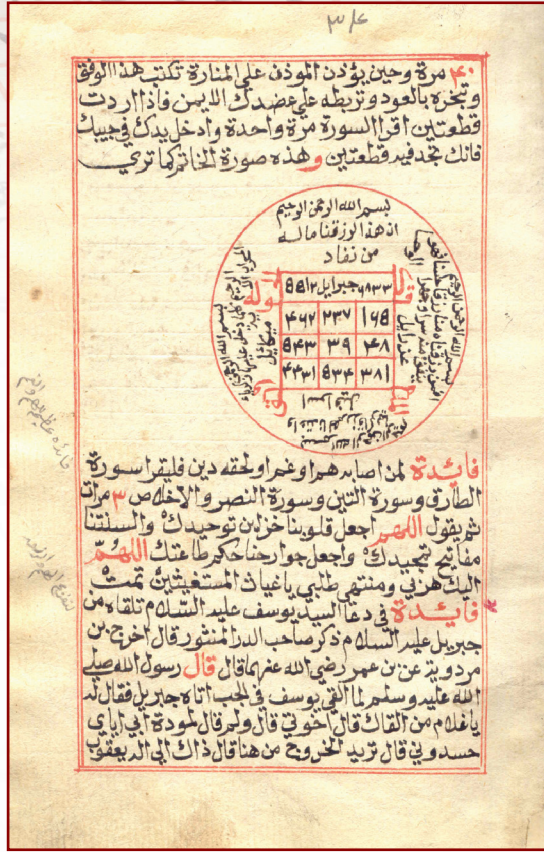
جب مسلمان اساطیری طرزِ فکر کے خوگر ہو گئے
قرآن مجید کو بازیچۂ اطفال بنانے والے عملیات ونقوش

His guttes bigonne to gothelen [rumble] as two gredy sowes;

He pissed a potel [pot full] in a Paternoster-while [the time it takes to say the Paternoster],

And blewe his rounde ruwet [horn] at his ruggebones [backbone's] ende,

That alle that herdethat horn helde hir nose after,

And wisshed it hadde ben wexed [scoured] with a wispe of firses [furze].

بحوالہ: Jack Goody, *The Theft of History*, Cambridge (New York), 2006, p.174

۳۴۔ Azim A. Nanji, ed., *The Muslim Almanac: A Reference Work on the History, Faith, Culture and Peoples of Islam* (Detroit: Gale Research, 1996), p.190.

۳۵۔ James Burke, *The Day the Universe Changed, Boston, 1995*, p.38.

۳۶۔ S. Cobb, *Islamic Contributions to Civilization*, Washington DC, 1963, p.42.

۳۷۔ ملاحظہ کیجئے: John P. McKay, Bennett D. Hill, John Buckler, eds., *A History of World Societies*, Boston, 1992, p.289.

۳۸۔ بائیبل کا یہ عربی ترجمہ اشبیلیہ کے بشپ جان کے ہاتھوں انجام پایا تھا۔ملاحظہ کیجئے:

H.S. Gehman, "The Arabic Bible in Spain", *Speculum* 1 (April, 1926), 220

۳۹۔ J. Kritzeck, *Peter the Venerable and Islam*, Princeton, 1964, p.210

۴۰۔ روز کا خیال ہے کہ طلیطلہ کو ایک علمی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے: Valentin Rose, "Ptolemaeus und die Schule von Toledo", *Hermes* 8, (1874), pp.327-349.

۴۱۔ Fletcher, Richard. *The Cross and the Crescent*, pp. 120-1

۴۲۔ Sarton, George, *Introduction to The History Of Science* (Volume II) 1931, p.114

۴۳۔ Jose Chabas and Bernard R. Goldstein, *The Alfonsine Tables of Toledo*, Boston, 2003, p.226.

۴۴۔ James Cleugh, *Spain in the Modern World*, 1953, p.70

۴۵۔ اخبار الاندلس، ج ۲، ص ۰۷، ایس، پی، اسکاٹ، *History of the Moorish Empire in Europe* مترجم منشی محمد خلیل الرحمن، مطبوعہ ۱۳۴۰ھ بحوالہ تاریخ صقلیہ، ج ۲، ص ۴۰۳، ریاست علی ندوی

۴۶۔ اوقات نماز کے تعین کے لیے مسجد کے مناروں پر سائنسی آلات کا استعمال تو عام تھا ہی اس کے علاوہ خود ادریسی کے بیان کے مطابق آبی گھڑیوں کا رواج بھی عام تھا۔اور ایک چشمہ جسے عین الاوقات کہتے تھے نمازوں کے وقت جاری ہوجاتا تھا اور

بقیہ اوقات خشک پڑا رہتا تھا۔ ملاحظہ کیجئے: نزھۃ المشتاق، ادریسی، ص ۲۸ بحولہ ریاست علی، ص ۴۰۵

۴۷۔ ادریسی نے نزھۃ المشتاق کے ابتدائیہ میں اپنے علمی منصوبہ کا جس انداز سے ذکر کیا ہے اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پیش نظر علم جغرافیہ پر ایک ایسے موسوعہ کی تیاری تھی جس میں اب تک کی تمام جغرافیائی معلومات سمٹ آئی ہو۔ پندرہ سال اس منصوبہ پر شب و روز غور و فکر اور سیاحت و مشاہدہ کے علاوہ اس فن کی مروّجہ کتابوں اور علماء سے مسلسل گفتگو جاری رہی تب جا کر کہیں چاندی کا کرہ (Planetarium) اور مختلف قسم کے چارٹ اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ مرتب ہو سکے۔ سمندروں، پہاڑوں، بندرگاہوں اور مختلف ملکوں میں پائی جانے والی اشیائے تجارت اور مختلف اقوام و قبائل کی تمام تر تفصیلات کا احاطہ بھی اس منصوبے کے پیش نظر تھا۔ دیکھا جائے تو ادریسی کی یہ کوشش معلوم اور مہذب دنیا کے علمی ارتکاز کا ایک حوصلہ مند منصوبہ تھا، جس نے آنے والے دنوں میں اہل مغرب پر گویا دنیا کے دروازے وا کر دیے۔ ملاحظہ کیجئے: نزھۃ المشتاق، ص ۳

۴۸۔ بقول پی، ایس، اسکاٹ ادریسی کا نقشہ تین سو برسوں تک بغیر کسی تبدیلی کے تمام اطراف و اکناف میں مستعمل رہا۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں اس کے مختلف اجزاء کے ترجمے ہوتے رہے۔ بعض لوگوں نے اس کی تلخیص بھی لکھی۔ جرجی زیدان نے فرانس کے میوزیم میں ایک نقشہ کی موجودگی کا ذکر کیا ہے جس میں دریائے نیل کا منبع حیرت انگیز طور پر وہی ہے جو کوئی سات سو سالوں کے بعد بیکر اور اسٹینلی نے دریافت کیا۔ ملاحظہ کیجئے: جرجی زیدان، تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، ج ۳، ص ۸۵

۴۹۔ *Sezgin, Fuat. Mathematical geography and cartography in Islam and their continuation in the Occident*. (Frankfurt am Main: Institute for the History of Arabic-Islamic Science*), 2000-20*07, p.342

۵۰۔ واسکوڈی گاما کے سفر ہند کے سلسلے میں تفصیلی معلومات کے لیے دیکھئے:

de Barros*, As*ia (Lisbon: Nacional-Casa da Moeda, 1988), p.152

۵۱۔ J.H. Kramers, "Geography and Commerce", i*n M. J. L. Young, J. D. Latham, and R. B. Serjeant, eds., Religion, Learning and Science in the Abbasid Period (Cambridge: Cambridge University Press, 1990*),, pp.93-94.

۵۲۔ M. Amari, Storia dei Musulmani di Sicilia (Florence, 1854-68), III, 365

۵۳۔ Helene Wieruszowski*, The Medieval University: Masters, Students, Learning*. Princeton, NJ, 1966, p.88

۵۴۔ Aziz Ahmad*, A History of Islamic Sici*ly (Edinburgh: Edinburgh University Press), 1975, p.85

۵۵۔ Charles Homer Haskins, "Science at the Court of the Emperor Frederick II"*, American Historical Revi*ew 27, no.4 (1922), 680

مسلم ذہن پر اساطیری طرزِ فکر کا حملہ
جب طلسماتی خواص کے حامل بصیری کے قصیدہ بردہ کے اسکرول کی موجودگی باعثِ برکت سمجھی جانے لگی۔

۵۶۔ کائنات کے سلسلے میں قرآنی تصورات کے عام ہوجانے کے سبب مغرب کی پسماندہ اقوام کے خیالات بھی بدلنے لگے۔ یونانی تصور کائنات میں خدا ایک غیر عقلی ہستی کی حیثیت کا حامل تھا جو کسی منصوبہ کے بغیر کائنات میں سرگرم تھا اور جس کے غصہ، انتقام یا جذبۂ حسد کا شکار اس کی مخلوق ہوا کرتی تھی۔ اب کائنات کے قرآنی اور عقلی تصور نے اس خیال کو عام کیا کہ کائنات کا خدائی منصوبہ خلق باطل نہیں بلکہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کا حصہ ہے۔ مسلم فلسفہ گو کہ یونانی خیالات سے مملو تھا لیکن کائنات کی طرف ایک عقلی رویہ کی دعوت قرآن مجید میں جس کثرت سے دی گئی تھی اس کے سبب نہ صرف یہ کہ تسخیر و اکتشاف کا کارواں مسلسل رواں دواں رہا، بلکہ اس تصور کی کامیابی نے پسماندہ اقوام کو بھی اپنے مذہبی معتقدات میں اس ترمیم و اصلاح پر مجبور کر دیا۔ سینٹ ٹامس اکوناز پہلے عیسائی مفکر تھے جنھوں نے ایک نئی دینیات کی تشکیل کی ضرورت محسوس کی۔ آنے والے دنوں میں ان کی کتاب *Summa Theologica* عقل پر مبنی الٰہیات کا نقیب بن گئی۔ اکوناز نے اپنے پیشرو سینٹ آگسٹائن کے بالمقابل اگر ایک نئی الٰہیات کی تشکیل کا قدم اٹھایا تو اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ یہی منہج علمی اس وقت غالب قوم یعنی مسلمانوں کا وطیرہ تھا اور اسے ہی واحد منہج علمی کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اکوناز خدا کے وجود پر عقلی دلائل کے قیام کے لیے اپنے مسلم پیشرو الفارابی کے کچھ اس طرح زیر اثر آگئے کہ ان کی تحریروں پر سرقہ کا گمان ہونے لگا۔ مسلم حکماء کی جلالت علمی کی اس عہد کے مغربی مفکرین کے ذہنوں پر اس قدر ہیبت تھی کہ ابن سینا اور غزالی کے حوالے کے بغیر

کوئی بات مستند نہیں سمجھی جاتی۔

فلسفہ میں اس تقلید کا گو کہ مغرب کو نقصان بھی اٹھانا پڑا کہ منہج کلامی کی موشگافیاں، جدالِ فقہی کے طور طریقے اور رواقیوں کی سی قیل وقال جب ان کے ہاں ایک بار دینی مباحث میں داخل ہو گئیں تو پھر اس صورت حال نے تقریباً وہی صورت حال پیدا کر دی جس سے شافعی کے الرسالہ نے مسلمان فقہاء کو دوچار کر رکھا تھا اور جس کے سبب عالم اسلام فکری تشتت اور فقہی خونریزیوں کی آماجگاہ بنا چلا آتا تھا۔ تحریک اصلاح کے بعد Protestantism میں مذہبی مناقشے کی تمام تر تلخیوں کی بنیاد دراصل اسی منہج کلامی میں پائی جاتی تھی، جس نے مغرب میں کئی صدیوں تک مختلف عیسائی فرقوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنائے رکھا اور جس کی برپا کردہ تیس سالہ مذہبی جنگوں نے بالآخر مغرب کے باسیوں کو نفس مذہب سے ہی متنفر کر دیا اور انھوں نے سماجی زندگی میں ایک طرح کی بے دینی کو قبول کر لینے میں ہی عافیت جانا۔

۵۷۔ وینس کی عمارتوں پر اسلامی طرز تعمیر کی چھاپ گو کہ خاصی نمایاں ہے، البتہ اس کا تذکرہ کم ہی ہوتا ہے۔ غالباً پہلی بار John Ruskin نے اپنی کتاب *Stones of Venice* (1851-3) میں اسلامی اثرات کے تفصیلی محاکمہ کی کوشش کی۔ ان عمارتوں کے تفصیلی مطالعہ کے بعد رسکن اس نتیجہ پر پہنچے کہ وینس کی ابتدائی عمارتوں میں جن کا زمانہ نویں سے گیارہویں صدی تک کا ہے بازنطینی اثرات نمایاں ہیں، البتہ بعد کی عمارتوں میں خالص مسلم طرز تعمیر کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے جہاں نوکیلی محرابیں اور پتلی نازک شہتیری ستون اور اس پر سے عربی طرز کی مینا کاری (Arabesque) اس بات کا احساس دلاتی ہیں کہ ناظر مشرق کے کسی روایتی شہر میں ہو۔ ملاحظہ کیجئے: John Ruskin, *The Stones of Venice*, 3 volumes, London, 1851-1853.

۵۸۔ روبرٹ گروسیٹاسٹ نے جیومیٹری کے علم کے حصول کو ناگزیر قرار دیا۔ ان کا موقف تھا:

The usefulness of considering lines, angles, and figures is very great, since it is impossible to understand natural philosophy without them... Now, all causes of natural effects must be expressed by means of lines, angles, and figures, for otherwise it is impossible to grasp their explanation. This is evident as follows. A natural agent multiplies its power from itself to the recipient, whether it acts on sense or on matter. This power is sometimes called species, sometimes a likeness, and it is the same thing whatever it may be called..." Grant. Source Book, p.385

مزید ملاحظہ کیجئے: A.C. Crombie, *Robert Grosseteste and the Origins of Experimental Science, 1100-1700* (Oxford: Clarendon Press, 1971)

۵۹۔ گزشتہ صفحات میں ہم اس بات کا تذکرہ کر چکے ہیں کہ کس طرح الخوارزمی کے ترجموں کے نتیجہ میں مغرب میں رومن اعداد کے مقابلہ میں عرب۔ہندی ہندسوں کے استعمال کا رواج ہوا اور خاص طور پر گربرٹ کے چار صفحاتی مقالے کی اشاعت
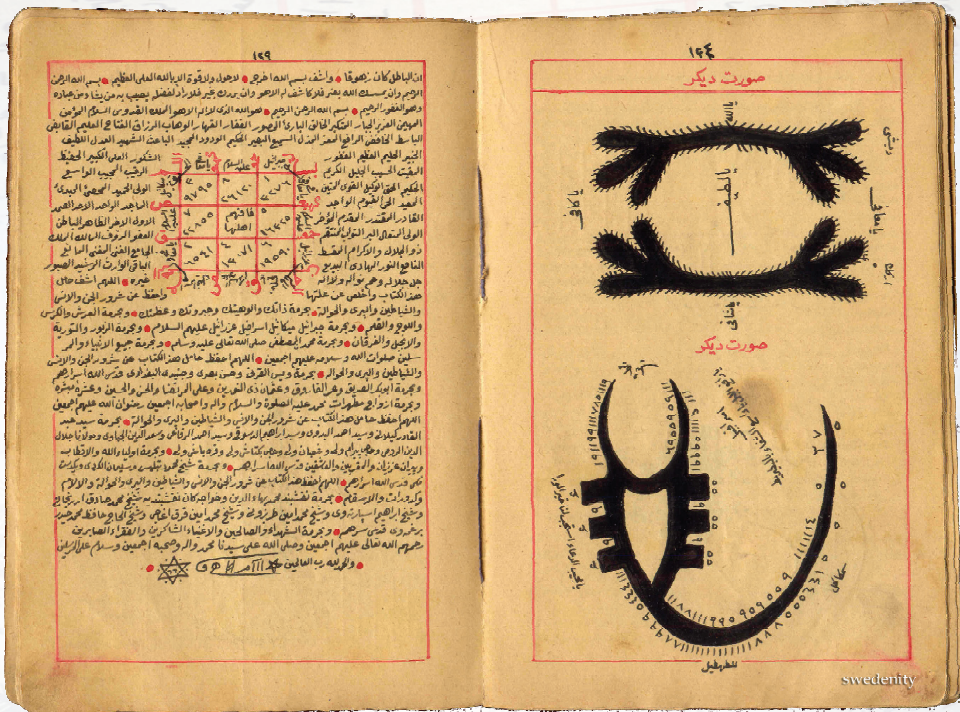
جب مسلم ذہن کی موت واقع ہوگئی۔
ترک خلافت کے عہد میں وفق ونقوش اور طلسم کی مقبولِ عام کتاب

کے بعد ایک انقلاب آگیں کیفیت پیدا ہوگئی۔ ریاضی کا علم جیسے جیسے عام ہوتا گیا اہل مغرب کے لیے کائنات کی تفہیم آسان ہوتی گئی۔ خاص طور پر خوارزمی کی کتاب **الجبر و المقابلۃ** کی اشاعت کے بعد اس بات کا امکان پیدا ہوگیا کہ حق کی تلاش کے عمل میں ہندسوں کے علاوہ حروف کے ایکویشن سے بھی مدد لی جاسکتی ہے، یعنی سائل کو جس طرح ۲ + ۲ = ۴ کے ذریعہ سچائی کی قطعیت کا علم ہوتا ہے یا جس طرح وہ اس بات پر یقین واثق رکھتا ہے کہ مثلث کے دو زاویے مل کر ہمیشہ ایک زاویہ قائمہ کے برابر ہوتے ہیں، اسی طرح الجبرا میں وہ حروف کی علامتوں کے ذریعہ تلاش حق میں سرگرداں رہ سکتا ہے۔ Algorism یا Algorithm (یعنی الخوارزمی) کا یہ منہج جس کے دم سے آج کمپیوٹنگ کی دنیا قائم ہے، اہل مغرب کے لیے تلاش حق میں بڑا معاون ثابت ہوا۔ یہ ایک طرح کی نئی تجزیاتی زبان تھی جس کے مالہ و ماعلیہ کو قطعیت کے ساتھ پرکھا جاسکتا تھا۔ ڈیکارٹ نے الجبرا اور جیومیٹری دونوں سے ہی اپنے فلسفیانہ منہج کی تعمیر میں مدد لی، جیسا کہ *Discourse on Method* کے صفحات سے ظاہر ہے۔ اور ڈیکارٹ کے منہج کا Locke کے empiricism اور سارتر کی وجودیت پر جو اثر ہے اس سے اہل فن ناواقف نہیں بلکہ ریاضی کے احساس قطعیت نے کانٹ کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ شبہات کے علی الرغم علم یا حقیقت

کی کوئی نہ کوئی شکل بھی بہر حال موجود ہے اور اگر ایسا ہے تو بقول کانٹ مابعد الطبیعات کو بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ Voltaire تو علوم ریاضی سے اس قدر مبہوت تھے کہ انھوں نے حقیقت کو اسی منہج میں مبرہن پایا۔ بقول ان کے جیومیٹری میں کوئی فرق نہیں، یہاں نہ کوئی اقلیدسی جیومیٹری ہوتی ہے اور نہ آرکیمیڈیسی جیومیٹری۔ یہاں سچ کی صرف ایک قسم ہوتی ہے اور وہ اتنی مبرہن کہ ہر شخص اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اگر اس اصول کو مذہب پر منطبق کیجیے تو اخلاقیات بھی جیومیٹری کی طرح ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ ریاضی کے سائنسی اظہار کی بنیادی زبان بن جانے کے سبب نہ صرف یہ کہ کوپرنکس اور نیوٹن کائنات کو ایک میکانیکی ماڈل کی حیثیت سے متصور کر سکے بلکہ سماجی علوم کو اعتبار بخشنے میں بھی اعداد و شمار کے حصول اور اس کی تعبیرات نے بڑی اہمیت اختیار کر لی۔

٦٠۔ رومن طرز کی تمام عمارتوں میں اور قدیم بازنطینی طرزِ تعمیر میں نصف دائروی محرابوں کا استعمال زینت اور استحکام دونوں مقاصد کے لیے مستعمل تھا، جس سے عمارت بڑی حد تک ان محرابوں کے سائز کی پابند ہو جاتی تھی۔ مسلم عہد میں نہ صرف یہ کہ نوکیلی محرابوں، جسے horse shoe محراب بھی کہتے ہیں، کے استعمال کی ریت قائم ہوئی، بلکہ چھتوں کے استحکام کے لیے محرابی چھتوں (ribbed vault) کا رواج ہوا اور چہار پہل، ہشت پہل شہتیروں کا سلسلہ بھی چل نکلا جس پر گنبدوں کا بوجھ استحکام کے ساتھ ٹکا رہتا اور عمارت میں نفاست اور نزاکت پیدا ہو جاتی۔ بنیادی طور پر اس کاریگری کے پیچھے جیومیٹری کا گہرا علم کارفرما تھا۔ اہلِ مغرب کو پہلی بار اس قسم کی عمارتیں یا تو عالم اسلام کے سفر کے دوران دیکھنے کو ملیں یا پھر اسپین، وینس اور صقلیہ میں مسلم طرز کی عمارتوں نے انھیں اس فن سے متعارف کرایا۔ بارھویں صدی میں عرب علوم اور خاص طور پر جیومیٹری کا علم عام ہو جانے کے سبب مغرب میں اس طرز کی عمارتوں کا کریز پیدا ہوا۔ اس عہد کی مشہور اور پرشکوہ عمارتیں مثلاً نوٹرڈیم (Cathédrale Notre-Dame de Chartres) اور Bourges Cathedral آج بھی اپنے عرب مسلم اثرات پر شاہد ہیں۔ ایک عرصہ تک اس طرز تعمیر کو گوتھک طرز تعمیر سے موسوم کیا جاتا رہا، البتہ بعد کی تحقیق و جستجو نے بالآخر اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیا کہ گوتھک طرز تعمیر ساراسن یا مسلم طرز تعمیر کا ہی دوسرا نام ہے۔

ملاحظہ کیجیے مغرب میں مسلم طرز تعمیر سے پہلے کی قدیم عمارتیں جن میں نصف دائروی محرابوں کا استعمال عام ہے:

مسلم یا ساراسن اثرات کے بعد نوکیلی محرابوں کے تعارف سے عمارتوں کی نفاست اور نزاکت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا:

Catedral de La Almudena, Madrid 1883-1993

٦١۔ Ivor Bulmer-Thomas, "Euclid and Medieval Architecture", *Archaeological Journ*al 136(1979): pp.141-44

٦٢۔ ملاحظہ کیجیے: Richard Appigneresi and Chris Garratt, *Introducing Post-Modernism* (Cambridge: Icon Books, 1995), p.6.

عالمِ اسلام میں اساطیری ذہن کا غلبہ: سلسلۂ قادریہ کا اجازت نامہ
جب اصر واغلال نے مسلم ذہن پر اپنی گرفت مضبوط کر لی

٦٣۔ فن تعمیر سے واقف کاروں کے نزدیک یہ بات تسلیم شدہ چلی آتی ہے کہ مغرب کی بیشتر تہذیبی عمارتیں مسلم طرز تعمیر کی اقتداء میں تعمیر کی گئی ہیں، البتہ اسلام اور مسلمانوں سے عمومی بغض وعناد کے سبب اسے مسلم طرز تعمیر کے بجائے گوتھک طرزِ تعمیر کا نام دیا جاتا ہے۔ کرسٹوفر ورن نے پہلی بار بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ اپنی معرکتہ الآرا تالیف *Parentalia* (مطبوعہ ۱۷۵۰ء) میں اس خیال کا کھل کر اظہار کیا کہ اس طرزِ تعمیر کو گوتھک کے بجائے اسلامی طرزِ تعمیر کا نام دیا جانا چاہئے۔ ورن کہتے ہیں کہ جس کسی کو اس موقف کی صحت میں شبہ ہو وہ اسپین کی مسلم عمارتوں اور خاص طور پر ان کیتھیڈرل کا مطالعہ کرے جو مسلم عہد کی تعمیر کردہ ہیں، مثلاً برگوس کے چرچ کا فِض کے محلات سے تقابلی مطالعہ کرنے سے اس بات کا بآسانی اندازہ ہوجائے گا کہ گوتھک طرز تعمیر دراصل مسلم طرز تعمیر کا ہی متعصّبانہ نام ہے۔ ورن کہتے ہیں کہ جو طرز تعمیر یوروپ میں پہلی بار دسویں صدی عیسوی میں رائج ہوا اس کا سہرا گوتھ اقوام کے سر باندھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ *Essays on Gothic Architecture* (مطبوعہ ۱۸۰۰ئ) کے مطالعہ سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ گوتھک طرز تعمیر کا اسلامی الاصل ہونا اہل فن کے لیے اجنبی خیال نہیں رہا ہے۔ ۱۷۶۵ء میں Stephen Riou نے اپنی تالیف *The Grecian orders*

of architecture میں اس موقف کا اظہار کیا کہ آج جس چیز کو گوتھک کہا جاتا ہے اس کا صحیح نام دراصل Saracenic یا Moresque (یعنی اسلامی) ہونا چاہئے جو اسپین کے راستے یورپ میں متعارف ہوا۔ کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار Henry Hallam نے اپنی تالیف *View of the state of Europe during the Middle Ages* (مطبوعہ ۱۸۱۸ء) میں بھی کیا ہے۔ بقول ہنری، اینگلو نارمن کیتھڈرل کی حیثیت اسپین کی اسلامی عمارتوں کے چربہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ کتاب کے متن میں ہم نے مغرب کی بعض تاریخی عمارتوں کے مقابل اسلامی عمارتوں کی بھی تصویریں دی ہیں جن کے تقابلی مطالعہ سے حقیقت مزید مبرہن ہو سکے گی۔

Burgos Cathedral, Spain

Christopher Wren, *Parentalia, or Memoirs of the family of the Wrens*, p.297.

۶۴۔ Anderson, William. *The Rise of the Gothic*, London, 1985, p.39.

۶۵۔ ملاحظہ کیجئے نوکیلی محرابوں، قوسی چھتوں اور چہار پہل دائروی شہتیروں کے استعمال کے بعد وجود میں آنے والے مغرب کے دو اہم کیتھڈرل جن کا حسن مسلم طرز تعمیر کا رہین منت ہے۔

۶۶۔ مثال کے طور پر Doge's Palace اور Fondaca dei Turchi میں استعمال ہونے والی نوکیلی محرابوں کا مقابلہ الازہر کی جامع

نوٹرڈیم کیتھیڈرل (فرانس) میں مسلم طرز کی نوکیلی محرابوں کی حسن کاری کا ایک پرجلال منظر

Doge's Palace, Venice

مسجد یا عہد ممالیک کی عمارت وکالۃ الغوری، قاہرہ اور مشہد کے ایک قدیم مدرسے سے کیجیے تو ان عمارتوں کے باہمی تہذیبی تعلق کو سمجھنا کچھ دشوار نہ ہوگا۔

۶۷۔ قوسی محرابوں (ribbed domes) کا استعمال دسویں صدی عیسوی میں مسلم اسپین کے علاوہ شمالی افریقہ اور فارس کے علاقوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ بنیادی طور پر تکنیک تو وہی ہے البتہ قوسی شہتیروں کے استعمال میں حسب ضرورت تبدیلی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر کبھی قوسی دائروں کو مرکز میں اور کبھی کنارے کردینے سے اسے حسب منشا اور حسب موقع استعمال کیا جاتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: Mamoun Sakkal, (Computational) *Geometry in Islamic Architecture at:*

Fondaca de Turchi, Venice

http://www.sakkal.com/islamic_geometry/rib_domes.html

۶۸۔ اکتشافی علوم جسے ایڈلارڈ Studia Arabum کا نام دیتے ہیں، اس کے حصول کی خاطر ایڈلارڈ کوئی سات سال تک مختلف ملکوں کی سیر کرتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے عربی زبان میں کامل استعداد پیدا کی۔ انھوں نے اپنی کتاب *Questiones Naturales* کے ابتدائیہ میں اس تعلیمی سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ پہلے فرانس گئے جہاں انھوں نے Toursاور Laon میں تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے سالرنو، سسلی، شام، اناطولیہ اور پھر اسپین گئے۔ اسپین سے واپسی کے بعد انھوں نے اپنے شہر باتھ میں تعلیم و تعلّم اور ترجمہ و تالیف میں زندگی گزار دی۔ ایڈلارڈ کی تصنیفات کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج بھی ان کی زیادہ تر تالیفات اور تراجم کے مسودے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ یورپ میں چھاپہ خانہ کے رواج کے بعد جو کتابیں پہلے مرحلے میں طبع ہوئیں ان میں ایڈلارڈ کی *Questiones Naturales* کا نام بھی آتا ہے۔

مسجد نائین، ایران

۶۹۔ Lynn Thorndike, *History of Magic and Experimental Science. 1923-1958 in 8 volumes* II, p.30.

۷۰۔ *Questiones Naturales*, p.20.

۷۱۔ *Questiones Naturales*, VI, p.11.

۷۲۔ بقول ایڈلارڈ: I do not detract from God. Everything that is, is from him and b ecause of him. But [nature] is not confused and without system and so far as human knowledge has progressed it should be given a hearing. Only when it fails utterly should there be a recourse to God.

Louise Cochrane, *Adelard of Bath: First English Scientist*, London, 1994, p.45

۷۳۔ ایڈلارڈ سے پہلے بھی استرلوب پر گربرٹ (۹۴۵ء-۱۱۰۳ء) جو بعد میں پوپ Sylvester-II کے نام سے مشہور ہوئے، کا ترجمہ معروف تھا۔ اس کے علاوہ اس بارے میں والچر کا نام بھی قابل ذکر ہے، البتہ والچر کے ابتدائی اور قدرے ناکام تجربوں کے سبب اس وقت تک وہ عوامی غلغلہ پیدا نہ ہو سکا تھا جو ایڈلارڈ کی مرتب کردہ مقامی زیج اور اقلیدس کے لاطینی ترجموں کے سبب پیدا ہو گیا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نصف صدی کے دوران استرلاب کا حصول اب پہلے کے مقابلے میں آسان ہو گیا تھا۔ بارھویں صدی کے اختتام تک کئی دوسرے مصنّفین کی کتابیں بھی منظر عام پر آ گئی تھیں اور چودھویں صدی

عیسوی تک تو اس کے بغیر کسی کا علم معتبر نہ سمجھا جاتا تھا، جیسا کہ انگریزی شاعر چوسر نے اسٹرلوب پر اپنی تصنیف میں ذکر کیا ہے۔مزید تفصیل کے لیے دیکھئے:

وکالۃالغوری،قاھرہ

Paul Kunitzsch, "Al-Khwarizmi as a Source for the Sententie astrolabii", i*n From Deferent to Equa*nt, eds. David A. King and George Saliba, New York, 1987, pp.227-36.

۷۴۔ ایڈلارڈ نے اپنے معاصر پرنس ہنری، جو آگے چل کر شاہ ہنری ثانی بنے، کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ فرمایا:

Concerning the universe... and its different parts I will write in Latin what I have learned from the Arabs. You can take it for granted that the universe is not square, or rectangular, but a sphere. What is said of the sphere can be said of the universe.

۷۵۔ والچر نے ۱۸/اکتوبر ۱۰۹۲ء کو انگلینڈ میں اسی تجربہ کو دکھانے کی کوشش کی جو ان سے کوئی سو سال پہلے البیرونی انجام دے چکے تھے۔ یہ ۲۴/مئی ۹۹۷ء کی بات ہے جب بغداد میں ابوالوفا اور اِدھر کاتھ میں آمو دریا کے کنارے البیرونی چاند گرہن کا انتظار کر رہے تھے تا کہ ان دو جگہوں کے مابین طول البلد کی پیمائش کی جا سکے۔ جہاں البیرونی اور ابوالوفا کے مشترکہ تجربہ کی کامیابی نے عالم اسلام کو ایک انبساط انگیز کیفیت سے دوچار کر دیا تھا وہیں والچر اور ان کے ساتھی AlfonsiPetrus کا تجربہ ان کی مایوسیوں کا سبب بنا۔ بقول والچر: I still had no certainty about the time of the eclipse and I was distressed about this, because I was planning to draw up a lunar table and had no starting point.

بالآخر الخوارزمی کی زیج کی بنیاد پر ایک مقامی زیج کی تیاری کے پروجیکٹ میں ان حضرات کو کامیابی نہ ہو سکی۔ملاحظہ کیجئے:

Walcher of Malvern, Oxford, Bodleian Library MS Auct. F.I.9, f.90, quoted in R. W. Southern, *Medieval Humanism and other Studi*es, p.167.

۷۶۔ ایڈلارڈ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے الخوارزمی کی زیج اور اس پر المتریجی کے اضافوں کی بنیاد پر خاص انگلستان کے لیے ایک زیج مرتب کرنے میں کامیابی حاصل کی۔خوارزمی کی زیج بغداد کے لیے مرتب کی گئی تھی جسے المتریجی کے قرطبہ کے مطابق ڈھال دیا تھا اور اب ایڈلارڈ نے ان کتابوں کے تفصیلی مطالعہ اور اپنے مشاہدے کی روشنی میں مقامی زیج کی ترتیب میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔اس طرح پہلی بار انگلستان بلکہ عالم عیسائیت کو فلکیاتی علوم کے اطلاقی پہلو سے واقف ہونے کا

موقع ملا تھا۔ایڈلارڈ کی یہ زیچ دوسری بہت سی متعلقہ معلومات سے بھی پر تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں ۷ ۳/ابواب اور اعداد وشمار کے ۱۱۶ گوشوارے موجود تھے۔ سب سے اہم بات یہ کہ انھوں نے پہلی بار مغرب کے ہاتھوں میں ایک ایسا زیچ تھمادیا جو قرطبہ یا بغداد کے بجائے مقامی شہر باتھ کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔

۷۷۔ John of Worcester, *Chronicon Iobannis Wigornensis*, trans. and ed. Patrick McGurk (Oxford: Clarendon Press, 1998), 3:259-60.

۷۸۔ Haskins, Charles Homer. *Studies in the History of Medieval Science*, Cambridge, Mass, 1924, p.135

۷۹۔ Oliverus Brito, Philosophia, quoted in McCluskey, *Astronomies and Cultures*, p.191

۸۰۔ Charles king, "Leonardo Fibonacci", i*n Five Fingers to Infinity. A Journey through the History of Mathematics*. Open Court, Chicago, 1994, pp.252-54,

۸۱۔ Robert Grosseteste تیرہویں صدی کی ابتدا میں جب بصریات پر مصروف مطالعہ تھے اس وقت تک ابن الہیثم کی کتاب المناظر کا ترجمہ عام نہ ہوا تھا۔ ان کی دسترس میں اقلیدس اور بطلیموس کی جو تحریریں عربی زبان سے ترجمہ ہو کر پہنچیں تھیں ان کے مطابق کسی شئی کے دکھائی دینے کا سبب اس سے نکلنے والی شعاعوں کو بتایا گیا تھا۔ حنین بن اسحٰق اور الکندی کی تحریریں بھی آنکھ اور شئی کے بیچ بین بین کا نقطہ نظر اختیار کرتی تھیں۔ روبرٹ ان ہی خطوط پر اپنے علم وفن کی دنیا سجائے رہے۔ یہ بات روجر بیکن اور ان کے معاصرین کے حصہ میں آئی، جن کی تحریروں کا زمانہ تیرہویں صدی کا دوسرا نصف ہے کہ وہ کتاب المناظر کے ناقابل تنسیخ علم کی روشنی سے ایک ایسی مشعل جلائیں جو آنے والی صدیوں میں نہ صرف یہ کہ مغرب بلکہ پوری دنیا کو منور کیے رکھے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: A.C. Crombie, *Robert Grosseteste and the Origins of Experimental Science*, 1100-1700 (Oxford: Clarendon Press, 1953, pp.116-117

۱۸۶

۸۲۔ ملاحظہ کیجیے بیکن اپنے نقطہ نظر کو استناد بخشنے کے لیے کس طرح ابن الہیثم کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کے مطابق بصریات کے سلسلے میں ان کے نقطہ نظر کی صحت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود ابن الہیثم کا بھی یہی موقف ہے:

It is... evident that the eyes are not alone in rendering judgment concerning visible things; but judgment begins in the eyes and is completed by the ultimate sentient power, the source of the visual faculty, [located] in the common nerve. It is equally clear that the eyes do perceive, and not only the common nerve. But since the eyes are connected to the source of the [visual] power, and powers flow from it to the eyes, so that the sensitive power is extended through the whole [optic]

جب اساطیری طرزِ فکر غالب آ گیا
تیموری حکمران اسکندر سلطان کا جدولِ تنجیم و زائچہ نویسی

nerve from the common nerve to the eyes, as Alhacen says, therefore the visual act is one and undivided, carried out by the eyes and the common nerve.

محولہ Roger Bacon and the origins of "Perspectiva" in the Middle Ages: a critical... by Roger Bacon, David Charles Lindberg, P.IXXV

۸۳۔ پیچم بھی بیکن کی طرح اپنے موقف کی تائید میں ابن الہیثم کو آخری حوالے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

Since vision is of the same kind in all animals, and certain animals are able to bestow the multiplicative power on colors by the light of their eyes so as to see them at night, is follows that the light of the eye has some effect on [external] light. Whether it goes beyond this, I do not determine, save only by following in the foot-steps of the Author [i.e., Alhazen], as I have said before. (David, C. Lindberg, op cit)

۸۴۔ Edward Grant, *A Source Book in Medieval Science*, Harvard University Press, 1974, p.406

۸۵۔ عہدِ وسطیٰ کے یوروپ میں کتاب المناظر کے اثرات پر مفصل بحث کے لئے دیکھئے *John Pecham and the Science of*

Optics: Perspectiva Communis

David C.Lindberg edition, University of Wisconsin Press, 1970, n.44.

۸۶۔ Roger Bacon in *Opus tertium* quoted by John Maxson, *The Story of Alchemy and Early Chemistry*, Dover, 1960, pp. 262-3.

۸۷۔ Thorndike, I.ynn. *A History of Magic and Experimental Science* (8 vols.) New York, 1923-58, vol.2, p.141.

۸۸۔ Marie-Therese d'Alverny, "Translations and Translators", in *Renaissance and Renewal in the Twelfth Century*, ed. Robert L. Benson and Giles Constable (Cambridge, MA: Harvard University Press, 1982), 440

۸۹۔ H. Schipperges نے اس موضوع پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے: Ideologie und Mistoriographie des Arabismus. دیکھئے رسالہ، Sudhoffs Archive سال ۱۹۶۱ء (ضمیمہ)، ص ۱۱، ۱۵

۹۰۔ Omar A. Farrukh, *The Arab Genius in Science and Philosophy* (translated from the Arabic by John B. Hardie) Washington D.C., 1954, p.66.

۹۱۔ محولہ فواد سیزگن، ص ۵۴

۹۲۔ محولہ فواد سیزگن، ص ۵ - ۱۶۴

۹۳۔ *Islam and Science*, Ehsan Masood,London, 2009, p.4,5

۹۴۔ جارج صلیبہ نے ناقابل تردید شواہد اور دلائل کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ کوپرنکس کی *De revolutionibus orbium coelestium* ابن شاطر کی کتاب سے استفادہ کا نتیجہ ہے حتیٰ کہ **الصغیرۃ والکبیرۃ** (Tusi-couple) کا ڈائی گرام بھی بغیر کسی حک و اضافہ کے ابن شاطر سے ماخوذ کردہ ہے۔ محققین نے اس امر کی شہادت بھی فراہم کی ہے جس سے کوپرنکس کے ویٹیکن کی لائبریری میں جانے اور وہاں ابن شاطر کی کتاب کے موجود ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے:

George Saliba, *Islamic Science and making of the European Renaissance*, London, 2007

۹۵۔ John Freely, *Aladdin's Lamp: How Greek Science came to Europe through the Islamic World*, New York, 2010, p.103

۹۶۔ ایضاً

۹۷۔ Dizer, Muammar. "Observatories and Astronomical Instruments." in A. Y. Al-Hassan, ed., The Different Aspects of Islamic Culture. Vol 4: Science and Technology in Islam. Part 1: The Exact Sciences. Paris: UNESCO Publishing, 2001, pp. 235–265.

۹۸۔ محولہ فواد سیزگن، تاریخ علوم میں تہذیبِ اسلامی کا مقام، ص ۱۳۶

۹۹۔ محولہ فواد سیزگن، ص ۱۲۵

۱۰۰۔ محولہ فواد سیزگن، ص ۸۷

۱۰۱۔ Houbert THouben, *Roger II of Sicily*, Cambridge Univ. Press, New York, 2002, p.179

۱۰۲۔ محولہ فواد سیزگن، ص ۲۷-۱۲۶

۱۰۳۔ جارج مقدیسی نے اس بات کے ناقابل تردید شواہد فراہم کیے ہیں کہ فرانس میں فاؤنڈیشن کا تصور یا انگلینڈ میں ٹرسٹ کا قیام دراصل مسلمانوں کے اوقاف سے مستعار ہے۔ رہا رومن یا بازنطینی حکومتوں میں Pia Causa کا تصور تو یہ اس اعتبار سے وقف سے مختلف ہے کہ یہاں وقف کرنے والے کو وقف کے مقاصد پر کنٹرول کا اختیار نہیں ہوتا۔ اصحاب خیر اپنی اعانتیں چرچ کو اس خیال سے عطا کر دیتے ہیں کہ وہ غرباء میں اپنی صوابدید کے مطابق ان رقوم کو تقسیم کر دے۔ اس کے برعکس وقف کی املاک متعینہ مقاصد کے لیے ہی استعمال ہوتی ہے اور اس کے اہداف کے تعین کا صاحب وقف کو پورا اختیار ہوتا ہے۔ College des Dix-Huit یعنی اٹھارہ نادار طلباء کا کالج تاریخی اعتبار سے غالباً یورپ میں قائم ہونے والا پہلا ادارہ ہے جو وقف کے طور طریقوں کے مطابق قائم کیا گیا تھا۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے:

George Makdisi, *The Rise of Colleges: Institutions of Learning in Islam and the West*, Edinburgh Univ Press, 1981, p.228

علومِ عربیہ کے طالبِ علم دانیال آف مورلے جنہوں نے ریاضی اور فلکیات سے یورپ کو واقف کرایا، ان کی تصنیف Philosophia کا ایک ورق

۱۰۴۔ یہ خیال کہ مغرب میں یونیورسٹی کا تصور پوری طرح عالم اسلام سے مستعار ہے اور یہ کہ یونیورسٹی کے متعلقات اور اصطلاحیں اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ عالم اسلام کے سرحدی علاقوں میں ظہور پذیر ہوئیں اور پھر اندرونِ یورپ علمی زندگی کا حصہ بن گئیں۔ اس بارے میں جارج مقدیسی نے بڑا ہی چشم کشا مطالعہ فراہم کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

George Makdisi, *The Rise of Colleges: Institutions of Learning in Islam and the West* (Edinburgh

جامع قرطبہ: دیواروں کی بالائی تزئین، محرابوں اور جالیوں کی تراش وخراش نے آکسفورڈ اور کیمبرج کی عمارتوں کو متاثر کیا اور پھر مغرب کی ان دانشگاہوں کی اتباع میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (علی گڑھ) کی عمارتیں وجود میں آئیں۔

University Press, 1981) and *The Rise of Humanism in Classical Islam and the Christian West* (Edinburgh University Press, 1990).

۱۰۵۔ Helene. Wieruszowski, *The Medieval University: Masters*, Students, Learning, Princeton, 1966, pp.173-4

۱۰۶۔ Robert Stephen Briffault, *The Making of Humanity*, London, 1919, p.199

۱۰۷۔ مثال کے طور پر آکسفورڈ یونیورسٹی کی ایک قدیم عمارت تعمیر شدہ ۱۱۶۷ء کی پہلی جھلک سے ہی ایک باخبر ناظر کے لیے اس بات کا اندازہ کرنا چنداں مشکل نہیں ہوتا کہ بارہویں صدی کی اس عمارت پر صقلیہ، قرطبہ کی ان عمارتوں کی چھاپ نمایاں ہے جسے اس عہد میں غالب اسلامی تہذیب کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ ذیل میں ہم دو تصویریں آمنے سامنے دے رہے ہیں جس میں ایک آٹھویں صدی عیسوی کی تعمیر شدہ جامع قرطبہ کی تصویر ہے اور دوسری بارہویں صدی عیسوی کے آکسفورڈ کی، جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکے گا کہ جدید مغرب کی تمام جلوہ نمائی دراصل اسلامی تہذیب سے مستعار کردہ ہے۔

۱۰۸۔ George Makdisi, *Rise of Colleges: Institutions of Learning in Islam and the West, Edinburgh Univ Press, 1981, pp.272-76*

مسلم طرزِ تعمیر کی اتباع میں بننے والی اکسفورڈ کی اس عمارت پر جامع قرطبہ جیسی عمارتوں کے اثرات صاف محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

۱۰۹۔ مغربی مورخین اس بات سے گریزاں ہیں کہ جلسۂ تقسیم اسناد میں گاؤن اور ہڈ کی روایت کا ماخذ کیا ہے۔ وہ یہ تو ضرور کہتے ہیں کہ ان کے ہاں یہ سب کچھ عہد وسطیٰ سے رائج چلا آتا ہے۔ مقدیسی نے جدید یونیورسٹی میں رائج اٹھارہ مصطلحات کے سلسلے میں ٹھوس تاریخی شواہد فراہم کیے ہیں کہ یہ فی الواقع اپنی اصل عرب اصطلاحوں کے لاطینی ترجمے ہیں۔ مثال کے طور پر کالج اگر کلیہ سے مستعار ہے تو یونیورسٹیوں میں قائم کی جانے والی چیئر اس تاریخی پس منظر کی نشاندہی کرتا ہے جب مسلمان عالم کرسی پر براجمان ہوتا اور طلبا اس کے گرد فرش پر حلقہ ڈالے ہوتے۔ یہیں سے اکیڈمک سرکل کا تصور پیدا ہوا اور یہیں سے یہ خیال بھی برآمد کیا گیا کہ بعض ممتاز طلباء کو فیلو یعنی صاحب (لاطینی Socius) کے مقام پر فائز کیا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

Makdisi, George (April-June 1989), "Scholasticism and Humanism in Classical Islam and the Christian West", Journal of the American Oriental Society (Journal of the American Oriental Society, Vol. 109, No.2) 109 (2). مزید ملاحظہ کیجیے: Goddard, Hugh (2002), *A History of Christian-Muslim Relation*s, Edinburgh University Press, p.100.

۱۱۰۔ Norman Smith, *A History of Dams*, London, 1971, p.16.

۱۱۱۔ Hill, D.R., *Islamic Science and Engineer*ing, p.178

۱۱۲۔ Glick Thomas, *Irrigation and Society in Medieval Valenc*ia pp.169-170, 186, 214, 230, 264-265.

۱۱۳۔ سقیا بظاہر ایک سادہ مگر درجنوں اجزاء پر مشتمل ایک پیچیدہ مشین تھی۔ مٹی یا دھات کی چھوٹی چھوٹی بالٹیاں ایک چرخی (wheel) کے ذریعہ کنویں میں لٹکا دی جاتیں، وہ چرخی دوسری چرخی سے زاویۂ قائمہ بناتے ہوئے کھانچوں (gears) سے متصل کر دی جاتی۔ اب اس دوسری مسطح چرخی کو لکڑی کے ستون سے اس طرح ایستادہ کر دیا جاتا کہ جب جانور اپنی محوری گردش کے لیے مسطح چرخی کو دائروی حرکت دیتے تو کھانچوں کے ذریعہ کنویں میں معلق چرخی چل پڑتی اور پھر اس سے متصل بالٹیوں کی لڑی میں پانی بھر کر اوپر آنے کا سلسلہ جاری ہو جاتا۔ اس طریقہ کے ذریعہ گہرے سے گہرے کنویں سے اونچی سے اونچی عمارت

تک پانی کا سرعت کے ساتھ منتقل کرنا ممکن ہو گیا تھا۔ اس عہد میں جب برقی موٹروں سے دنیا واقف نہ تھی، سقیا کی ٹکنالوجی نے جانوروں کی مدد کے ذریعہ پانی کا حصول آسان بنا دیا تھا۔

۱۱۴۔ نوریہ ایک طرح کی خودکار آبی مشین تھی جو ندی کی لہروں کے سہارے چلتی رہتی۔ لکڑی کی ایک بڑی چرخی جس کے کناروں پر لکڑی کے ایسے ڈبے نما پائدان لگے ہوتے جن میں پانی جمع ہو کر چرخی کے گھومنے پر اوپر پہنچتا رہتا، جہاں ایسی نالیاں ایستادہ ہوتیں جو انھیں حسب ضرورت مختلف سمتوں میں لے جا سکیں۔ ندی کے بہاؤ سے چرخی کی حرکت جاری رہتی اور اس طرح ندی سے سطح زمین تک پانی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہتا۔ عہد وسطیٰ کے عالم اسلام میں نوریا کا استعمال عام تھا۔ آج بھی حما (شام) کے مقام پر نوریا کی پرانی یادگار اکتشافی طرز فکر کی یاد تازہ کرتی ہے۔

۱۱۵۔ صقلیہ، طلیطلہ اور عیسائی اندلس کے دوسرے شہروں میں بھی مسلمان اہل فن اور اکتشافی علماء کی جس طرح پذیرائی ہوتی رہی اور عیسائی حکمراں جس طرح اپنے مفتوحین کے سلسلے میں ایک طرح کی جلالت و ہیبت کا شکار رہے ایسے ماحول میں متحرک صنعتی یونٹوں کا عیسائیوں کے قبضہ میں چلے جانا کچھ باعث حیرت نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا اس لیے بھی کہ مسلمانوں کا رویہ شکست کی شکل میں شہروں کی تاراجی اور تہذیب کی بربادی کا نہیں تھا۔ طلیطلہ میں نہ جانے کتنی صنعتی یونٹیں نئے عیسائی حکمرانوں کو اپنی تمام تر ٹکنالوجی کے ساتھ منتقل ہو گئیں۔ تاریخی مصادر میں Xativa میں کاغذ کے ایک کارخانہ کا ذکر ملتا ہے جو متحرک حالت میں اسپینی عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔

۱۱۶۔ گزشتہ صفحات میں ہم اس بات کا تذکرہ کر چکے ہیں کہ اندلس میں مسلمانوں کی آمد پر ابھی ایک دہائی بھی نہ گزری تھی کہ بڑی تیزی کے ساتھ عربی ایک علمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے اندلس میں متعارف ہو گئی تھی۔ مسلمان چونکہ عام حملہ آور نہیں بلکہ ایک غالب تمدن کے نقیب اور اکتشافی طرز فکر کے علم بردار تھے، سو جیسے جیسے ان کا علمی سرمایہ لاطینی زبان میں منتقل ہوتا گیا ان کی جلالت علمی کا تاثر بھی گہرا ہوتا گیا۔ ابھی اس عمل پر ایک صدی ہی گزری تھی کہ صورت حال یہ ہو گئی، جیسا کہ قرطبہ کے بشپ الوارو (Alvaro) کے بیان سے ظاہر ہے:

My fellow Christians delight in the poems and romances of the Arabs; they study the works of Mohammedan theologians and philosophers, not in order to refute them, but to acquire a correct and elegant Arabic style. Where today can a layman be found who reads the Latin commentaries on Holy Scriptures? Who is there that studies the Gospels, the Prophets, and the Apostles? Alas! The young Christians who are most conspicuous for their talents have no knowledge of any literature or language save the Arabic; they read and study with avidity Arabic books; they amass whole libraries of them at a vast cost; and they sing every where the praises of Arabian lore. On the other hand, at the mention of Christian books they disdainfully protest that such works are unworthy of their notice. The pity of it! Christians have forgotten their own tongue, and scarce one in a thousand

can be found able to compose in fair Latin a letter to a friend. But when it comes to writing Arabic, how many there are who can express themselves in that language with the greatest elegance, and even compose verses which surpass in formal correctness those of the Arabs themselves!

(Spanish Islam- English translation by F.G. Stokes p.268, London, 1913)

تیرہویں صدی یورپ کا ایک لاطینی مخطوطہ جس میں عربوں کے حوالے سے علومِ فلکیات اور ریاضی کا تذکرہ ملتا ہے۔

عربی زبان کی یہ مقبولیت اور تعظیم کا ایک سبب تو یہ تھا کہ وہ غالب ثقافت کا علامیہ تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ علوم کا تمام تر سرمایہ اور اقوام عالم کے علمی کارناموں کی کل جمع پونجی اسی زبان میں موجود تھی، سو اس کے حصول کے بغیر ناقص لاطینی ترجموں کی بدولت وہ اعتماد حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔لہٰذا اگر کسی کو علم وفن میں امتیاز حاصل کرنا ہوتا تو اس کے لیے عربی زبان کی اعلیٰ استعداد بہم پہنچانا لازم ہوتا تا کہ وہ اصل عربی مراجع سے راست استفادہ کرسکے۔عربی زبان اور عربی کتابوں کے ساتھ عرب اساتذہ اور ان کی دانش گاہوں میں حاضری بھی مغرب کی پسماندہ اقوام کے لیے ایک اعزاز سے کم نہ تھا۔ Daniel of Morley جب ۱۱۷۵ء میں حصول علم کے لیے پیرس پہنچا ہے تو پیرس میں اسے اساتذہ کی کرسیوں پر وحوش (beasts) نظر آئے اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ عربوں کے نظریات آج کل طلیطلہ کا فیشن ہیں تو اس نے طلیطلہ کا رخ کیا تا کہ وہ وہاں دنیا کے بہترین دماغوں سے اکتساب فیض کرسکے۔ (Daniel de Morley, *Philosophia*)

۱۱۷۔ محولہ Muzaffar Iqbal, *Science and Islam*, Greenwood Press, CT, 2007 p.115

۱۱۸۔ Saliba, George. "Mediterranean Crossings: Islamic Science in Renaissance Europe", visit: http://ccnmtl.columbia.edu/services/ dropoff/saliba/document/

۱۱۹۔ کاغذ سازی کی صنعت دراصل اہل چین کی دریافت ہے، جس پر صدیوں ان کی اجارہ داری رہی۔قزوینی نے لکھا ہے کہ ۷۵۱ء میں دریائے طلاس کی جنگ (battle of talas) میں چینی قیدیوں کے ذریعہ یہ صنعت اہل اسلام کو منتقل ہوئی۔سب

سے پہلے سمرقند میں باضابطہ صنعتی یونٹیں لگائی گئیں۔ آٹھویں صدی کے آخر تک بغداد میں اس صنعت کو اتنا فروغ ہوا کہ مختلف قسم کے کاغذوں کے لیے باضابطہ سوق الوراقین وجود میں آ گیا۔ چینی کاغذ اپنی ناہمواری کے سبب برش کے لیے مناسب خیال کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے خطاطی کی مناسبت سے اسے ترقی دے کر چکنا اور نفیس بنایا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے:
محولہ Al-Qazwini cited in Al-Hassan and Hill*, Islamic Technolo*gy, p.191

۱۲۰۔ ملاحظہ کیجئے: David S. Landes*, The Wealth and Poverty of Natio*ns (London: Little Brown, 1998), p.49

۱۲۱۔ بنوموسیٰ کی **کتاب الحیل** سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ عہد عباسی میں ہی آلاتِ متحرکہ میں مسلمانوں کو اتنا درک ہو گیا تھا کہ وہ تفنن طبع کے لیے چھوٹی چھوٹی چیزیں یا خودکار کھلونے بنانے لگے تھے۔ جاحظ نے **کتاب الحیوان** میں لکھا ہے کہ ہمارے بادشاہ اور اہل علم دن میں وقت کا اندازہ اسطرلوب سے کرتے ہیں اور رات میں اس کام کے لیے گھڑیوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔ عالم اسلام میں غالباً پہلی گھڑی جو پبلک مقام پر آویزاں کی گئی وہ ۱۰۱۲ء میں میافارقین کے شہر میں تھی جسے دیار بکر کے ناصر الدین نے آویزاں کیا تھا۔ ۱۰۵۰ء میں اسی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے زرقالی نے تاجہ ندی (Tagus) کے کنارے طیطلہ میں آبی گھڑی آویزاں کی تھی جس کے عیسائی فاتحین کے قبضہ میں چلے جانے کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ تاریخی مصادر میں دمشق کی اس دیوہیکل گھڑی کا تذکرہ بھی ملتا ہے جسے محمد الخراسانی الساعاتی نے ۱۱۶۰ء میں آویزاں کیا تھا اور جس کا تذکرہ ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جزری کی **کتاب الجامع بین العلم والعمل النافع فی صناعة الحیل**، مطبوعہ ۱۲۰۶ء سے بھی عالم اسلام میں مشینی ٹکنالوجی کے عام ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے: Al-Jahiz*, Kitab al-Hayaw*an, edited by A.S. Harun, vol.II, Beirut, 1992, p.294

۱۲۲۔ بنوموسیٰ کی کتاب الحیل کی طرح جزری کی کتاب **معرفة الحیل الهندسیة** میں بھی مشینوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ مختلف قسم کے پمپ (pump)، اور کھانچے دار گھرنیوں کے امتزاجِ باہمی کے طریقے سے لے کر لوہے ڈھالنے کی صنعت تک کیا کچھ نہیں ہے جس کی تفصیل اطلاقی ڈائیگرام کے ساتھ اس کتاب میں موجود نہیں۔ لاطینی یورپ میں مشینی تکنیک کو عام کرنے اور خاص طور پر گھڑی کی صنعت کو فروغ دینے میں ان تحریروں نے کلیدی رول انجام دیا اور ایسا فطری بھی تھا کہ عیسائی اسپین کو صرف مسلمانوں کی اکتشافی کتابوں تک ہی رسائی نہ تھی بلکہ سقوط طیطلہ کے بعد چلتی پھرتی آبی گھڑی بھی اب ان کے مشاہدے اور دریافت کا حصہ بن گئی تھی۔ مغربی تاریخ نگاری کے زیر اثر عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ suction pump کی ٹکنالوجی سے پہلی بار دنیا کو Taccola نے پندرہویں صدی کے وسط میں متعارف کرایا۔ حالانکہ جزری کی یہ کتاب جو دیار بکر میں ۱۲۰۶ء میں تالیف ہوئی، تمام تکنیکی باریکیوں اور ڈائیگرام کے ساتھ suction pump کے طریقۂ کار پر ہمیں مطلع کرتی ہے۔

۱۲۳۔ **کتاب السبعین** (کی اٹھارویں کتاب) میں صنعتی یونٹوں کے لیے آبی توانائی کے استعمال کا تذکرہ ملتا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ لوہے کو پگھلانے کے لیے مسلسل گردش کرتے ہوئے برتن کے نیچے تیز الاؤ روشن کیا جائے۔ گردش کا کام تو آبی لہروں کے
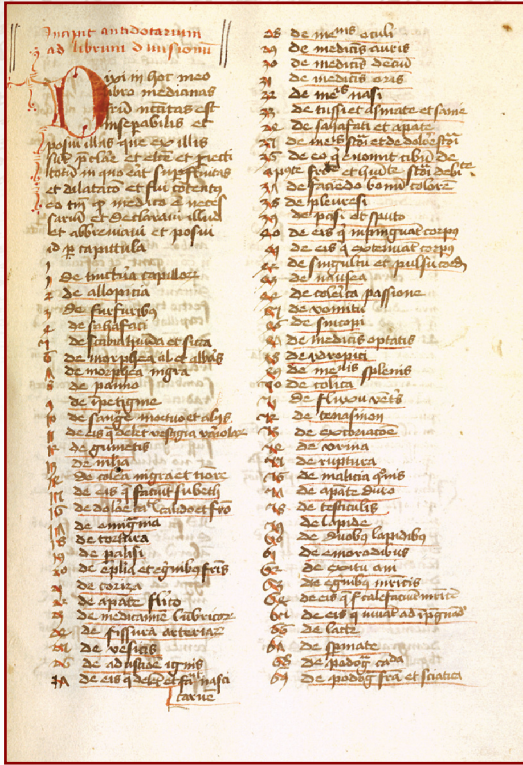
ذریعہ براہ چرخی لیے جانے کی تجویز ہے۔ آبی لہروں سے براہ چرخی مختلف قسم کی صنعتی یونٹوں کو چلانے کے لیے جہاں مسلسل دائروی گردش کی ضرورت ہوتی ہے، کی مختلف ترکیبیں کتاب السبعین میں بیان کی گئی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

Jabir ibn Hayyan, *Kitab al-sab'in*. published in fascimile by Fuat Sezgin, Frankfurt, 1986, pp.124-125

۱۲۴۔ McLean, Adam. *The Book of the Composition of Alche*my, Glasgo, 2002. p.2

۱۲۵۔ ملاحظہ کیجئے: کتاب المخزون لارباب الفنون، پیرس، عربی مخطوطہ، حوالہ نمبر ۲۸۲۴

۱۲۶۔ Joinville, The life of Saint Louis, in Joinville and Villehardouin, *Chronicle of the Crusad*es, Penguin, 1963, Joinville p.216, see also Mercier, pp.77-78

لاطینی زبان میں رازی کی قرابادین کا ایک صفحہ

۱۲۷۔ بشیر آغا، مخطوطہ نمبر ۴۴۱، استنبول، رسالۃ فی جار الاثقل و غیرھا من العجائب، مصنف مجہول۔

۱۲۸۔ فرانسیسی سیاح Bertrondon جو ۱۴۳۲ء میں عید کے موقع پر بیروت میں تھا، لکھتا ہے ''اس موقع پر مسلمانوں نے ایک تقریب منعقد کی جیسا کہ یہاں کا دستور ہے۔ یہ تقریب شام ڈھلے شروع ہوئی۔ ایک جم غفیر گانے بجانے میں مشغول تھا۔ ارباب قلعہ نے اس موقع پر توپ کے گولے داغے اور عام لوگوں کی طرف سے دور آسمان تک جانے والے پٹاخے داغے گئے۔ ہم نے اپنی زندگی میں بڑی سے بڑی جو لالٹین دیکھی تھی یہاں اس سے بھی بہت بڑھ کر تھا۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اس آتش بازی کو کبھی یہ لوگ سمندروں میں دشمنوں کے بادبان جلانے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس میں بڑے سے بڑے گھر جلانے خاص طور پر جن کی چھتیں لکڑیوں کی ہوں، کی صلاحیت موجود ہے۔ جنگوں میں اس کے استعمال سے گھوڑے بدک سکتے ہیں اور واقف کاروں کے لیے اس کا بنانا کچھ مہنگا بھی نہیں۔'' Bertrandon نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ ایک مقامی شخص کو کچھ رشوت دے کر آتش بازی کا فارمولہ معلوم کرے۔ اور اسے اس بارے میں کامیابی بھی ملی اور وہ ایسا کیوں نہ کرتا جب وہ Duke of Burgundy کی طرف سے جاسوسی کے مشن پر مامور تھا، جیسا کہ اس کے سفر نامے کے

انگریزی مترجم Galen R. Kline نے تذکرہ کیا ہے۔ Galen R. Kline, *Voyage*, New York, 1988, p.56

۱۲۹۔ مغرب میں بارود کے استعمال پر غالباً سب سے پہلی کتاب Marcus Graecus کی *Liber Ignium* ہے، جو عربی سے بعض کتابچوں کے لاطینی تراجم پر مشتمل ہے۔

۱۳۰۔ Watson, R., *Chemical Essays*, vol.I, London, 1787, 1999.

۱۳۱۔ بارود، نفط یا پوٹاشیم نائٹریٹ سے مسلمانوں کی واقفیت عہد اموی میں ہی ہوگئی تھی۔ جابر بن حیان اور ابوبکر رازی کی تحریروں میں اس کا کثرت سے تذکرہ ملتا ہے، البتہ عربی مصادر میں اس کے لیے کوئی ایک نام مخصوص نہیں ہے۔ کوئی اسے **ملح الحائط** کہتا ہے تو کوئی **ملح الدباغین** کے نام سے یاد کرتا ہے اور کسی کے نزدیک اس کا نام نا ترون، شورا یا شب یمنی ہے۔ حسن الرماح (۱۲۹۵ء) کی **کتاب الفروسیة والمناصب الحربیة** میں پوٹاشیم نائٹریٹ کے حصول کی مفصل ترکیب ملتی ہے۔ بعض مجہول مصنّفین کی مقبول عام کتابیں جن میں **کتاب المخزون لارباب الفنون** خاص طور پر قابل ذکر ہے، میزائل اور توپوں میں بارود کے فنکارانہ استعمال سے متعلق ہے۔ تیرہویں اور چودھویں صدی کے عسکری کتابچوں میں اس بات کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے کہ مختلف قسم کے میزائل اور توپوں کے لیے تقریباً ۷۵ فیصد نائٹریٹ، ۱۰ فیصد سلفر اور ۱۵ فیصد کاربن کا مخلوط متوقع دھماکے کا موجب ہوسکتا ہے۔ اسی تناسب میں تھوڑی بہت تبدیلی سے مختلف نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت کچھ اس بات پر بھی منحصر ہے کہ توپ کی نلی کیسی ہو، اس کی گہرائی کتنی ہو، وہ کس قدر خالی ہو اور کس قدر بھری اور اس کے فائر کرنے میں کن باریکیوں کو مدنظر رکھا جائے۔ مختلف لائبریریوں میں عسکری علوم کے درجنوں مخطوطات اس بات کی شہادت فراہم کرتے ہیں کہ عہد وسطیٰ کے مسلمان بارود کی اہمیت سے نہ صرف یہ کہ واقف تھے بلکہ عسکری معاملات میں تحقیق و جستجو کا سلسلہ ان کے ہاں مسلسل جاری تھا۔ منگولوں اور صلیبی حملہ آوروں کے خلاف بارود کے استعمال کا تذکرہ ہم کرچکے ہیں۔ لسان الدین خطیب نے **الاحاطہ فی اخبار غرناطہ** (ج۱، ص۲۳۱، ۱۳۲۴ء) میں غرناطہ میں مسلمانوں کے ذریعہ اس کے استعمال کا تذکرہ کیا ہے۔ **القلاقشندی** نے **صبح العشاء**، (۱۳۶۵ء) میں اسکندریہ میں امیر صلاح الدین کی قیادت میں ایک توپ کی کرشمہ سازی کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے ''میں نے تانبے کی بنی ہوئی ایک توپ دیکھی جس کے آخری کنارے لوہے کے تھے۔ لوہے کی ایک بہت بڑی گیند جو آگ سے سرخ ہو رہی تھی اس کے ذریعہ فائر کی گئی۔ دور بہت دور باب البحر کو پار کرتی ہوئی وہ سمندر میں جا گری۔'' مقریزی نے **المواعظ والاعتبار** (ج۱، ص۳۳۹، ۱۱۶۸ء) میں فسطاط کے صلیبی محاصرے کے دوران مسلمانوں کی جانب سے کرزشامی یعنی (Caramic Damuscus Grenades) کے استعمال کی بابت لکھا ہے۔ ابن خلدون نے سلطان ابو یوسف یعقوب کے ذکر میں ۱۲۷۴ء میں سجل ماسا کے شہر میں اس کے استعمال پر شہادت فراہم کی ہے۔ گویا تاریخی اور تکنیکی علوم کی کتابیں اس امر پر ناقابل تردید شہادت فراہم کرتی ہیں کہ مسلمان بارود کے کیمیائی تناسب کے فن سے واقف تھے، البتہ جب یہ فن یورپ کو منتقل ہوا تو

ابن لویون کی کتاب اپنے لاطینی ترجمہ کے ساتھ

یورپ نے اسے غیر معمولی ترقی دے کر صرف مسلمانوں کے خلاف ہی استعمال نہیں کیا بلکہ تمام اقوام کی سرکوبی کے لیے ان کے ہاتھوں آج بھی اس کا استعمال بلکہ استحصال جاری ہے۔

حسن الرماح (متوفی ۱۲۹۵ء) کی کتاب الفروسیہ والمناصب الحربیہ غالباً بارود کے استعمال پر پہلی باقاعدہ مفصل تصنیف ہے جس میں اس وقت تک اس فن پر ہونے والی اس تحقیقات کا عرق کشید کرلیا گیا ہے۔ کتاب کے سرورق سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حسن کا یہ علم خاندانی تھا جو کئی پشتوں سے اس کے ہاں چلا آتا تھا اور جس میں حک واضافے کے مسلسل امکان سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ کتاب میں بارود کے حربی اور غیر حربی دونوں طرح کے استعمال سے متعلق مختلف فارمولے موجود ہیں۔ بائیس فارمولے صرف طیارات (راکٹ) سے متعلق ہیں۔ جو بات اہل فن کے لیے حیرت کا باعث ہے وہ یہ کہ ان فارمولوں میں پچھتّر فیصد پوٹاشیئم نائٹریٹ کے استعمال کی ترکیب ملتی ہے جو آج بھی اہل فن کے نزدیک معیاری تناسب ہے۔ اس کتاب سے اس مصدقہ تاریخی خیال کو مزید تقویت ملتی ہے کہ مسلمانوں نے عین جالوت کے مقام پر جن آتشیں اسلحوں کے ذریعے منگول حملوں کا رخ موڑ دیا وہ بارود کے استعمال کے سبب ہی تھا اور یہ کہ جنگوں میں طیارات کا استعمال اور تقریبات میں پٹاخوں کی جلوہ سامانیاں ان کے ہاں معمول کی بات سمجھی جاتی تھی۔

تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے:

Hall, Bert S., *Weapons, Warfare in Renaissance Europe*, John Hopkins University Press, 1997, p.67

لسان الدین الخطیب، **الاحاطة فی اخبار غرناطة**، قاہرہ، ۱۹۰۱ء، ج ۱، ص ۲۳۱

احمد بن علی القلا شقندی، **صبح العشاء**، ج ۲، قاہرہ، ۱۹۶۳ء، ص ص ۱۴۴-۱۴۵

ابن خلدون، **کتاب العبار**، ج ۷، بیروت، ۱۹۷۱ء، ص ۱۸۸

۱۳۲۔ David L.Lewis, *God's Crucible: Islam and the Making of Europe, 570-121*5, New York, 2008, p.329.

۱۳۳۔ روبرٹ بریفالٹ نے بارہویں صدی کی نشاۃ ثانیہ سے متعلق بالکل صحیح لکھا ہے:

It was under the influence of the Arabs and Moorish revival of culture and not in the 15th century, that a real renaissance took place... After steadily sinking lower and lower into barbarism, it [Europe] had reached the darkest depths of ignorance and degradation when cities of the Saracenic world, Baghdad, Cairo, Cordova, and Toledo, were growing centers of civilization and intellectual activity. It was there that the new life arose which was to grow into a new phase of human evolution. From the time when the influence of their culture made itself felt, began the stirring of new life. Robert Briffault, *The Making of Humani*ty, London: 1938

۱۳۴۔ عہد وسطیٰ کے یوروپ میں جہاں مسلم ثقافت کا غلغلہ تھا عمارتوں کی تزئین کاری، ملبوسات کی سجاوٹ اور آرٹ کے مختلف نمونوں میں عرب خطاطی سے ملتے جلتے ڈیزائن بنانے کا فیشن عام تھا۔ عامۃ الناس عربی زبان سے واقف نہ تھے، لیکن انھیں اس بات کا شوق تھا کہ ان کی مجلسیں اوران کے گھر دمشق، بغداد، قاہرہ اور اندلس سے آنے والے آرٹ اور فیشن کے نمونوں سے مزین رہیں۔ اس ضرورت کو اس عہد کے مغربی فنکاروں نے ایک ایسے رسم الخط کی ایجاد سے پورا کیا جسے psudo-Arabic یا psudo-Kufic کا نام دیا جاتا ہے۔ تیرہویں صدی سے لے کر سولہویں صدی کے آخر تک جب تک مسلمانوں کی ثقافتی اور سیاسی برتری قابل رشک اور لائق تقلید بنی رہی، یوروپی مصورین اس فیشن کی اتباع کرتے رہے۔ البتہ سولہویں صدی کے بعد جب مغرب میں اکتشافی علوم کی بنیاد مستحکم ہونے لگی اور اسے اپنی تہذیب کے لیے ایک نئے اسطورے کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا تعلق اسلام اور مسلمانوں کے بجائے ماضی بعید کے یونان سے جوڑا جائے تو رفتہ رفتہ اس کا رواج جاتا رہا۔

۱۳۵۔ ۱۳۴۱ء میں کوئی بارہ سو سالوں کے بعد پٹرارک نے کیپیٹو لائن (Capitoline) کی پہاڑی پر شاعروں کو تمغۂ افتخار دینے کی قدیم اطالوی رسم کا احیاء کیا۔ تاریخی مصادر کے حوالے سے انھوں نے اس دعوے کا اظہار کیا کہ آخری مرتبہ ۸۰ء میں Statius کو اس اعزاز سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اب پٹرارک خود اس اعزاز سے سرفراز ہو کر لوٹے تھے۔ پٹرارک یا اس عہد کے دوسرے اطالوی شعراء و مصنّفین مثلاً دانتے الگیری، البریٹنو، موساٹو، Geri d'Arezzo اور بکاسیو وغیرہ اسلام اور مسلمانوں سے تعصب کے سبب ایک ایسے اسطورے کی تلاش میں تھے جو اخذ و اکتساب کی طویل صدیوں کا تعلق مسلمانوں کے اکتشافی علوم اور ادب و ثقافت کے بجائے قدیم یونان سے مربوط کر سکے۔ اس عہد میں تو ان تعصّبات کو مقبول عام تاریخی اسطورے کی حیثیت حاصل نہ ہو سکی، البتہ انیسویں صدی میں مشلے اور برخاردت کی کوششوں کے طفیل اس مردہ ناتمام اسطورے میں گویا پھر سے جان پڑ گئی۔

IBN BASSĀL

LIBRO
DE
AGRICULTURA

JOSE M.ª MILLAS VALLICROSA

MOHAMED AZIMAN

1955
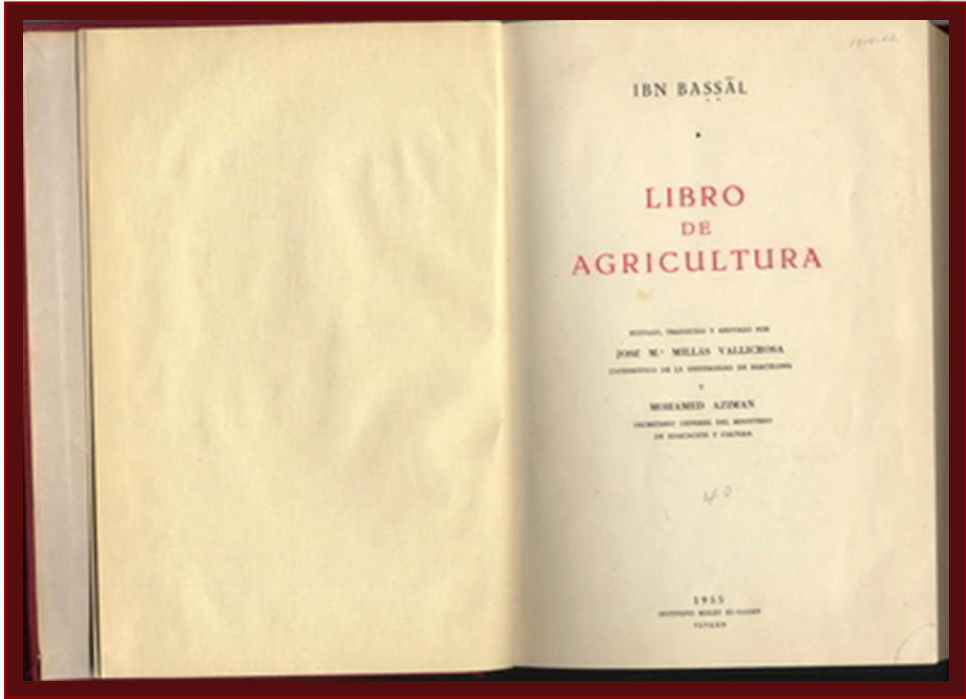
کتاب الفلاحة کا لاطینی قالب

۱۳۶۔ شیکسپیئر کس یوروپی نشاۃ ثانیہ کی نمائندگی کر رہے تھے اس کا صحیح اندازہ تاریخی سیاق کے بغیر نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۵۷۰ء میں ملکہ ایلیزابتھ اوّل پوپ کے سیاسی مقاطعہ (excommunication) کا شکار ہوگئی تھی۔ ۱۵۷۸ء میں ملکہ نے ترک سلطان مراد ثالث کے پاس سفارت بھیجی اور پوپ کے مقابلے میں حمایت کی طالب ہوئیں۔ ایلیزابتھ اوّل کی سفارت جزوی طور پر ہی کامیاب ہوسکی، البتہ اس دوران انگلینڈ اور عثمانی خلافت کے مراسم کافی خوشگوار رہے، یہی وجہ ہے کہ شیکسپیئر اور ان کے عہد کے بعض ڈرامے مثلاً *Tumberline the Great* (1587)، *The Jews of Malta* (1590) اور *Othello, the Moor of Venice* (1603) مسلمانوں کی عظمت کے احساس سے مملو ہیں۔

۱۳۷۔ ہمارے خیال میں ایک کارگر اسطورہ کے طور پر نشاۃ ثانیہ کی ایجاد کا سہرا جیکب برخاردت (۱۸۱۹ء-۱۸۹۷ء) کے سر ہے۔ اس نے اپنی کتاب *Die Kultur der Renaissance in Italien* (1860) میں پٹرارک، مشلے اور ہیگل کے مقابلے میں کہیں زیادہ پرزور طریقے سے نشاۃ ثانیہ کو ایک تاریخی وقوعہ کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ برخاردت کے تعمیر کردہ اس تاریخی اسطورے کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مغرب کے توسیع پسندانہ عزائم کو اس وقت سپاٹ معروضی تاریخ کے بجائے ایک جاذب نظر اسطورے کی کہیں زیادہ ضرورت تھی۔

۱۳۸۔ کولمبس کا بحری سفر بنیادی طور پر صلیبی جنگ کا توسیعہ تھا۔ اسپین میں مسلم ریاست کا چراغ گل ہونے کے بعد وہ ان خطوں

کی تلاش میں نکلے تھے جہاں کثیر مقدار میں سونا ہاتھ آئے تا کہ فرڈینانڈ اور ایزابیلا کی مسلم اور یہود مخالف مہم کو استحکام اور وسعت نصیب ہو۔ کولمبس نے اپنے سفرنامے میں اپنے سیاسی آقاؤں کو خطاب کرتے ہوئے صریح الفاظ میں لکھا ہے:

having expelled all the Jews from your domains in that same month of January, your Highnesses commanded me to go with an adequate fleet to these parts of India [the Americas]... I departed from the city of Granada on Saturday 12 May and went to the port of Palos, where I prepared three ships.

(Quoted in Jerry Brotton, *The Renaissance Bazaar, Oxford: New york, 20*02, p.32)

جو لوگ کولمبس اور ان کے سرپرستوں کے سیاسی پس منظر سے واقف ہیں ان کے لیے یہ باور کرنا انتہائی مشکل ہوگا کہ انھوں نے مشاہدۂ کائنات کے جذبہ اور ایک نئی دنیا کی تخلیق کیشوق میں سمندری سفر کا منصوبہ بنایا تھا۔

۱۳۹۔ عہد ظلمت کی اصطلاح دراصل تاریخ کو خالصتاً عیسائی اور قومی تناظر میں دیکھنے کی ایک سعی تھی۔ اس تصور کے مطابق مسیح کی آمد کے بعد دنیا روشنی سے معمور ہوئی، لیکن سلطنت روما کو زوال آگیا اور دنیا پر دوسری اقوام خاص طور پر مسلمان غالب آگئے اس نقطۂ نظر کے مطابق یہ دراصل عہد ظلمت کا آغاز تھا۔ تاریخ کی اس تعبیر کے مطابق پٹرارک خود تو عہد ظلمت میں جی رہے تھے، البتہ وہ اپنے ہم قوموں کو یہ بشارت دے گئے کہ آنے والے ایام میں ان کی اگلی نسلیں پھر سے ایک فجر جدید کا لطف لے سکیں گی:

My fate is to live amid varied and confusing storms. But for you perhaps, if as I hope and wish you will live long after me, there will follow a better age. This sleep of forgetfulness will not last for ever. When the darkness has been dispersed, our descendants can come again in the former pure radiance. *(Afri*ca, IX. 451-7; tr. T. E. Mommsen (tr. and ed.), p.127)

۱۴۰۔ سقوط قسطنطنیہ کے بعد یونانی زبان کے ماہرین عیسائی علماء کی ایک قابل ذکر تعداد اٹلی کے مختلف شہروں میں آبسی تھی۔ تاریخی مصادر میں ایک بازنطینی راہب Bessasion کا تذکرہ بڑے احترام سے کیا گیا ہے، جنھوں نے راست یونانی زبان سے ارسطو کی مابعد الطبیعات کا ترجمہ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ یونانی کتابوں کا ایک قیمتی ذخیرہ ساتھ لائے تھے جس میں صرف یونانی زبان میں کوئی پانچ سو کتابیں موجود تھیں جسے انھوں نے اپنی زندگی میں شہر وینیس کے مرکزی کتب خانہ کو عنایت کردیا۔ Bessarion کے ساتھ ان کے حواریوں اور شاگردوں کا بھی ایک حلقہ آبسا تھا جس میں Theodore Gaza, George Trapezuntius, Poggio and Valla خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۴۱۔ جدید سائنسی کونیات کی تشکیل میں ناصر الدین طوسی کی تحریر المجسطی مطبوعہ ۱۲۴۱ء کو پہلے بنیادی پتھر کی حیثیت حاصل ہے۔ مسلمانوں نے یونانی اکتشافی علوم کے سلسلے میں شکوک لٹریچر کا جو سلسلہ تیار کیا اس نے ایک نئے اکتشافی طرز فکر کی بنیاد رکھی۔ اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ آسامانی سیارے اپنے مدار میں یکساں رفتار سے متحرک ہیں جس کے مرکز میں زمین واقع ہے۔

جب یوروپی طبیب کے لیے عربی زبان سے واقفیت لازم خیال کی جاتی تھی۔ علمِ طب پر ۱۵ویں صدی کی ایک لاطینی تصنیف جو مروجہ عربی اصطلاحوں کی تشریح سے متعلق ہے۔
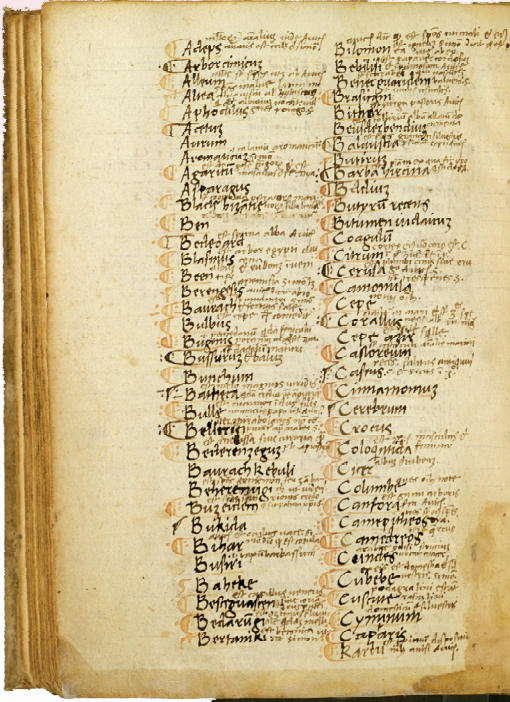
رہی یہ بات کہ اس کی شہادت اعداد و شمار سے نہیں ہوتی تھی سو بطلیموس نے یہ نظریہ ایجاد کیا کہ اس مدار کا مرکز زمین سے باہر اور اس طرح یہ کہہ لیجئے کہ کائنات سے باہر واقع ہے۔ مسلم ماہرین فلکیات نے نہ صرف یہ کہ اس خیال کی لغویت واضح کی بلکہ طوسی نے اپنی کتاب تذکرہ میں بطلیموس کے علی الرغم ایک نیا کلیہ پیش کیا جسے الصغیرۃ والکبیرۃ یا Tus-couple کا نام دیا جاتا ہے۔ آگے چل کر اس کلیہ کو ابن شاطر نے چاند کی گردش کے سلسلے میں استعمال کیا۔ ابن شاطر اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام سیاروں کی گردش ایک نکتۂ واحد کے گرد ہے۔ ایک بار جب بطلیموسی نظام کا اعتبار جاتا رہا اور یہ بات واضح ہوگئی کہ تمام سیارے اپنے مدار میں ایک واحد مرکز کے گرد گھوم رہے ہیں تو کوپرنکس کے لیے یہ ممکن ہوسکا کہ وہ زمین کے بجائے سورج کو محور قرار دے کر ایک نئی کونیات کا اعلان کردے۔ اپنی اس تحقیق و اکتشاف میں کوپرنکس کو صدیوں کی مسلم تحقیق و تجزیہ سے بڑی مدد ملی حتیٰ کہ اس نئی کونیات کی تشریح کے لیے اس نے Tusi-couple اور اس سے متعلق ڈائی گرام کو من و عن اخذ کرنے میں کسی تکلف کا مظاہرہ نہ کیا۔

۱۴۲۔ Marshall Hodgson, *Rethinkg World Hist*ory, Cambridge Univeristy Press, 1993, p.97

۱۴۳۔ سقوطِ قسطنطنیہ نے عالمِ عیسائیت کو کس قدر لرزہ براندام کردیا تھا اس کا اندازہ اس عہد کے ایک عیسائی مفکر AeneasSilvius Piccolomini، جو آگے چل کر Pope Pius II کے لقب سے مشہور ہوئے، کے اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے پوپ نکولس پنجم کی خدمت میں ارسال کیا تھا:

But what is that terrible news recently reported about Constantinople?... Who can doubt that the Turks will vent their wrath upon the churches of God? I grieve that the world's most famous temple, Hagia Sophia, will be destroyed or defiled. I grieve that countless basilicas of the saints, marvels of

architecture, will fall in ruins or be subjected to the difilements of Mohammed. What can I say about the books without number there which are not yet known in Italy? Alas, how many names of great men will now perish? This will be a second death to Homer and a second destruction of Plato.

محولہ: Jerry Brotton, *The Renaissance Bazar, Oxford: New york, 2002*, p.49

۱۴۴۔ Lorenzo Valla نے متنی اور لغوی تحلیل و تجزیہ کی روشنی میں Donation of Constantine کے مشہور زمانہ وثیقہ پر شبہات وارد کر دیے تھے، لیکن تب اس اعتراض کی حیثیت ایک علمی مناقشہ سے زیادہ نہ تھی۔ البتہ لوتھر کی بغاوت کے بعد چرچ کے اقتدار اعلیٰ پر کھلے عام اعتراض وارد کئے جانے لگے اور اس خیال کی صداقت مشکوک ہوگئی کہ قسطنطین نے چرچ کو اپنے تمام تر اختیارات بخش دیے تھے۔ ۱۵۲۰ء میں ابھی سینٹ پیٹر کے چرچ میں ریفیل کے ہاتھوں Donation of Constantine کی ترسیم کا آغاز ہی ہوا تھا کہ لوتھر غضبناک ہوا تھے، انھوں نے لکھا:

I have at hand Lorenzo Valla's proof that the Donation of Constantine is a forgery. Good heavens, wickedness is at Rome. You wonder at the judgment of God that such what darkness and unauthentic, crass, impudent lies not only lived, but prevailed for so many centuries.

۱۴۵۔ Giorgio Vasari کی مشہور زمانہ تالیف *Lives of the Artist* مطبوعہ ۱۵۵۰ء جسے Renaissance Art کے بائبل کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے، نے نشاۃ ثانیہ کے استعارے کو مقبول عام بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ہوا یہ کہ فنکار اور مصور جواب تک علماء اور پادریوں کے مقابلے میں سماجی توقیر کے حامل نہ تھے، اب انھیں بھی احترام کا سزاوار سمجھا جانے لگا، البتہ اس کتاب پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہوئے بغیر نہیں رہتی کہ یہ فنکار نشاۃ ثانیہ کے اس رومانوی اسطورے کی نمائندگی نہیں کرتے جسے انفس و آفاق کے مشاہدے، حریت فکری اور ایک فجر جدید کا نقیب باور کرایا جاتا ہے۔ حقیقت بس اتنی ہے کہ یہ حضرات آرٹ کے ذریعہ کیتھولک چرچ کی تنگ نظری کی تبلیغ و تشریح میں مصروف تھے۔ مخالفین خواہ وہ مسلمان ہوں یا پروٹسٹنٹ عیسائی ان کے لیے ان کے ہاں کوئی جگہ نہ تھی۔

۱۴۶۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عیسائی کلینڈر کی تشکیل کا خیال سب سے پہلے آٹھویں صدی کے آخر میں شارلیمان کی ایما پر Venerable Bede کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اس سے پہلے کسی خالص عیسائی کلینڈر کا کوئی وجود نہ تھا۔ ملاحظہ کیجئے بیڈ کی مشہور زمانہ تالیف: *Ecclesiastical History of the English Nation*

۱۴۷۔ مروّجہ گریگورین کلینڈر جسے ۱۵۸۲ء میں ترمیم و اصلاح کے بعد جاری کیا گیا۔ پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے نزدیک ایک عرصہ تک متنازع رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اہلِ یورپ کو اس کلینڈر پر متفق ہونے میں کوئی سو سال سے زیادہ کا عرصہ صرف ہوا۔ ملاحظہ کیجئے:

The Renaissance Bazaar: From the Silk Road to Michelangelo, Oxford University Press, New York, 2002, p.194

جب ابن الہیثم کے بغیر گلیلیو کا اعتبار قائم نہ ہوتا تھا۔
ہیویلیس کی کتاب selenograpia مطبوعہ ۱۶۴۷ء کے سرورق پر
گلیلیو کے ساتھ ابن الہیثم کو دکھایا گیا ہے۔

۱۴۸۔ کتاب پیدائش (باب ۹، آیت ۲۷) میں نوح کے تین بیٹوں کے قصے کو نئے اسطورہ کی تعمیر میں کچھ اس طرح لگایا گیا کہ Japheth کو عیسائی یورپ عطا ہوا اور Shem کے حصے میں بے دینوں (Pagans) پر مشتمل ایشیا کا خطہ آیا۔ یورپ اہل یقین عیسائیوں کے مسکن کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ تقدیس کا حامل قرار پایا بلکہ اہل یورپ کو اس فریضۂ منصبی پر بھی مامور سمجھا گیا کہ وہ دین و تہذیب سے ناآشنا ایشیائی اقوام کو اپنے خداشناس دائرۂ اثر میں لانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھیں گے۔ انیسویں صدی میں اقوام یورپ کے استعمارانہ عزائم کو نظری اور اخلاقی جواز بخشنے میں اس اسطورے نے بڑا کام کیا۔

۱۴۹۔ ملاحظہ کیجیے: Georges Duby, *The Three Orders: Feudal Society Imagined* (Chicago: Chicago University Press, 1980)

۱۵۰۔ Gerd Tellenbach, *Church, State and Christian Society at the Time of the Investiture Conflict* (Oxford: Blackwell, 1959), p.39

۱۵۱۔ ملاحظہ کیجیے: Michael Mann, *The Sources of Social Power*, vol.I Cambridge University Press, 1986, p.381.

۱۵۲۔ عرب علوم اور اسلامی تہذیب کے عمومی غلبہ نے مغرب کی مسلسل تقلیب کا سامان کر رکھا تھا۔ ایسا اس لیے کہ علوم کے ساتھ اس کی ثقافت اور دائرۂ فکر بھی درآیا فطری تھا۔ مغرب کے لیے مسلمانوں کے اکتشافی علوم میں ایک رومانوی دلچسپی تھی، البتہ ان کے مذہب کے سلسلے میں ان کے دل ہمیشہ تنگ رہے۔ مثال کے طور پر روجر بیکن کو ہی لیجیے جن کے لیے ابن الہیثم زندگی بھر آخری حوالہ رہا، اسلامی طرزِ زندگی کو مسترد کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اسے اس لیے اختیار نہیں کیا جا سکتا کہ اہل عرب کثرت ازدواج کے سبب جنسی لذتوں میں مست رہتے ہیں۔ پٹرارک تو یہاں تک کہتے ہیں کہ میرے لیے یہ یقین کرنا

مشکل ہے کہ کوئی اچھی چیز دنیائے عرب سے بھی آسکتی ہے۔ دانتے کی Divine Comedy بھی اس خیال کی توثیق کرتی ہے کہ اہل مغرب کے لیے مسلمانوں کا علم وفلسفہ تو قابل قبول ہے البتہ دین سے انھیں حددرجہ انقباض ہے۔ دانتے کے ہاں رسول اللہؐ اور حضرت علیؓ کا مقام تو (نعوذ باللہ) جہنم ہے، البتہ صلاح الدین، ابن رشد اور ابن سینا اعراف میں نجات کے منتظر ہیں۔ Siger de Babant جن کی شہرت فلسفہ ابن رشد کے سبب ہے، جنت میں دکھائے گئے ہیں۔ دانتے کی یہ تصنیف دراصل یوروپی اقوام کی اجتماعی حسیت کا آئینہ دار ہے، جہاں اسلام اور مسلمانوں سے سات سو سالہ علمی اکتساب کے باوجود اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں ان کی معاندت ختم نہیں ہوتی۔ متعلقہ حوالوں کے لیے ملاحظہ کیجئے:

Roger Bacon, *Opus Maj*us, trans, Robert Belle Burke (Philadelphia: University of Pennsylvania Press, 1927), p.815. Francesco Petrarch, *Letters of Old A*ge, trans. Aldo S.Bernard, Saul Levin, and Reta A.Bernard, Johns Hopkins University Press, 1992, 2:472

۱۵۳۔ تفصیلی مباحث کے لیے دیکھئے: Denys Hay, *Europe: the Emergence of an Id*ea, Edinburgh University Press, 1957, p.1.

۱۵۴۔ اسپین سے مسلمانوں کے انخلاء کے لیے لڑی جانے والی جنگوں کے دوران عین فیصلہ کن لمحات میں سینٹ جیمس کی غیبی مدد کے نعرے بلند ہوتے رہے ہیں۔ جس طرح وینیس سینٹ مارک کا شہر سمجھا جاتا ہے اسی طرح سینٹ جیمس کو اسپین کے سرکاری سینٹ کا مرتبہ حاصل ہے جن کی سرپرستی نے، جیسا کہ مقبول عام عیسائی خیال ہے، اہل اسپین کو مسلمانوں کے غلبہ واستیلاء سے نجات دلانے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ یہ سینٹ جیمس کوئی اور نہیں حضرت مسیح کے بارہ حواریوں میں سے ایک ہیں جو یروشلم میں ۴۴ء میں شاہ ہیروڈ اوّل اگریپا کے ہاتھوں شہید کردیے گئے تھے۔ تاریخی اعتبار سے تو ان کا مرقد مبارک یروشلم میں واقع ہونا چاہیے، لیکن عوامی خوش عقیدگی نے ان کے مرقد کی دریافت اسپین میں کرلی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ رامیرو اوّل (King of Castile) کے خواب میں وہ اس وقت ظاہر ہوئے جب اسے عبدالرحمن ثانی کی فوج کا سامنا تھا۔ سینٹ جیمس نے رومیرو اوّل کو نصرت وتائید اور فتح کی یقین دہانی کرائی بلکہ ۸۴۴ء میں عین کلاویو (Clavijo) کی میدان جنگ میں انھوں نے عیسائی افواج کی قیادت فرمائی۔ اہل یقین نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سینٹ جیمس زرہ بکتر پہنے آوارد ہوئے ہیں اور فضا سینٹیا گو، سینٹیا گو (Santiago, Santiago) کے نعروں سے گونج اٹھی۔ کہا جاتا ہے کہ مختلف فیصلہ کن جنگوں کے موقعوں پر اہل یقین نے سینٹ جیمس کو اپنے چشم ظاہر سے وارد ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کا وجود اہل اسپین کے لیے خدا کی خاص نعمت بتائی گئی اور انھیں خوش عقیدہ عیسائیوں میں Santiago Matamaros یعنی موروں یا مسلمانوں کو تہہ وتیغ کرنے والے سینٹ کی حیثیت سے دیکھا گیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے:

Rafael Altamira, *A History of Spai*n, New York1949, p.103.
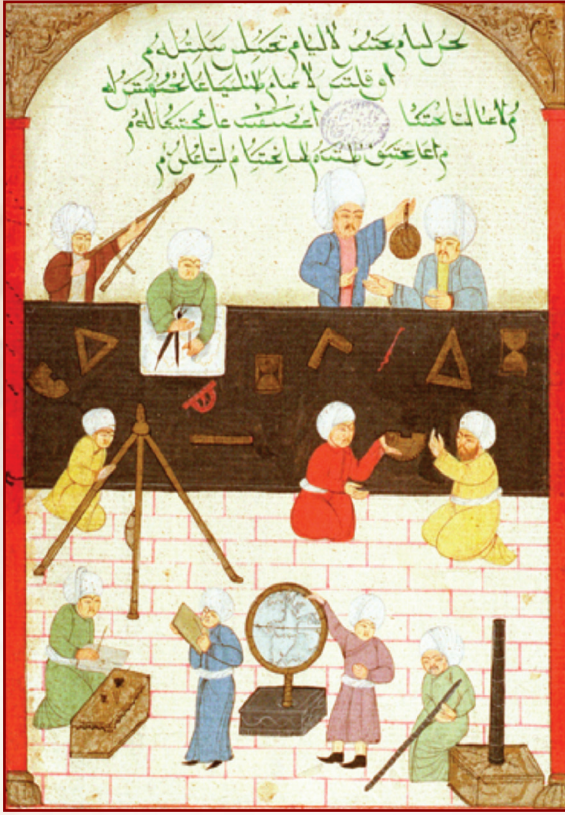
کوئی ہزار سالوں تک جب علومِ عربیہ (Natural Sciences) کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی سائنسی مطالعات کی بین الاقوامی زبان عربی تھی۔

۱۵۵۔ مثال کے طور پر Trevor-Roper نے اپنی کتاب *The Rise of Christian Europe* میں بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یورپ کی پانچ سو سالہ سبقت کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

The new rulers of the world, whoever they may be, will inherit a position that has been built up by Europe, and by Europe alone. It is European techniques, European examples, European ideas which have shaken the non-European world out of its past-out of barbarism in Africa, out of a far older, slower, more majestic civilisation in Asia; and the history of the world, for the last five centuries, in so far as it has significance, has been European history. I do not think that we need to make any apology if our study of history is European-centric. (Trevor-Roper 1965:11).

ہمارے خیال میں پانچ سو سالوں کے یورو پی غلبہ کا یہ فسانہ سخت مغالطہ ہے جو دراصل ان مغربی مغنّیوں کا پیدا کردہ ہے جن کی کتابیں *Triumph of the West* by John M. Roberts (1985) اور *The Wealth and Poverty of Nations* by David S. Landes (1998) اس تاثر کو قائم رکھنے میں اہم رول ادا کرتی رہی ہیں۔ پچھلے دس پندرہ سالوں میں اس خیال کے بطلان پر خاصی وقیع کتابیں منظر عام پر آئی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ مغرب کی عالمی بالادستی تازہ تازہ عمل ہے جس کی ابتدا انیسویں صدی کی ابتدا میں ہوئی۔ ملاحظہ کیجئے:

Samir Amin, *Eurocentrism*, London, 1989; Janet L. Abu-Lughod, *Before European Hegemony*, Oxford, 1989; James M. Blaut, *The Colonizer's Model of the World*, London, 1993; Bryan S.Turner, *Orientalism, Postmodernism and Globalism*, London,1993; Jack Goody, *The East in the West*,

Cambridge, 1996; Andre Gunder Frank, *ReOrient*, Berkeley, 1998; Clive Ponting, *World History*, London, 2000.

اس سلسلے میں مارشل ہاگسن (Marshall G. S. Hodgson) کی کتاب *The Venture of Islam*, 3Vols. مطبوعہ ۱۹۷۴ء اور ایرک وولف (Eric R. Wolf) کی کتاب *Europe and the People without History* (1982) بھی اہمیت کی حامل ہے، جس سے مستقبل کے متلاشیانِ حق بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

بابائے کیمیا جابر بن حیّان

۱۵۶۔ واسکوڈی گاما اور کولمبس کے بحری سفر کو تاریخی سیاق میں دیکھنے سے اس کی واقعی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس وقت ڈی گاما اپنا پچاسی فٹ لمبا جہاز لے کر نکلا ہے اس وقت اہل چین کے پانچ سو فٹ لمبے اور ایک سو اسی فٹ چوڑے جہاز سمندر پر رواں دواں چلے آتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ چینی جہاز راں چینگ کے جہاز کے مقابلہ میں کولمبس کے جہاز کے مستول کی اونچائی آدھی سے زیادہ نہ تھی۔ کولمبس کا جہاز نینا جس سے جدید دنیا کی ابتدائی مہم جوئی وابستہ کر لی گئی ہے اس میں زیادہ سے زیادہ سوٹن سامان لادنے کی گنجائش تھی جبکہ اسی عہد میں چینگ کے جہاز اکتیس سو (۳۱۰۰) ٹن مال لادنے کی صلاحیت رکھتے تھے، اس پر مشرق کے ان عرب جہاز رانوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے جنھیں اس وقت امیر البحر کی حیثیت حاصل تھی۔

محولہ: Jack Goody, *The East in the West* (Cambridge: Cambridge University Press, 1996), p.92.

۱۵۷۔ اس بات کے وافر تاریخی شواہد موجود ہیں کہ واسکوڈی گاما کے بحری سفر ہند میں انھیں ایک گجراتی مسلمان رہنما کی معیت حاصل تھی جسے انھوں نے ساحل افریقہ سے اس سفر میں شرکت پر آمادہ کر لیا تھا۔ بعض مؤرخین نے مشہور عرب جہاز راں احمد بن ماجد کا نام بھی لیا ہے جسے روایت اور درایت دونوں بنیادوں پر قابل اعتبار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اولاً ڈی گاما جس وقت بحر ہند کے سفر پر چلا ہے اس وقت شہاب الدین احمد بن ماجد فن جہاز رانی میں ایک انتہائی معتبر اور بزرگ معلم کی حیثیت

184

GEBRI ARABIS PHILOSOPHI SOLERTISSIMI, RERVMQVE NATVRALIVM PERITISSIMI

Liber Fornacum ad exercendam χημείαν pertinentium, Interprete Rodogero Hispalensi.

Præfatio, diuidens librum in tres partes. Caput I.

Considerauimus consideratione non fantastica, nos totam artem tradidisse in uoluminibus nostris. Sed ne ob inuidiam mordeamur, hunc librum Fornacū præscripsimus, in quo tractabimus practicam manualem, tam in spirituum quam corporum præparationibus, ut artifices leuius contingere ualeant ad operis complementū. Cum ergo ultima cōsideratio in rerum cognitione magis propinquarum consistat, & in modo operandi, & res à rebus regimine ignis extrahi possunt. Et cum ad hanc rem peruenire nō possumus nisi separando superflua à contento desiderato, scilicet sulphuris combustibilitates & territates corpus quodlibet infœdantes. Hinc est quod primo singulos operandi modos tractabimus, utpote qualis furnus cum suis instrumentis spectet ad quamlibet rem præparandam, usq; ad operis complementum cum regimine ignis illi appropriato, & qualia uasa pertineant ad propositum, ut artifex perficere possit suam operationem. Secundo, quæ res præparandæ sunt, ut ex simplicibus seu commixtis uerum Solem uel Lunam generare ualeat cum splendore. Tertio narrabimus illa quę perfici possunt cum alteratiuis, & quę naturaliter alterantur cum complemēto totali, Et modum permiscendi cum proportione debita, & cum

جابر کے مسلم الاصل ہونے کی ایک دستاویزی شہادت
بولوگنا یونیورسٹی میں محفوظ لاطینی مخطوطہ نمبر (۷۵۶) ۴۴۸

سے دیکھے جاتے تھے۔ فن جہاز رانی پر ان کی وقیع تالیف کتاب الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد اور وسیع بحری تجربات کے سبب انھیں اسد البحر کے لقب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ ایک ایسے بزرگ اور قابلِ تعظیم شخص کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ وہ نو آموز پرتگالیوں کو اپنی فنی خدمات فراہم کرتے، خاص طور پر ایک ایسی صورت حال میں جب ان پرتگالیوں کی مسلم دشمنی مسلّم ہو اور جب فنی باریکیوں کا افشا کسی بھی اعتبار سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے نامناسب خیال کیا جاتا ہو۔ ابن ماجد ایک راسخ العقیدہ اور خدا ترس مسلمان تھے، ان کے نزدیک معلم بحر کے لیے یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل تھی کہ وہ اپنے فن سے واقفیت کے ساتھ خدا ترس بھی ہو۔

(وینبغی للمعلم - یقصد ربان السفینة أو قائدها - أن یکون عادلا تقیا لا یظلم احداً مقیما علی طاعة اللّٰہ، متقیا اللّٰہ حق اتقائه تعالی)

کتاب الفوائد جس کی اشاعت کا زمانہ ۱۴۹۰ء کے قریب ہے، بحری سفر کے لیے مخزنِ معلومات کی حیثیت رکھتی ہے جس میں اس بات کی تفصیلات موجود ہیں کہ معلم بحر کو بحری سفر کے دوران کن کن باتوں سے واقفیت ہونی چاہیے اور کن ممکنہ مسائل اور مشکلات پر وہ قابو پا سکتا ہے۔ ساحلی علاقوں کا سفر کھلے سمندر کے سفر سے کتنا مختلف ہوتا ہے اور یہ کہ مشرقی افریقہ سے لے کر انڈونیشیا تک کے سفر میں مختلف موسم میں موسمی ہواؤں، مانسون اور چھوٹے بڑے سمندری طوفانوں سے کب، کہاں اور کس طرح سابقہ پیش آ سکتا ہے۔ کتاب الفوائد فرد واحد کا تجربہ نہیں بلکہ اس کتاب میں نسل ہا نسل کے بہترین تجربات کا عرق کشید کر لیا گیا ہے۔ ابن ماجد کو جہاز رانی کا فن ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے والد نے اپنے تجربات کے علاوہ اس فن پر مروّجہ کتابیں بھی ترکے میں چھوڑی تھیں۔ اب جو ایک شاعر اور اہل قلم کو یہ سب کچھ میسر آیا اور اس پر بحری سفر کا تجربہ مستزاد تو کتاب الفوائد معرض وجود میں آئی۔ جو شخص بھی اس کتاب کی ورق گردانی کرے گا اسے اس بات پر یقیناً حیرت ہو گی کہ ایک ایسے عہد میں جب بحری سفر کے بارے میں انسائیکلو پیڈیائی تصنیفات موجود تھیں، جب عرب مسلمان تاجروں
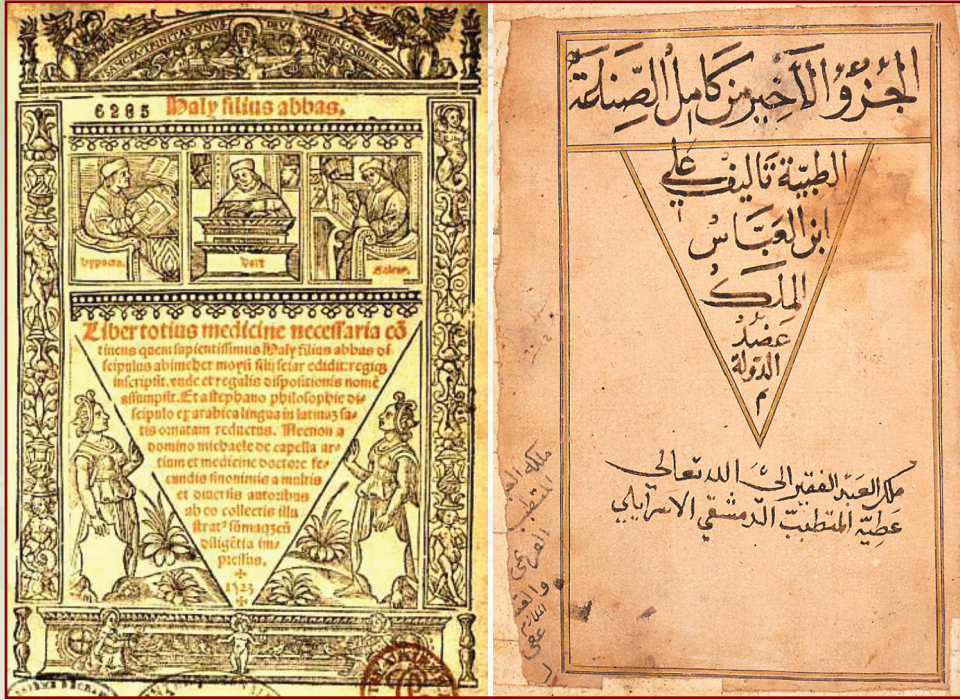
کتاب کامل الصناعۃ الطبیۃ اپنے لاطینی قالب کے ساتھ

کے جہاز انڈونیشیا سے لے کر افریقہ کے ساحلوں تک تجارت میں مصروف تھے اور جب یہ سب کچھ مسلمان جہاز رانوں کے لیے ایک معمول کا عمل تھا، اس وقت آخر واسکوڈی گاما کس بحری راستہ کی دریافت کے لیے نکلے تھے۔ یہ دریافت نوآزمودہ پرتگالیوں کے لیے تو یقیناً اہم تھی، لیکن اسے عالمی رزمیہ کے طور پر دیکھنے کا کوئی علمی جواز نہیں ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

شہاب الدین احمد بن ماجد، الفوائد فی اصول علم البحر القوائد، مخطوطہ نمبر: ۶۹۲۵۵۸۴۵۱، لائبریری آف کانگریس

۱۵۸۔ J. M. Roberts, *The Triumph of the West*, London, 1985, pp.175-194.

۱۵۹۔ پندرہویں صدی کے نصف آخر میں پوپ کی طرف سے جاری کیے گئے تین فرمان (Papal Bulls) بڑے دور رس اور بھیانک انجام کا باعث ہوئے۔ ۱۴۵۲ء کے فرمان، جسے Dum Diversas کا نام دیا جاتا ہے، کے مطابق پوپ نکولس پنجم کی طرف سے شاہِ پرتگال الفونسو پنجم کو اس بات پر مامور کیا گیا تھا کہ وہ ساراسن (مسلمان) اور دوسرے بے دینوں کی خبر لے اور ان پر ایک طرح کی ابدی غلامی مسلط کر دے۔ اس فرمان نے مغربی افریقہ میں سفید فام افراد کے ذریعہ غلاموں کی تجارت جیسے فعل شنیع کو جواز فراہم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ پوپ نکولس پنجم کے ایک دوسرے فرمان بمطابق ۱۴۵۵ء نے اس بات کا اذنِ عام عطا کر دیا کہ افریقہ اور امریکہ کے علاقوں میں غیر عیسائی اقوام کو غلام بنایا جائے اور ان کے علاقوں

پر قبضہ کرلیا جائے۔ ۱۴۹۳ء میں پوپ الگزنڈر ششم نے اسپین کو اس بات پر راغب کیا کہ وہ نئی دنیا امریکہ کے مقامی باشندوں کو تہذیب و ایمان کی دولت سے آشنا کرے، ان تین پے بہ پے احکامات نے آنے والے دنوں میں مغربی استعمار کے لیے راہ ہموار کردی۔ پھر انسانوں کے ہاتھوں انسانوں پر وہ مظالم ڈھائے گئے جس کا تصور بھی کوئی مہذب شخص نہیں کرسکتا۔ پندرہویں اور سولہویں صدی میں غلاموں کی خرید و فروخت ایک عالمی تجارت بن گئی۔ ملک کے ملک اپنے اصل باشندوں سے خالی کرالیے گئے۔ اس بارے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: حوالہ نمبرات ۱۹۲ تا ۱۹۶۔ *Dum Diversas* کے متن کے لئے دیکھئے:

Recueil des traités de médecine

رازی کی کتاب کا لاطینی قالب

(مترجم: گیرارڈ آف کریمونا، تیرہویں صدی)

European Treaties bearing on the History of the United States and its Dependencies to 1648, Frances Gardiner Davenport, editor, Carnegie Institution of Washington, 1917, Washington, D.C., pp. 20-26.

۱۶۰۔ Charles R. Boxer, *The Portuguese Seaborne Empire,* 1415-1825, London,1969, pp.22-3

۱۶۱۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: Janet L.Abu-Lughod*, Before European Hegemony,* Oxford, 1989, pp.19, 209, 258, 363.

نئی تہذیب کے مؤسس کی حیثیت سے واسکوڈی گاما کی اساطیری تصویر بھی مقبول عام مغربی رزمیہ کی پیدا کردہ ہے ورنہ خود اہل یورپ کی اپنی کتابوں میں اس بات کی وافر شہادت موجود ہے کہ ڈی گاما جب ہندوستان کے سفر پر چلا ہے تو وہ مروّجہ اور مانوس راستوں پر سفر کررہا تھا، جہاں عرب جہاز رانوں کی چلت پھرت عام تھی۔ اور یہ کہ ہندوستان میں جب ۱۴۹۸ء میں وہ پہنچا ہے تو اس وقت اس کا سامنا ایک ایسی تہذیب سے تھا جو پرتگالیوں کے مقابلے میں بدرجہا آگے تھی۔ آخر ہم اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کرسکتے ہیں کہ ۱۴۸۷ء میں شاہ پرتگال جان ثانی نے Pedro de covilha کو ہندوستان کے سفر پر بھیجا تھا جس نے واپسی پر اس امر پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ ہندوستانی بندرگاہوں پر اس نے جو کچھ دیکھا اس سے اس کی عقل دنگ رہ گئی۔ عرب تاجروں کے گودام مختلف قسم کے سامانوں سے بھرے تھے۔ محولہ: Joseph Desomogyi*, A Short History of Oriental Trade* (Hildeshei: Georg Olms Verlagsbuchhandlung, 1968), p.83

جب مسلمان وانزلنا الحدید فیھا باس شدید کی اہمیت سے واقف تھے۔

فتح قسطنطنیہ میں اس قبیل کے راکٹ نے دو کلومیٹر تک ٦ ٹن وزنی بارودی اسلحوں اور چٹانوں کی بارش کر دی تھی۔

ترکوں کی عسکری ہیبت کے سبب اسے ترک بمبار کا نام دیا جاتا۔

بلکہ خود ڈی گاما جب ١٤٩٨ء میں شکر، تیل اور کپڑے کے بنڈلوں کے ساتھ کالی کٹ پہنچا ہے تو یہ سامانِ تجارت دیکھ کر مقامی راجا کو ہنسی آگئی۔ وہاں موجود عرب تاجروں نے اسے بتایا کہ ان پرتگالیوں کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس کی ہندوستان میں ضرورت ہو یا جسے دیکھ کر انھیں تاجر سمجھا جائے۔ کیا عجب کہ تاجروں کے بھیس میں یہ بحری قزاق ہوں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے:

Joseph Needham in Mansel Davies, *A Selection from the Writings of Joseph Needham* (Lewes, Sussex: The Book Guild, 1990), p.176

١٦٢۔ ملاحظہ کیجئے: Fuat Sezgin, *Jabir ibn Hayyan, Texts and Studies.* Vo.I, *(Natural Sciences in Islam*, 69), Frankfurt, 2002.

١٦٣۔ McLean, Adam, *The Book of the Composition of Alchemy.* Glasgow, 2002, p.3; Ruska, Julius, *Arabische Alchemisten*, Wiesbaden, reprint, 1967, p.48

۱۶۴۔ فرانسس بیکن کے اصل الفاظ یوں ہیں:

The sciences which we possess have been principally derived from the Greeks, for the additions of the Roman, Arabic or more modern writers, are but few and of small importance, and such as they are, are founded on the basis of Greek inventions. *(Novum Organum,* p.332)

۱۶۵۔ جس شخص نے مغرب کو سب سے پہلے مشاہداتی اور تجرباتی منہج سے متعارف کرایا وہ فرانسس بیکن نہیں بلکہ روجر بیکن (۱۲۱۴ء-۱۲۹۲ء) ہے، جس کا زمانہ بیکن سے کوئی ساڑھے تین سو سال پہلے کا ہے۔ اس نے اپنی تین کتابوں *Opus Maius*، *Opus Minus* اور *Opus Tertium* میں اس منہج پر تفصیلی اظہار خیال کیا ہے۔ روجر کا یہ منہج علمی ان عرب کتابوں کے لاطینی ترجموں کی دین تھا جن سے اشتغال میں وہ عمر بھر مصروف رہا۔ *Opus Tertium* میں ان لاطینی کتابوں پر زر کثیر صرف کرنے کا اس نے تذکرہ کیا ہے:

I sought the friendship of all the wise men among the Latins; and I caused young men to be trained in languages, in geometrical figures, in numbers, in the construction of tables, in the use of instruments, and in many other necessary things... During this time I spent more than two thousand pounds in those things, and in the purchase of books and instruments.

اپنے عرب (مسلم) اساتذہ کی طرح روجر علم کے سلسلے میں اس انکسار کا حامل بھی ہے جس کے مطابق آگہی کی منزل طویل ہے اور حقیقت کا اصل علم تو صرف اللہ کے پاس ہے:

It is certain that never, before God is seen face to face, shall a man know anything with final certainty/ It is impossible therefore for a man to attain perfect knowledge in this life, and it is exceedingly difficult for him to attain imperfect truth, and he is very prone and disposed toward whatever is false and empty; wherefore man ought not to boast of his knowledge, nor ought anyone to magnify and extol what he knows. For his knowledge is small and of little value in comparison with what he does not understand, but believes, and still smaller in comparison with that of which he is ignorant and does not know either by faith or knowledge.

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان تحقیق و اکتشاف سے پہلوتہی کرے اور قدماء کا تابع و مہمل بن کر رہ جائے کہ بقول روجر اس سے بڑی کوئی لعنت نہیں کہ انسان پرانے انکشافات سے چمٹا رہے اور نئی راہوں کا متلاشی نہ ہو، سو انسان کو چاہیے کہ وہ ان چار چیزوں سے اپنا دامن بچائے جو تلاش حق میں بالعموم رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں۔ اولاً تقلید بزرگاں یعنی استناد کے لیے مشائخ یا اساتذہ کی طرف دیکھنا۔ ثانیاً رسم و رواج کے اثرات، ثالثاً مقبول عام تعصّبات اور رابعاً اپنے جہل اور اپنی کم مائیگی کا اعتراف نہ کرنا، جس کے لیے اکثر لوگ غیر ضروری اظہار علم کا سہارا لیتے ہیں۔ *Opus Majos* میں روجر نے بڑی تفصیل کے

Ospedale di Santa Maria della Scala

مسلم تہذیب کے زیر اثر اٹلی میں قائم ہونے والا غالباً یورپ کا پہلا ہسپتال

ساتھ حقیقت نفس الامر کی تلاش میں اس منہج کی افادیت کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

For there are two modes of acquiring knowledge, namely, by reasoning and by experience. Reasoning draws a conclusion, and makes us grant the conclusion, but does not make the conclusion certain, nor does it remove doubt so that the mind may rest on the intuition of truth, unless the mind discovers it by the path of experience... Aristotle's statement, then that proof is reasoning that causes us to know is to be understood with the proviso that the proof is accompanied by its appropriate experience, and is not to be understood as the bare proof. Reasoning does not suffice, but experience does... He therefore who wishes to rejoice without doubt in regard to the truth's underlying phenomena must know how to devote himself to experiment.

بیکن کے اس علمی اور استخراجی طرز فکر نے آنے والے دنوں میں مغرب میں ایسے اہل دانش کی ایک نسل پیدا کر دی جو چرچ کے مسلمہ معتقدات کے برعکس علم کو تحلیل و تجزیہ کی میزان پر پرکھنا اور مشاہدے و تجربے سے اسے صیقل کرنا لازم خیال کرتے تھے اور جس کے سبب انھیں چرچ کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ خود روجر بیکن سترہ سال تک چرچ کی قیود و بندشوں کا نشانہ بنے اور جب اپنی موت سے کچھ پہلے ۷۷ سال کی عمر میں انھیں رہائی ملی تو وہ بھی اس لیے کہ انھیں قید میں رکھنے کے باوجود ان کا مشاہداتی منہج عام ہو چکا تھا اور اس طرز فکر کو اب دیس نکالا دینا ممکن نہ تھا۔ مغرب میں اکتشافی علوم کی ترقی کا سہرا اسی طرز فکر کے سر جاتا ہے۔ مثال کے طور پر Leonardo da Vinci (1452-1519) کو لیجیے جو اس منہج کی اقتدا میں کہتے ہیں:

In undertaking scientific investigation I first plan a few experiments, because it is my design to base the problem on experience, and then to determine why the bodies in question are constrained to act in a given manner. This is to method that one must adopt in all researches.

۱۲۶۔ مغربی رزمیہ کا جو جتنا بڑا مغنی ہے وہ اتنے ہی زیادہ زور و شور سے فرانسس بیکن کی تقدیس کا نغمہ گاتا ہے۔ مثال کے طور پر میکالے نے اپنے مضامین میں *Novum Organum* کی بابت لکھا ہے:

No book ever made such a revolution in the mode of thinking, overthrew so many prejudices,

قاہرہ میں سلطان قلاوون (تیرہویں صدی) کا قائم کردہ ہسپتال

introduced so many new opinions... the glance with which he surveyed the intellectual universe reassembled that with which the archangel, from the golden threshold of heaven, darted down into the new creation.

۱۶۷۔ ملاحظہ کیجئے ایڈمنڈ برک کے یہ الفاظ:

Who is there that upon hearing the name of Lord Bacon does not instantly recognize every thing of genius the most profound, everything of literature the most extensive, everything of discovery the most penetrating, everything of observation of human life the most distinguished and refined.

(*The Works of the Right Honorable Edmund Burke,* vol.11, London, MDCCCLXXXVII)

۱۶۸۔ محولہ David C. Lindberg S. Westman, *Reappraisals of the Scientific Revolution* pages XVII

۱۶۹۔ حوالہ مذکور

۱۷۰۔ حوالہ مذکور

۱۷۱۔ مثال کے طور پر Thomas Sprat نے رائل سوسائٹی کی تاریخ ۱۶۶۷ء میں اس خیال کا اظہار کیا کہ عہد جدید کے مؤسسین نے قدماء سے صرف اختلاف پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنے لیے ایک صحیح منہج کی نشان دہی بھی کی ہے، جہاں تجربہ سے یقین کا احساس ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"Latitudinarianism and the 'Ideology' of the Early Royal Society: Thomas Spratt's History of the Royal Society (1667) Reconsidered." in Michael Hunter, *Establishing the New Science: The Experience of the Early Royal Society,* Woodbridge, 1989.

۱۷۲۔ Joseph M. Levine, "Ancients, Moderns and History: The continuity of English Historical writing in

the later seventeenth century", i*n Studies in Change and Revolution: Aspects of English Intellectual History, 1640-1800,* ed. Paul J. Korshin, Menston,1972, pp.43-75

۱۷۳۔ مغربی مورخین اور تجزیہ نگار انیسویں صدی میں مغرب کی اچانک سربلندی کے اسباب کا صحیح تجزیہ کرنے میں ابتدا سے ہی فریب نظر کا شکار رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو وہ گمراہ کن اصطلاحیں تھیں جسے مؤرخین نے مختلف ادوار کی تفہیم کے لیے نشاۃ ثانیہ، تحریک اصلاح، عہد تجلی یا سائنسی انقلاب کا نام دے رکھا تھا اور جسے خالصتاً مغرب کی پیداوار سمجھا جاتا تھا اور جس کی ابتدا ۱۴۹۲ء یعنی کولمبس کے بحری سفر سے بتایا جاتا تھا اور جس میں مبہم طور پر سقوط غرناطہ کی طرف بھی اشارہ مقصود تھا۔ اس تاریخ نگاری نے رفتہ رفتہ اتنا اعتبار حاصل کر لیا کہ کیرن آرم اسٹرانگ جیسی مشرق پسند خاتون نے بھی جب اپنی مشہور زمانہ تالیف *The Battle for God* کی ابتدا کی تو انھیں آغاز کے لیے ۱۴۹۲ء ایک فطری، تاریخی نقطہ معلوم ہوا۔ حالانکہ تاریخی حقائق سے معمولی شدبد رکھنے والا شخص بھی یہ جانتا ہے کہ پندرہویں صدی کے آخری ایام میں ایک نئے یورپ کی تشکیل کا کوئی واہمہ کسی عاقل و بالغ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ پھر میکس ویبر کا یہ کہنا کہ مغربی ذہن اپنی فطری عقل پسندی اور جذبۂ اکتشاف کے سبب بالآخر ایک نئی تہذیب کی قیام کا سبب بنا ہے۔ دراصل ایک چشم مجبور کا بیان ہے جو سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح اپنی آنکھوں پر پڑی پٹی کے سبب حقائق کا سیدھا نہیں بلکہ سادہ لوح ادراک رکھتا ہے۔ Eric L. Jones نے اس قبیل کے سادہ لوحوں کے لیے *The European Miracle* (1981) کے نام سے ایک بڑی دلچسپ اور چشم کشا کتاب لکھی ہے۔

۱۷۴۔ Molefi Kete Asante*, The Afrocentric Idea,* Philadelphia, 1987, p.4

۱۷۵۔ ملاحظہ کیجئے: W.W. Rostow کی کتاب *Stages of Economic Growth* (1962) اور *How it all Began* (1975)

۱۷۶۔ محولہ: Carlo M. Cipolla*, Public Health and the Medical Profession in the Renaissance,* 1976, p.276

۱۷۷۔ مرکیٹر (۹۴-۱۵۱۲ء) کی نقشہ نگاری نے مغرب کو دنیا کے مرکزی اسٹیج پر غالب مقام عطا کرنے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ سولہویں صدی میں پرنٹنگ پریس کے عام ہو جانے اور بحری سفر میں مغرب کی بڑھتی دلچسپی کے سبب وسیع پیمانے پر مفصل نقشوں کی طباعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نقشوں کی طباعت اس بات کا متقاضی تھی کہ بیضوی دنیا کو کاغذ کے مسطح صفحات پر پھیلا دیا جائے۔ مرکیٹر نے بیضوی حقائق کو مسطح ورق پر منتقل کرنے میں اصل جغرافیائی حقائق کا خیال نہ رکھا۔ شاید اسے یہ مسئلہ درپیش رہا ہو کہ ارض البلد تو خط استواء کے حوالے سے متعین ہو جاتا ہے، البتہ طول البلد کی ابتدا کا کوئی حتمی اصول نہیں ہے۔ مرکیٹر نے یہ نقشہ چونکہ اہل مغرب کی بحری سہولتوں کے لیے تیار کیا تھا، اس لیے فطری طور پر اس نے یوروپ کو نقطہ آغاز کے طور پر اختیار کیا، البتہ اس سعی میں جغرافیائی حقائق بری طرح مسخ ہو کر رہ گئے۔ جغرافیائی حقائق تو اس خیال کے داعی ہیں کہ جنوبی کرۂ ارضی میں خشکی کے علاقے شمالی کرۂ ارضی کے مقابلہ میں دوگنے ہیں، لیکن اس کے برعکس

ڈومینیکو بارٹولو کی اس مصوری (۱۴۴۱-۴۲ء) میں سانتا ماریا ہسپتال میں ابتدائی جوش وخروش کا ایک منظر

مرکیٹر کے نقشہ میں شمالی نصف کو جنوب کے مقابلہ میں دوتہائی بڑا دکھایا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسکینڈ ینویا جو دراصل ہندوستان کے مقابلہ میں ایک تہائی رقبہ کا حامل ہے، مرکیٹر کے نقشہ میں چین کا دوگنا دکھائی دینے لگا۔ اسی طرح براعظم افریقہ کے مقابلے میں گرین لینڈ کا رقبہ ۱۴ گنا کم ہے، لیکن مرکیٹر کے نقشے میں ان دونوں کا رقبہ تقریباً یکساں نظر آنے لگا۔ جب حقائق کو سائنسی اور علمی سطح پر اس طرح توڑ نا مروڑ نا ممکن ہو تو یورپ کو براعظم قرار دینے اور ہندوستان کو برصغیر کا درجہ دینے سے کون روک سکتا تھا۔ مصیبت یہ ہے کہ عرصہ ہائے دراز سے اس غیر علمی اور غیر سائنسی نقشہ کی دنیا پر حکومت ہے۔ تعلیمی اداروں سے لے کر تحقیقی مراکز تک اسی خیالی نقشہ کی حکمرانی ہے۔ ۱۹۷۴ء میں Arno Peters نے اس فریب کا پردہ چاک کرنے کی پہلی باضابطہ کوشش کی۔ اس نے ایک ایسا نقشہ تیار کیا جس میں دنیا کے ممالک کو ان کے اصل جغرافیائی رقبہ کے مطابق جگہ دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنوب کے مقابلہ میں شمال بونا نظر آنے لگا۔ مغرب کے تسلط اور اس کی جغرافیائی مرکزیت اور عظمت کا طلسم پاش پاش ہو گیا، لیکن آرتھر روبنسن جیسے بظاہر بااثر نقشہ نگاروں نے اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ پیٹر کا نیا نقشہ کوئی خوشگوار تاثر قائم نہیں کرتا۔ بقول ان کے ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے بھیگے اور بدنما انڈرویئر کو خشک ہونے کے لیے باہر لٹکا دیا ہو۔ بھلا کوئی ایسی کوشش جو مغرب کے مقبول عام اسطورہ کی بیخ کنی پر منتج ہو کیسے قابل قبول ہو سکتی تھی۔ اسے ہٹ دھرمی اور فریب دہی کے علاوہ اور کیا کہا جائے گا کہ ادراکِ حقائق اور سائنسی اطلاعات کے اس عہد میں جدید دنیا کے

لیے آج بھی مرکیٹر کا تراشیدہ نقشہ آخری حوالے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

۱۷۸۔ اشارہ ہے Martin Lewis اور Keren Wigen کی کتاب *The Myth of Continents* (1997) کی طرف۔

۱۷۹۔ Andre Gunder Frank, *ReORIENT: Global Economy in the Asian Age,* Berkeley: University of California Press, 1998, p.11

۱۸۰۔ K. N. Chaudhuri, "Reflections on the Organizing Principle of Premodern Trade" in *The Political Economy of Merchant Empires,* James D. Tracy (ed.), p.430.

۱۸۱۔ ملاحظہ کیجیے: Paul Bairoch, *Victoires et déboires: Histoire économique et sociale du monde du XVIe siècle à nos jours.* 3 vols. Paris, 1997: vol.2, pp.517-37

AVERROIS
CORDVBENSIS
COLLIGET
LIBRI VII.
CVM QVIBVS ETIAM NVNC PRIMVM IN QVINTO
ABIMERON ABYNZOAHAR.
VENETIIS APVD IVNTAS M D LXII.

ابن رشد کے لاطینی ترجموں پر مبنی ۱۶ ویں صدی یورپ میں رائج طب کی درسی کتاب کا سرورق

۱۸۲۔ William Falcner کا یہ قول Philip Curtin نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: Philip D.Curtin, *The Image of Africa* (Madison: University of Wisconsin Press, 1964), pp.65-6

۱۸۳۔ محولہ: Ronald Hyam, *Britain's Imperial Century, 1815-1914: a Study of Empire and Expansion,* London, 1976, p.81

۱۸۴۔ Raghavan Iyer, *The Glass Gurtain between Asia and Europe* (London: Oxford University Press, 1965), p.20

۱۸۵۔ مغرب نے مشرق پر اپنے تسلط کے جواز اور استعماری عزائم کو برحق ثابت کرنے کے لیے مشرق کا ایک ایسا تصور وضع کیا جس کے مطابق مغرب مشرق کا ضد قرار پایا۔ ہر خوبی مغرب کے ساتھ وابستہ ہوگئی اور ہر خرابی مشرق کا جزو لاینفک قرار پائی۔

LIBER THEIZIR
DAHALMODANA VAHALTADABIR:
CVIVS EST INTERPRETATIO,
Rectificatio Medicationis & Regiminis
æditus in Arabico à perfecto viro,
Abimeron Abynzoahar.

PROOEMIVM AVCTORIS.

Dixit seruus regis, scilicet Abimeron Abinzoahar Deum testor ꝙ non compilaui hunc librũ nisi vi & conamine multarum præcum, & causa fortis & continue impulsationis, & cum hoc temperaui & rectificaui id quod erat de difficultate i quaternis corruptis, qui erãt apud plures studentes in scientijs & in via alia scientiali. & in rebus medicinæ rationalis. & omnino dimitto compilationes scientiales antiquorum verborum quaternalium &

١٦ ویں صدی یوروپ میں ابن زہر کے لاطینی ترجموں پر مبنی ایک مقبولِ عام کتاب کا پہلا صفحہ

آنے والے دنوں میں مشرقی انسان کے مقابلے میں مغربی انسان یعنی سفید فام نسل کے تفوق کا اس زور و شور سے پروپیگنڈہ ہوا کہ اس کی عقلیت پسندی، تحمل و تدبر، سخت کوشی، روشن خیالی، ایمان داری، حریت فکری، مستقبل شناسی اور اس کی ناقابل بیان خلاقانہ صلاحیتوں پر اہل مشرق بھی ایمان لے آئے۔ یہ بات غیر شعوری طور پر ان کے دل و دماغ میں کچھ اس طرح بیٹھ گئی کہ وہ آج بھی اقوام مغرب کے مقابلے میں خود کو نسبتاً کم تر مخلوق تصور کرتے ہیں۔ ان کے دانشوروں کی زبانیں آج بھی اہل مغرب کی مدح و توصیف اور اپنے ہم وطنوں کے لیے لعن طعن میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ حالانکہ گزشتہ نصف صدی میں خود مغرب کی دانش گاہوں میں مشرق نژاد شہریوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے بلکہ اس تہذیب کی چمک دمک کو قائم رکھنے میں وہ ان کے شریک و سہیم رہے ہیں۔

١٨٦۔ اسے محض اتفاق پر محمول نہیں کیا جا سکتا کہ انیسویں صدی، جو مغربی رزمیہ کی تشکیل کا عہد ہے، اسی عہد میں مغرب میں عمرانی علوم کی با قاعدہ ابتدا ہوئی۔ اب تک مشرق کے خلاف غصہ، عناد، حسد اور نفرت نے احتجاج کی شکل لے رکھی تھی، اب اسے علمی اور سائنسی بنیاد فراہم کیا جانے لگا۔ معاملہ ڈارون کی سائنٹفک ریسیزم کا ہو یا انتھروپولوجیکل نہج کی تراش خراش کا، ان سب کا مقصد سفید فام نسل کی فطری برتری کو ثابت کرنا تھا۔ آگے چل کر اس خیال پر دلیل قائم کرنے کے لیے *Rise of the (Christian) West* جیسی کتابوں کی اتنی کثرت ہوگئی کہ اس گمراہ کن پروپیگنڈہ پر علمی تحقیق و تجزیہ کا گمان ہونے لگا۔

١٨٧۔ جرمن ماہر عمرانیات میکس ویبر علمی حلقوں میں اپنے معروضی تحلیل و تجزیہ کے سبب احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، لیکن ذرا گہرائی سے جائزہ لیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ بظاہر علم و تحقیق کے علمی لبادے میں یہاں بھی ایک مغربی مغنی کا ذہن کارفرما ہے۔ ویبر نے اس بنیادی سوال کا جواب فراہم کرنے کی کوشش کی ہے کہ آخر کیا وجہ ہے جس نے جدید سرمایہ داری کے ظہور کو مغرب میں ممکن بنا دیا جبکہ ان کے بقول مشرق غربت و افلاس کا شکار رہ گیا۔ اوّل تو یہ مفروضہ ہی غلط ہے جس سے کچھ اور

نہیں تو کم از کم عالمی تاریخ سے ویبر کی سخت ناواقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ ہم پہلے بھی خود مغربی مصادر کے حوالے سے یہ بتا چکے ہیں کہ اٹھارویں صدی کے خاتمہ تک یا محتاط انداز سے یہ کہہ لیجئے کہ ۱۷۷۶ء میں جب آدم اسمتھ کی کتاب *Wealth of Nations* لکھی گئی ہے، مغربی مفکرین کے ذہنوں پر مشرق کی مرفہ الحالی کا احساس نمایاں تھا۔ ہندوستان اور چین جیسے ممالک اور قاہرہ اور بغداد کے الف لیلوی شہر مغرب میں طلسماتی جاہ وحشم کے لئے مشہور تھے۔ پھر یہ سوال ہی لغو ہے کہ مغرب یونان وروم سے ہوتا ہوا جدید سرمایہ داری کی منزل پر کیسے پہنچ گیا۔ اصل سوال یہ ہونا چاہیے تھا کہ انیسویں صدی میں اچانک مشرق کی سطوت کو کیوں زوال آ گیا؟ وہ مغرب کی جارحیت اور اس کے استعمارانہ عزائم کا مقابلہ کرنے میں کیوں ناکام رہا اور پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ اسلامی مشرق جو اپنے ظہور کے بعد سے مسلسل عالمی سیادت کے منصب پر فائز تھا، جس کی کتابوں کے ترجموں نے مغرب کو اکتشافی دل و دماغ اور عقلی رویہ سے آشنا کیا تھا، جس کی عسکری قوت سے سولہویں اور سترہویں صدی کا یورپ لرزہ براندام رہتا اور جسے اہل مغرب Turkish Menace کا نام دیتے اور جس کی فوجیں سترہویں صدی کے آخری ربع تک ویانا کے دروازوں پر دستک دیتیں۔ وہی مشرق اچانک انیسویں صدی میں اتنا بے بس اور مجبور محض کیسے ہو گیا کہ چھوٹے چھوٹے جزیروں سے نکل کر مٹھی بھر سفید فام اقوام نے اس پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اگر سوال کو اس انداز سے مرصع کیا جاتا تو ویبر کو یقیناً ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ کس طرح پبلک اور پرائیویٹ اداروں کے علیحدہ قیام کے سبب جدید معاشی نظام کے قیام کا راستہ ہموار ہوتا ہے اور کس طرح عقلی اور نمو پذیر اداروں کی موجودگی معاشی ارتقا کے لیے مناسب مواقع فراہم کرتے ہیں۔

DE
VARIOLIS
ET
MORBILLIS
LIBER.
AVCTORE
RICHARDO MEAD,
Colleg. Medicor. Londin. et Edinburg. Socio,
Reg. Societat. Sodali, et Medico Regio.
HVIC ACCESSIT
RHAZIS, medici inter *Arabas* celeberrimi,
de iisdem morbis COMMENTARIVS.
LONDINI,
Proftant apud JOANNEM BRINDLEY,
Celfiff. Walliae Principis Bibliopolam,
in vico dicto *New Bond Street*,
MDCCXLVII.

رچرڈ میڈ کی کتاب جس کے سرورق پر رازی سے اخذ و استفادے کا تذکرہ موجود ہے

اپنی کتاب *The Religion of China* اور *The Protestant Ethic and Spirit of Capitalism* میں ویبر نے مغربی انسان کی عقلیت پسندی کا بڑے والہانہ اور واعظانہ انداز سے ذکر کیا ہے، لیکن وہ اس سوال کا جواب فراہم نہیں کرتے کہ ان کی عقلیت پسندی کا آخر سبب کیا ہے؟ نہ ہی وہ اس مفروضے کا تاریخی ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ مغربی انسان ہمیشہ سے

اسد البحر ابن ماجد کی کتاب الفوائد فی اصول علم البحر و القوائد مطبوعہ ۱۴۹۰ء

انسانی تاریخ میں اپنی فطری عقل پسندی کے سبب کسی خاص مقام کا حامل رہا ہے کہ اگر اس مفروضے کو درست مان لیا جائے جب بھی یہ عقدہ حل نہیں ہوتا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ مغربی انسان کا یہ فطری امتیاز عہد تاریک کے ہزار سالہ عہد میں اپنا کرشمہ دکھانے سے قاصر رہا؟

ویبر کے طریقۂ تجزیہ سے تفصیلی آگہی کے لیے دیکھئے: Randall collins, *Weberian Sociological Theory*, Cambridge, 1986, p.23. مزید دیکھئے ان کی دوسری کتابیں: *The Religion of China,* New York, 1951; *The Religion of India*, New York, 1958.

۱۸۸۔ Karl Marx and Friedrich Engels, *The Communist Manifesto,* Harmondsworth,1985, p.84

۱۸۹۔ ملاحظہ کیجئے: Karl Marx and Friedrich Engels, *The German Ideology*

۱۹۰۔ Jerry Brotton, *The Renaissance Bazaar: From the Silk Road to Michelangelo*, Oxford University Press, New York, 2002, p.185

۱۹۱۔ مثال کے طور پر Eric Jones نے اپنی مشہور زمانہ تالیف *The European Miracle* مطبوعہ ۱۹۸۱ء میں اس خیال کی پرزور وکالت کی ہے کہ جدید دنیا میں اہل یورپ کی سبقت کا راز یہ ہے کہ وہ اہل مشرق کے مقابلے میں ایک عقلی طرز فکر کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں آب و ہوا ایشیا اور افریقہ کے مقابلہ میں کہیں حیات افزا ہے۔ یورپ کی قلت آبادی کو بھی ایرک ایک مثبت قدر کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کے سبب بقول ان کے اہل یورپ کی مرفہ الحالی قائم ہے۔ گزشتہ برسوں میں ایرک کے اس نقطہ نظر کی صحت پر باوزن علمی اعتراضات عائد ہوتے رہے ہیں بلکہ یہ کہہ لیجئے کہ اہل

فکر کی ایک قابل ذکر تعداد ان متعصّبانہ پروپیگنڈے کو علمی تحقیق کے مغائر سمجھتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے:

Abu-Lughod, *J. Before European Hegemony: The world system A.D. 1250-1350,* New York, 1989. Blaut, J., "Colonialism and the Rise of Capitali*sm". Science and Society* vol.53, 2 6 0 - 2 9 6*, 1492*, New Jersy, 1992; Brading, D., and Cross, H., "Colonial Silver Mining: Mexico and Per*u", Hispanic- American Historical Review vol.52, 545-70*; Frank, A.G.*, Capitalism and Underdevelopment in Latin America,* New York, 1968.

۱۹۲۔ محولہ: Jerry Brotton, *The Renaissance Bazaar,* Oxford, 2002, p.180.

۱۹۳۔ ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی نے سرخ ہندیوں کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے، لکھتے ہیں: ’’مسولینی (Benito Mussolini, 1883-1945) کے ایک اطالوی سینیٹر کو نیوانگلینڈ یونیورسٹی کا پریزیڈنٹ، لائبریری کا معائنہ کروا رہا تھا۔ اس لائبریری کی سب سے نادر کتاب بائبیل کا وہ نسخہ تھا جو سترہویں صدی عیسوی میں ان ’سرخ ہندیوں‘ (Red Indians) کی زبان میں ترجمہ کرکے شائع کیا گیا تھا، جو کسی زمانے میں ’نیوانگلینڈ‘ کے اصل باشندے تھے۔ سینیٹر اس نسخے کو دیکھ کر بیحد مسرور ہوا۔ اس نے پوچھا کہ کیا یہ کتاب بیحد نایاب ہے؟ یونیورسٹی کے پریزیڈنٹ نے نہایت فخر سے جواب دیا کہ روئے زمین پر اب اس کے چھ نسخے بھی نہیں مل سکتے۔ سینیٹر نے یہ سن کر کہا کہ تب تو ریڈ انڈین اس کتاب کو نہ پڑھ سکتے ہوں گے۔ پریزیڈنٹ نے روانی میں کہا کہ اب ریڈ انڈین ہی نہیں رہے تو پڑھے گا کون؟ اطالوی سینیٹر نے پوچھا: کیوں؟ ریڈ انڈین کیا ہو گئے؟
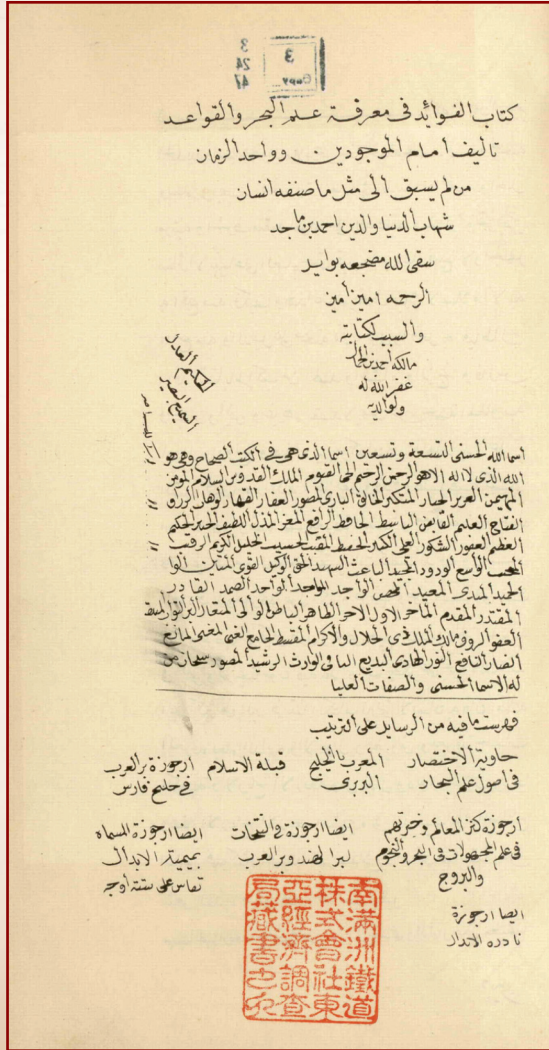
کتاب الفوائد فی معرفة علم البحر والقواعد
تالیف امام الموجودین وواحد الزمان
من لم یسبق الی مثل ما صنفه انسان
شهاب الدنیا والدین احمد بن ماجد
سقی الله مضجعه بوابل
الرحمه امین امین
والسبب لکتابته
مالکه احمد بن الحاج
غفر الله له
ولوالدیه

اسما الله الحسنی التسعة وتسعین اسما الذی هی فی الکتب الصحاح وهی هو
الله الذی لا اله الا هو الرحمن الرحیم الحی القیوم الملك القدوس السلام المومن
المهیمن العزیز الجبار المتکبر الخالق الباری المصور الغفار القهار الوهاب الرزاق
الفتاح العلیم القابض الباسط الخافض الرافع المعز المذل اللطیف الخبیر الحکیم
العظیم الغفور الشکور العلی الکبیر الحفیظ المقیت الحسیب الجلیل الکریم الرقیب
المجیب الواسع الودود المجید الباعث الشهید الحق الوکیل القوی المتین الولی
الحمید المبدی المعید المحصی الواجد الماجد الواحد الصمد القادر
المقتدر المقدم المؤخر الاول الاخر الظاهر الباطن الوالی المتعالی البر التواب المنتقم
العفو الروف مالك الملك ذی الجلال والاکرام المقسط الجامع الغنی المغنی المانع
الضار النافع النور الهادی البدیع الباقی الوارث الرشید الصبور سبحان من
له الاسما الحسنی والصفات العلیا

فهرست ما فیه من الرسایل علی الترتیب

حاویة الاختصار فی اصول علم البحار — المعرب بالخلیج البربری — قبلة الاسلام — ارجوزة بر العرب فی خلیج فارس

ارجوزة کنز المعالم وذخیرتهم فی علم المجهولات فی البحر والنجوم والبروج — ایضا ارجوزة فی التجارات لبر الهند وبر العرب — ایضا ارجوزة المسماه بممیزة الابدال تقاس علی ستة اوجه

ایضا ارجوزة نادرة الابدال

علمِ طب پر علی ابن عباس کی شہرۂ آفاق کتاب الملکی کا ہزار سالہ پرانا لاطینی ترجمہ جسے قسطنطین الافریقی نے انجام دیا تھا گذشتہ سال فن لینڈ کی قومی لائبریری نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔اوٹی کالٹیو کے اس جدید لاطینی ترجمہ نے پہلی بار جدید دنیا کو ایک قدیم علمی خزانہ سے براہ راست روشناس کرایا ہے۔اس کتاب کے ستر سے زائد لاطینی نسخے یوروپ کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔ علوم عربیہ یا اکتشافی علوم کے سات لاکھ سے زائد مسودے صرف ٹمبکٹو کی مختلف لائبریریوں میں اشاعت کے منتظر ہیں۔عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں موجود لاکھوں مسودات کا اگر عشر عشیر بھی منظر عام پر آجائے تو اس مفروضہ کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی کہ جدید دنیا مغرب کی تعمیر کردہ ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہمارے غور وفکر کا انداز یکسر بدل کر رہ جائے گا۔
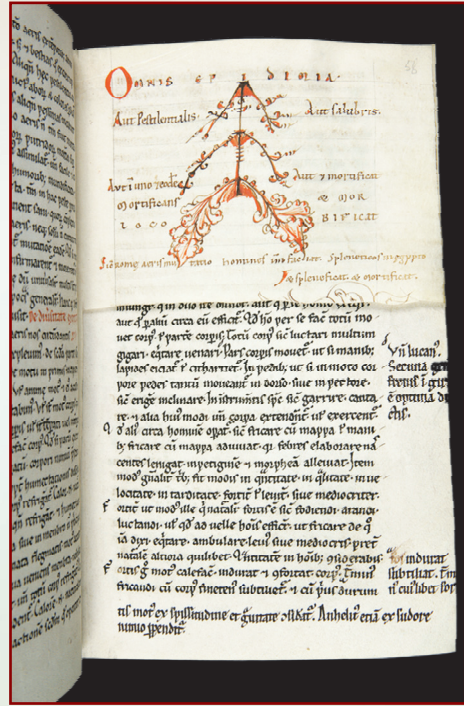
پریزیڈنٹ سٹپٹا گیا، پھر سنبھلا اور کہنے لگا کہ بس ناپید ہو گئے۔'' (ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی، اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور مستشرقین کا انداز فکر، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۷۳

۱۹۴۔ محولہ Jerry Brotton, *The Renaissance Bazaar,* Oxford, 2002, p.181

۱۹۵۔ ایضاً، ص ۱۸۲

۱۹۶۔ محولہ Radell, D.R. (1976), "The Indian slave trade of Nicaragua during the 16th century". *in The Native Population of the Americas in 1492* (W. Denevan, ed.)

۱۹۷۔ یورپ کی معیشت پر فتح امریکہ کے فوری اثرات پڑے۔ایک محتاط اندازے کے مطابق سترہویں صدی کے وسط تک کم از کم ایک سو اسّی ٹن سونا اور سترہ ہزار ٹن چاندی یورپ کو منتقل ہو چکی تھی۔ ہوسکتا ہے اصل مقدار اس سے بھی کئی گنا زیادہ ہو۔
ملاحظہ کیجئے: Blaut, J.M., *1492,* New Jersey, 1992, pp.38, 39

" نئے دماغ کی تیاری اور متحدہ مسلم شخصیت کی تعمیر کے لیے ایک ایسی دانش گاہ کا قیام بڑے انقلابی نتائج کا حامل ہوسکتا ہے جہاں سب کچھ ازسرنو کر دکھانے کا عزم پایا جاتا ہو۔ ایک ایسی تقلیبِ فکری جو ماضی کو عبرت کے لیے پڑھتی، حال کو تحلیل و تجزیہ کی میزان پر پرکھتی اور مستقبل کو بصیرت کی روشنی میں دیکھنے کی اہل ہو۔ "

پس نوشت

ایک نئی یونیورسٹی کا منصوبہ

”آج بھی جو لوگ ایک نئی یونیورسٹی کا ڈول ڈالیں گے انھیں اس بات کا خاص طور پر التزام کرنا ہوگا کہ یونیورسٹی کی بنیاد اس تصورِ حیات پر رکھی گئی ہو جس سے قرآن کی دعوتِ تسخیر و اکتشاف عبارت ہے۔ ایک آفاقی، الہامی اور زندگی بخش تصورِ حیات کے بغیر قائم کی جانے والی ہر دانش گاہ خواہ وہ اپنے مظاہر میں کتنی ہی خیرہ کن کیوں نہ ہو اور وسائل کی بہتات نے اس پر زندگی کا کتنا ہی دبیز ملمع کیوں نہ چڑھا دیا ہو ان کی اصل حیثیت روح سے خالی نالج انڈسٹری سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔“

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسلم ذہن ایک کربناک تشنج سے دوچار ہے۔ اس عمل پر کوئی ہزار سال کا عرصہ گزرا جب ایک کرم نما ثنویت اس کے فکری چوکھٹے میں سرایت کرگئی، تب سے اب تک اس ثنویت کے تدارک کی جتنی بھی کوششیں ہوئیں وہ بوجوہ بامراد نہ ہوسکیں۔ دین و دنیا کی اس بظاہر بے ضرر زمرہ بندی نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کچھ اس طرح دولخت کررکھا ہے کہ اب بڑے بڑوں کو اس کی شیرازہ بندی کا خیال بھی نہیں آتا۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کچھ اس بات سے لگائیے کہ صدیوں سے مسلم معاشرے میں جدید اور قدیم دو الگ الگ ذہنوں کی آبیاری ہوتی رہی ہے۔ ایک علم شرعی کا شناور ہے تو دوسرا علوم دنیا کا ماہر۔ ایک کو دوسرے سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ ایک کا وجود دوسرے کے لیے ناقابل انگیز ہے۔ اول الذکر نے اگر علومِ شرعی کے حوالے سے آخرت پر اپنی اجارہ داری قائم کررکھی ہے تو ثانی الذکر علومِ دنیا میں اپنی مہارت کے سبب خود کو سیادت کا سزاوار سمجھتا ہے۔ مسلمانوں کے یہ دو متحارب طبقے نہ صرف یہ کہ فکری اعتبار سے الگ الگ دنیا میں جیتے ہیں بلکہ زبان و بیان، تہذیب و معاشرت اور اپنے مخصوص ملبوسات سے بھی مسلسل اس بات کی شہادت دیتے رہتے ہیں کہ کبھی بنیان مرصوص کہی جانے والی یہ امت آج دولخت ہوکر رہ گئی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ امت کے زوال کے لیے روایتی علما کو موردِ الزام قرار دیتا ہے جو اس کے بقول بدلتی دنیا کی طرف مسلسل پیٹھ کیے بیٹھے ہیں جبکہ اہل جبہ کو یہ شکایت ہے کہ طبقہ جدید کی بے راہ روی اور اس کو قبولیت عامہ مل جانے کے سبب مسلمان اپنے متعینہ راستہ سے دور جاپڑے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف الزامات واتہامات کا سلسلہ گوکہ صدیوں سے جاری ہے لیکن آج بھی صورت حال یہ ہے گویا یہ دونوں باہم برسرِ پیکار طبقے زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں:

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

جس امت کو داخلی فکری محاذ پر ایک بحرانِ مسلسل کا سامنا ہو، جس کا فکری اور نظری وجود لخت لخت ہوچکا ہو اور جس کے حاملین خود کو ہر لمحہ باہم برسرِ پیکار پاتے ہوں، بھلا اس سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بیرونی محاذ پر اپنے واقعی

دشمنوں کے خلاف کوئی متحدہ، فیصلہ کن اور مؤثر کارروائی کر سکے گی۔ قوموں کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اس کے عروج و زوال کا پہلا اور بنیادی محرک اس کے فکر اور اس کے اندرون سے برآمد ہوتا ہے۔ جب تک آپ کی ملی عمارت میں شگاف پیدا نہیں ہوتا دشمن کے لیے اس بات کا کوئی موقع نہیں کہ وہ اپنا نفوذ ممکن کر دکھائے۔

ماضی میں احیائے امت کی جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں ان کی توجہ داخلی انتشار کے تدارک پر کم ہی رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فریق مخالف کے خلاف محاذ کھولنا تو آسان ہوتا ہے اور اس کے لیے ہنگامی حالات میں حمایت کا حصول بھی مشکل نہیں ہوتا، لیکن اس کے برعکس اپنے آپ کو فتح کرنا کچھ آسان نہیں۔ ہمارے فکری انحرافات اور داخلی خلفشار پر صدیاں گزر جانے کے بعد اب ہمیں یہ سب کچھ معمول کا عمل لگتا ہے اور شاید اسی لیے ہمارے کبار مصلحین بھی اسے قبول کیے لینے میں ہی عافیت جانتے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کا مذہبی طور پر فرقوں اور مسلکوں میں منقسم ہوجانا خواہ وہ شیعہ سنی کی باہمی گروہ بندی ہو یا فقہی مسالک کی رزم آرائیاں یا علوم شرعیہ اور علوم جدیدہ کے مابین برپا نزاعِ مسلسل۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک اختلاف کی ان بنیادوں پر تیشہ نہیں چلایا جاتا ہم ایک نئی ابتدا تو کجا خود کو ایک سرابِ مسلسل کے سفر میں مبتلا پائیں گے۔ فجر جدید کا ہر مژدہ ہم پر ایک صبح کاذب کی شکل میں طلوع ہوتا رہے گا۔

اسلام کی ابتدائی تین صدیوں میں جب علوم شرعیہ کی اصطلاح سے ہمارے حواس نا آشنا تھے، ایک ہمہ گیر علمی تحریک نے عالم اسلامی کو اپنے جلو میں لے رکھا تھا۔ مسجدوں کے حلقۂ درس، قصہ گورایوں کی لذت بیانیاں، فقہاء کی موشگافیاں، نحویوں کی نکتہ آفرینیاں، کتاّب کے ادارے، محدثین کے حلقے اور اکتشافی علوم کی بڑھتی لے کے سبب آگے چل کر رصدگاہوں کا قیام، یہ سب کچھ قرآنی دائرۂ فکر کا فطری شاخسانہ سمجھے جاتے۔ یہ سب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے تھے تردید نہیں۔ گو کہ ابتدائی صدیوں میں ہی قصہ گورایوں کے غیر محتاط بیانات اور تراشیدہ روایات کی شہرت و اشاعت کے سبب ایک نئے بحران کی آہٹ صاف سنائی دیتی تھی۔ اہل علم نے اپنی بساط بھر اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے روایات و آثار کی تنقید و تطہیر کے پیمانے وضع کیے لیکن تب بھی کسی کو اس بات کا خیال نہ آیا کہ وہ بعض علوم کو تو شرعی اور دینی قرار دے کر قبولیت تامہ بخشے اور بعض علوم کو غیر شرعی یا دنیوی قرار دے کر لائق نفریں بتائے کہ تب علم ایک وسیع اصطلاح تھی اور حکمت ضالۃ المومن کا نام تھا۔ مسلمان عالمی سیادت پر اپنے استحقاق کے سبب انسانی تہذیب اور علوم کے مجموعی ورثے پر اپنا حق سمجھتے۔ اخذ و اکتساب کی اس صحت مند روایت نے ایک انتہائی مختصر عرصہ میں اقوامِ عالم پر ان کی فضیلت قائم کر دی تھی۔

مسلم ذہن کی یہ دولختی جو آج ہمیں علومِ شرعیہ اور علوم جدیدہ کے حوالے سے نظر آتی ہے، باضابطہ طور پر تو نظامیہ بغداد کے مدارس سے منقح ہوئی، البتہ اس کی ابتدا فاطمیین کے مصر میں اس وقت ہوگئی تھی جب خلافت کے فاطمی دعویداروں نے سیاسی اور نظری پروپیگنڈے کے لیے باقاعدہ ایسے داعیوں کا ایک ہراول دستہ تیار کرنے کی ضرورت محسوس کی جو دین

و مذہب کی زبان میں فاطمیوں کے استحقاق پر دلائل قائم کرسکیں۔ مذہب کی زبان میں سیاسی استحقاق کا یہ پروپیگنڈہ اتنا مؤثر ثابت ہوا کہ جلد ہی عباسی بغداد کو نظامیہ مدرسوں کی شکل میں اصحاب شرع کے ادارے قائم کرنا پڑے۔ خلافت کے عباسی دعویداروں نے نہ صرف یہ کہ فاطمیین کے خلاف مخالفانہ پروپیگنڈے اور گمراہ کن فتاویٰ کا سلسلہ شروع کیا بلکہ کبار علمائے وقت کو باقاعدہ اس کام پر مامور کیا کہ وہ فاطمیین کے حسب ونسب پر شبہات وارد کریں اور انھیں باطل ٹھہرانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھیں۔ غزالی کی فضائح الباطنیہ اس سلسلہ کی ایک روشن مثال ہے۔ سیاسی پروپیگنڈے کو مذہب کی زبان مل جانے کا ایک نقصان یہ ہوا کہ بڑی بڑی صلاحیتیں اور اعلیٰ دماغ اہل علم اس وقتی اور نزاعی کام پر مامور ہوگئے۔ اہل شرع کے مدارس اور صوفیاء کی خانقاہیں سرکاری نوازشوں کے سزاوار قرار پائے۔ بڑے بڑے وقف املاک اور اقطاع کے نام سے گاؤں کے گاؤں ان نزاعی اداروں کے لیے وقف کردیے گئے۔ نوبت بایں جارسید کہ غزالی جیسا عالم جو خود اس نزاع میں ایک کلیدی رول ادا کر رہا تھا اور جو ان نوازشات سے خود بھی متمتع ہوا تھا وہ اس صورت حال پر خاموش نہ رہ سکا۔ اسے اس بات کا شکوہ تھا کہ اس زمانہ میں جو شخص جاہ ومنصب کا طالب ہے وہ علوم شرعیہ کی دانش گاہوں کی طرف رخ کرتا ہے کہ سماجی اور سیاسی مراتب کے ساتھ بڑے بڑے وقف املاک پر تصرف اسی راستہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔ رہے طب اور اس جیسے دوسرے اکتشافی علوم تو ادھر کوئی اس لیے جانا پسند نہیں کرتا کہ ان علوم سے وابستگان کے لیے نہ تو سیاسی اور سماجی توقیر کا کوئی امکان ہے اور نہ ہی یہ انھیں اوقاف اور اقطاع کی سربراہی پر فائز کرسکتا ہے۔ فاطمیین کا مصر ہو یا نظام الملک کا بغداد، دونوں کو ایسے علمائے شرع کی ضرورت تھی جو مذہب کی زبان میں مؤثر سیاسی پروپیگنڈے کا کام کرسکیں اور جو ان حکمرانوں کے سیاسی استحقاق پر بزبانِ شرع دلائل قائم کرسکیں۔

روایات وآثار اور فقہ وتعبیر کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بڑے دوررس اور بھیانک اثرات مرتب ہوئے۔ آگے چل کر جب ان دو متحارب خلافتوں کی چپقلش ان کے غیاب کے سبب اپنے اختتام کو پہنچی اور یہ خلافتیں تاریخ کے اوراق میں گم ہوگئیں جب بھی سیاسی استحقاق کے ان متحارب دلائل سے ہمارا پیچھا نہ چھوٹا کہ یہ وقتی سیاسی پروپیگنڈہ علوم شرعیہ کی کتابوں میں مدون اور محفوظ ہو چکا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علومِ شرعیہ کی دانش گاہیں جو وقتی سیاسی ضرورت کے تحت قائم ہوئی تھیں انھیں ہمیشہ ہمیش کے لیے امت میں ایک عمومی استناد حاصل ہوگیا تھا۔ یہ خیال عام ہوا کہ علوم دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک علوم شرعیہ جسے مذہب کے حوالے سے تقدیس کا مرتبہ حاصل ہو چکا تھا اور دوسرا علوم العجم یا علوم جدیدہ جس کی بے توقیری اس کے عجمی الاصل ہونے سے ہی مترشح تھی۔ حالانکہ علوم کی یہ تقسیم جسے پہلی مرتبہ ابوعبداللہ الکاتب الخوارزمی (متوفی ۳۸۷ھ) نے اپنی کتاب مفاتیح العلوم میں متعارف کرایا تھا کوئی سوچی سمجھی اصطلاح نہ تھی۔ یہ ایک فہرست ساز کی اپنی تراشیدہ زمرہ بندی تھی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ آنے والے دنوں میں اس کی وضع کردہ علوم شرعیہ کی یہ اصطلاح گمراہ کن التباسات کا سبب بنے گی اور مسلمان اس التباس کا شکار ہوجائیں گے کہ بعض علوم شرعی ہیں جن کے

حاملین وارثانِ علوم نبوت کے حوالے سے تقدیس کے سزاوار ہیں جبکہ دوسرے علوم اہل عجم کے پرداختہ ہیں اور اس لیے انھیں اول الذکر جیسی توقیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

علومِ شرعیہ کے یہ ادارے جو وقتی سیاسی مصلحتوں کے پیداوار تھے جلد ہی ایک نئی پاپائیت کا علامیہ بن گئے۔ یہ خیال عام ہوا کہ دین کی تشریح وتعبیر کا تمام تر حق علمائے شرع کو ہے،جن کی مذہبی حیثیت وارثانِ علوم نبوت کے حوالے سے مستحکم ہے۔ حالانکہ ان علمائے شرع کی بنا میں ابتدا ہی سے مسلکی اور فرقہ وارانہ طرز فکر نمایاں تھا۔ ان کی سرپرستی نظام وقت کے نظری ہراول دستہ کی حیثیت سے ہی کی جاتی رہی تھی۔ علمائے ازہر اگر فاطمیین کی خلافت کو برحق ثابت کرنے پر مامور تھے تو نظامیہ بغداد کے ادارے سنی فکر کے نقیب تھے،جن کا کام آلِ عباس کے سیاسی استحقاق کو جواز فراہم کرنا تھا۔ ان متحارب اور متنازع اداروں کو علومِ شرعیہ کا قلعہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اختلاف وجدال مسلم ذہن کا لازمہ بن گیا۔ یہ بات اب ناقابل تصور سمجھی جانے لگی کہ اسلام کا کوئی متحدہ پیغمبرانہ قالب بھی ہوسکتا ہے،جس پر متحارب روایتوں،سیاسی مناقشوں اور جدالِ فقہی کے اثرات نہ پائے جاتے ہوں۔ تب سے اب تک مسلم فکر سنّیت اور شیعیت کے گردابِ محوری کی کچھ اس قدر اسیر ہے کہ آج ایک متحدہ اسلامی قالب کی تشکیل کا خیال عبث معلوم ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کسی ایسے اقدام سے مروّجہ اسلام کی عمارت ہی زمیں بوس ہوجائے گی۔

علوم شرعیہ کی اصطلاح ایک اور بڑے التباس کو جنم دینے کا باعث ہوئی ہے وہ یہ کہ اسلام میں تشریح وتعبیر کا حق کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص ہے۔ اسلام جس حریت فکری کا نقیب ہے اور قرآن مجید میں رسول اللہ کو اصر واغلال سے نجات دہندہ کے طور پر جس طرح پیش کیا گیا ہے اس کے بعد تاریخ کا اس سے بڑا طنز اور کیا ہوسکتا ہے کہ طبقہ علماء کے حوالے سے ایک نئی پاپائیت نامحسوس طور پر ہمارے ہاں متشکل ہوجائے اور ان احبارِ اسلام کی شقی القلبی انھیں باقاعدہ فتووں کے اجرا پر آمادہ کرے اور وہ زبانِ حال وقال سے اس بات کے داعی ہوں کہ وہ بندوں اور خدا کے درمیان تشریح وتعبیر کے حوالے سے ایک مقامِ خاص کے حامل ہیں۔ حالانکہ ان فتووں کی نقیض خود ان فتووں سے مسلسل ہوتی رہتی ہے کہ ایک عالم کا فتویٰ دوسرے سے متصادم اور ایک کی فقہی بصیرت دوسرے کو مسترد کر رہی ہوتی ہے اور جس کے بطلان پر کسی اور کا نہیں خود قرآن کا یہ فتویٰ موجود ہے: ولو کان من عند غیر اللہ لو جدوا فیہ اختلافاً کثیرا۔

جن علوم شرعیہ کے حوالے سے علمائے تقدیس نے احبارِ اسلام کا منصب حاصل کر رکھا تھا خود اس کی تنگنائی کا حال یہ تھا کہ وہ مکمل انسانی زندگی کا احاطہ نہیں کرتے تھے۔ علمائے شرع کی قیل وقال کا محور ومرکز صرف آیات احکام تھے جن کی تعداد حسب توفیق ڈیڑھ سو سے پانچ سو آیات شمار کی جاتی تھیں۔ باقی ماندہ قرآن مجید یا تو محض کتاب تلاوت تھا یا عملاً معطل ومنسوخ کہ آیات اکتشاف علمائے شرع کے دائرۂ کار سے باہر سمجھی جاتی تھیں۔ قرآن مجید پر علمائے شرع کی اجارہ داری سے ایک دوسرا نقصان یہ ہوا کہ اکتشافی علوم کے حاملین کا تعلق رفتہ رفتہ کتاب ہدایت سے کمزور پڑتا گیا۔ مسلم

معاشرہ جو کبھی حریت فکری کا نقیب تھا جہاں ایک بدوی عورت عمرؓ کے فہم قرآن پر برسرِ مجلس اعتراض وارد کردیتی اور خلیفۂ وقت کو اپنے موقف سے رجوع کرنا پڑتا، علمائے شرع کے عروج کے بعد اس صحت مند مکالمہ کا کوئی موقع نہ رہا کہ اب فتویٰ کی کاٹ فتویٰ کی زبان ہی کرسکتی تھی۔ گویا تشریح وتعبیر طبقۂ علماء کا درونِ خانہ وظیفہ بن چکا تھا۔ عوام کالانعام کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان متحارب فتووں میں سے ہی کسی ایک کو اپنے لیے منتخب کرلیں کہ یہ مضحکہ خیز خیال عام تھا کہ چاروں ائمہ فقہاء بیک وقت حق پر ہیں، خواہ وہ بظاہر ایک دوسرے سے متصادم کیوں نہ معلوم ہوتے ہوں۔ دین اسلام میں علوم شرعیہ کے منقح ہوجانے سے خود اسلام کی ایسی ہیئت تقلیبی ہوئی کہ رسالۂ محمدیؐ کا متحدہ قالب ہمارے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ وقتی سیاسی نزاع نے علوم شرعیہ کے تقدیسی عمل سے جلا پاکر شیعیت اور سنیت اور اس جیسے دیگر قالب پیدا کیے اور خود ان فرقوں کے اندر بھی علوم شرعیہ اور علوم جدیدہ کے حوالے سے متبعین محمدؐ مختلف خانوں میں بٹ کر رہ گئے۔

آج جب علوم شرعیہ کی اصطلاح پر کوئی ہزار سال کا عرصہ بیت چکا ہے اور علمائے شرع کے ادارے نے دین مبین میں وارثین علوم نبوت کے حوالے سے تقدیسی اہمیت حاصل کرلی ہے، عام مسلمانوں کے لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا کچھ آسان نہیں کہ علوم شرعیہ کا مروّجہ تصور اور علمائے شرع کی تعبیری حیثیت ہمارے بحرانی تاریخ کی پیداوار ہے اور یہ کہ اسلام میں کسی قسم کی پاپائیت خواہ وہ سیاسی اور نسلی حوالے سے قائم ہوئی ہو، جیسا کہ خلافت کے فاطمی اور عباسی دعویداروں کا موقف تھا یا تشریح وتعبیر کے حوالے سے منقح ہوئی ہو، جیسا کہ احبارِ اسلام کا دعویٰ ہے، یہ سب کچھ دراصل دین مبین کی بنیادی تعلیمات اور اس کے مزاج سے مغائر ہے۔ خدا کی کتاب ایک ایسا لازوال عطیہ ہے جس سے ہر شخص اپنی بساط اور توفیق بھر اکتساب کا حقدار ہے۔ کسی کی سیاسی حیثیت یا علمی اختصاص اسے اس عمل میں لغزشوں سے ماورا قرار نہیں دے سکتا۔ مسلم معاشرہ بنیادی طور پر خدا سے بندے کے راست تعلق کے تصور سے غذا حاصل کرتا ہے۔ عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی رسولؐ کی قرآن فہمی پر ایک غیر معروف بادیہ نشین عورت شبہات وارد کرسکتی ہے۔ جنگ ردّہ کے اسیران کے سلسلے میں ابوبکرؓ کا سخت موقف عمرؓ اور دوسرے اصحابِ نبیؐ کے نزدیک غیر ثقہ قرار پاسکتا ہے اور خلیفۂ وقت اپنی تمام تر سیاسی قوت کے باوجود ان فیصلوں پر عمل درآمد سے گریز میں ہی عافیت جانتا ہے۔ جب ابوبکرؓ اور عمرؓ کا فہم قرآن چیلنج ہوسکتا ہے اور یہ حضرات اپنے موقف پر نظر ثانی یا گریز عمل کی ضرورت محسوس کرسکتے ہیں تو پھر ہما شما کے فتووں کو تقدیسی حیثیت عطا کرنے کا آخر کیا جواز ہے؟ رہے کبار فقہائے عظام جن کے حوالے سے سنی اسلام کے چار مختلف قالب کا وجود قائم ہے یا کبار شیعی مؤسسین جن کی کتب اربعہ نے شیعی اسلام کا قالب تیار کیا ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ انھیں اس کام پر نہ تو خدا نے مامور کیا اور نہ ہی ان حضرات نے رسول اللہ یا ان کے اصحاب کی صحبت پائی۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان کے بغیر آج ہمیں اسلام کو متصور کرنے کا خیال ناممکن العمل معلوم ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اب تک امت میں تجدید واصلاح کی جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں وہ اس مسئلہ سے دانستاً یا نادانستاً صرف نظر کرتی رہی ہیں۔ جب تک ہم اپنی شخصیت کو پھر سے مرصع نہیں کرتے، جب تک ہم

اپنے اندرون میں جاری اس فکری اور نظری خلفشار پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہوتے، جو ہر لحظہ ہمیں لخت لخت کیے دیتی ہے، تب تک کسی نئی ابتدا کا خیال ان ہی پرانے دائروں میں لایعنی گردش پر منتج ہوگا۔ ایک نئی ابتدا کے لیے ایک ایسی شخصیت کی تعمیر کم سے کم شرط ہے جو تاریخ کے بجائے وحی ربانی سے راست غذا حاصل کرتی ہو، جو علوم کے اجتماعی سرمایہ سے نہ صرف یہ کہ واقف ہو بلکہ اس احساسِ گناہ سے اس کے دامن یکسر نا آلودہ ہوں کہ علومِ شرعیہ کے علاوہ دوسرے علوم کی طلب میں اس نے علم کی کسی کم تر شاخ کو اختیار کر رکھا ہے۔ رسالۂ محمدی سے اس کی واقفیت ائمہ اربعہ یا ائمہ اثناعشر کے تراشیدہ خانوں میں الجھ کر نہ رہ گئی ہو بلکہ تاریخی اسلام سے ماوراء دین کے متحدہ اور حقیقی قالب تک اس کی رسائی ہو۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ امت کو سیادت علیا کے منصب پر پھر سے متمکن دیکھنے کے لیے لازم ہے کہ ہم ان انحرافات و التباسات کی بساط لپیٹنے کی اپنے اندر ہمت پاتے ہوں جو تاریخ کے مختلف ادوار میں ہمارے ہاں در آئی ہیں اور جنھیں بدقسمتی سے ہم دین اسلام کا حقیقی قالب سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

اس بات کی صداقت سے بھلا کون انکار کر پائے گا کہ ہمارے سیاسی زوال اور نظری التباسات و انحرافات کا ایک بنیادی عامل سیاسی نزاع کو مذہب کی زبان مل جانا رہا ہے جس نے آگے چل کر باقاعدہ شیعہ سنی خانہ جنگی کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس نزاع نے ہمیں جس طرح دولخت کیا اور جس طرح ہماری تاریخ اس باہمی معرکہ آرائی سے لہولہان ہے، اس کی کربنا کیوں کو کون محسوس نہیں کرتا؟ تب فاطمیوں کی خلافت یا آلِ بویہ کی امیر الامرائی اس بات کی طالب تھی کہ ایک فرقہ وارانہ اور مسلکی قالب روز افزوں ترقی پائے۔ دوسری طرف سنی اسلام کی تشکیل عباسی خلفاء کی سیاسی ضرورت تھی جس کے بغیر مساجد کے منبروں سے **اللهم اغفر للعباس و ولده مغفرة ظاهرة و باطنة لا تغادر ذنبا** کی صدا بلند نہیں ہو سکتی تھی۔

اب جب یہ سیاسی چپقلش اور ان کے قائمین قصۂ پارینہ بن چکے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ ان کی فکری باقیات ہمارے ملّی سفر میں مسلسل مزاحم ہوتی رہیں۔ اسی طرح علم کے سلسلے میں آج من حیث الامت ہم جن التباسات کے شکار ہیں اور جس کے سبب اکتشافی علوم پر ہماری گرفت مسلسل ڈھیلی پڑتی گئی ہے اس کے تدارک کے بغیر ہمارا ہر اقدامی عمل دراصل ہماری رجعت کی شہادت دے گا۔ ہمارے بہترین دماغ علومِ شرعیہ کے دھوکے میں جزوی، فروعی اور لاطائل بحثوں سے اشتغال جاری رکھیں گے۔ ان کا تقدیسی سایہ علم کے سلسلے میں ہمارے التباسات کو زندگی عطا کرتا رہے گا اور ہمارے اندر دو متحارب قسم کے مسلم دماغ اور مسلم شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں گی۔ دین و دنیا کی اس ثنویت کو جب تک اعتبار حاصل رہے گا آخر کوئی ان کم تر درجہ کے علوم سے اشتغال کیوں کر رکھے گا جن کے حصول سے اسے آخرت میں کامیابی اور دنیا میں وارثِ علومِ نبوت کی تقدیسی توقیر عطا نہیں ہو سکتی۔ ایک نئی ابتدا کے لیے صرف فرقہ وارانہ تاریخ کو لپیٹنا ہی کافی نہ ہوگا بلکہ اس بنیادی التباس کا پردہ چاک کرنا ہوگا جس نے علم کی روشنی سے ہمیں محروم کر رکھا ہے اور جس کے سبب تحلیل و تجزیہ کی ہر کوشش بامراد ہونے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے۔

ہم اب تک اس خیال کے اظہار سے گریزاں رہے ہیں کہ علوم کی شرعی اور غیر شرعی کی تقسیم ایک غیر قرآنی اور گمراہ کن مغالطہ ہے، گو کہ ہمارے بعض سکہ بند علماء ماضی میں بھی زیر لب اس صورت حال پر احتجاج کرتے رہے ہیں۔ غزالی فقہ کو علومِ شرعیہ میں شمار نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک اس کا تعلق امور دنیا سے ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس زیرِلب احتجاج کو ایک بے لاگ علمی محاکے کی شکل دی جائے اور بلا خوف لومۃ ولائم اس بات کا برملا اعلان کیا جائے کہ علوم کی شرعی اور غیر شرعی خانوں میں تقسیم فی نفسہٖ ایک غیر شرعی خیال ہے جو خالصتاً ایک بحرانی تاریخ کی پیداوار ہے اور جس کے جواز پر کتاب وسنت سے دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ نکاح وطلاق اور فقہ وآثار کا علم بھی شرعی ہے اور انفس وآفاق کا باریک بیں مشاہدہ اور سیروا وانظروا کی دعوت پر لبیک کہنا بھی مطالباتِ شریعت کا ہی حصہ ہے۔ ہماری دینی دانش گاہوں میں عصری علوم کی شمولیت کا غلغلہ اگر کوئی خوش کن نتیجہ برآمد کرنے میں ناکام رہا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم علم کے سلسلے میں ان انحرافات والتباسات کا پردہ چاک کرنے میں ناکام رہے ہیں جس نے عباسی بغداد کے بحرانی لمحات میں ہمیں آلیا تھا۔ دوسری طرف عصری دانش گاہوں میں اسلامی علوم کی پیوندکاری اگر کوئی خوشگوار اثر مرتب کرنے میں ناکام رہی ہے تو اس کی وجہ بھی شرعی علوم کے سلسلے میں یہی التباسِ فکری ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم جس چیز کو شرعی علوم سمجھ بیٹھے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ قرآنی تصورِ علم سے مغائر ہے بلکہ اس کی تشکیل وتدوین میں روزِ اوّل سے ہی ایک ناقص منہجِ علمی کو دخل رہا ہے۔ ذرا غور کیجئے تفقہ کا یہ اصول اربعہ جس میں قرآن مجید کے بالمقابل روایات وآثار، اجماع اور قیاس کو بھی یکساں اہمیت دی گئی ہو اور ان تینوں ظنی مآخذ کو بھی کتاب اللہ کے لازوال ماخذ کی طرح تعبیر وتدوین میں معتبر جانا گیا ہو، بھلا کسی ایسے منہج سے اختلافات کے علاوہ اور کیا برآمد ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان ظنی مآخذ نے کتاب ہدایت کی تجلیوں پر التباسات کی شدید دھند قائم کررکھی ہے۔ قرآن مجید جو وحی ربانی کا لازوال، غیر محرف اور حتمی وثیقہ ہے بسا اوقات تاریخ وآثار اور اجماع وقیاس کے تابع ہوکر رہ گیا ہے۔ جب تک اس غیر علمی منہج کو چیلنج نہیں کیا جاتا اور کتاب ہدایت کی غیر مشروط حتمی حیثیت بحال نہیں ہوتی کسی نئی ابتدا کا خیال پرانے ازکاررفتہ خیالات کی بےلذت جگالی پر منتج ہوگا اور ہم خود کو اسی گردشِ محوری میں مبتلا پائیں گے۔

بین بین کی بات بہت ہوچکی اب یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ تمام ائمہ فقہاء حق پر ہیں۔ دراصل اس قسم کی گمراہ کن وسعت قلبی نے ہی مدت سے ہمارے فکری قافلے پر روک لگا رکھا ہے۔ ہم نہ تو کسی واقعی تحلیل وتجزیہ کی اپنے اندر ہمت پاتے ہیں اور نہ ہی ہمیں اپنے انحراف فکری کی سنگینی کا واقعی احساس ہو پاتا ہے۔ عہد عباسی کی سیاسی مصلحتیں ایک صلح جو اسلامی ملغوبے کی طالب تھیں سو سیاسی مصالح کے تحت سنی اسلام نے خلفائے اربعہ کو سوادِ اعظم کے عقیدے کے طور پر پیش کیا۔ عباسی خطبہ میں آلِ عباس کی فضیلت کے ساتھ ہی تفضیل علیؓ اور پنجتن کا ذکر بھی شامل ہوا۔ یہ سیاست دانوں کی وقتی مصلحتیں تھیں کہ انھوں نے تاریخ کو عقیدے کے طور پر پڑھنے کی کوشش کی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان وقتی تدابیر سے نہ تو

امت کا اختلاف ختم ہوا اور نہ ہی متحدہ اور پیمبرانہ اسلام کی طرف ہماری واپسی ہوسکی۔ بلکہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے ہمارا ملّی وجود فرقوں اور طائفوں میں بٹتا گیا۔ پھر چونکہ علم کی روشنی ہمارے ہاتھوں سے پھسل چکی تھی اور واصل بن عطا کا عطا کردہ منہج علمی، جس پر تفقہ اور تدبر کی تمام عمارت قائم تھی، غور وفکر کا آخری حوالہ بن چکا تھا جسے عبور کیے بغیر قرآنی دائرۂ فکر میں ہماری واپسی ممکن نہ تھی۔ آج ایک نئی ابتدا کے لیے نہ صرف یہ کہ ہمیں علم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم کو مسترد کرنا ہوگا بلکہ اس التباسِ فکری سے باہر آنے کے لیے لازم ہوگا کہ ہم اصولِ دین اور اصول فقہ کا بھی ازسرنو قرآنِ مجید کی روشنی میں بے لاگ محاکمہ کرسکیں، جبھی یہ ممکن ہے کہ ہم منہج علمی کی لغزشوں اور اس کے پیدا کردہ صدیوں پر محیط لٹریچر سے اپنے آپ کو کسی حد تک بچا سکیں۔ قرآنی تصورِ حیات کی تشکیلِ نو یا اس کی واپسی کے بغیر دینی مدارس میں عصری علوم کی شمولیت ایک بے ضرر بوجھ ہی معلوم ہوگا جس سے نہ تو شخصیت کی ثنویت ختم ہوسکے گی اور نہ ہی کسی واقعی غلغلہ انگیز مسلم ذہن کی تعمیر کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو پائے گا۔

عصری دانش گاہوں کی صورت حال بھی کچھ قابل رشک نہیں۔ دینی درس گاہوں میں اگر **وجدنا آبائنا کذالک یفعلون** کا ورد سنائی دیتا ہے تو ہماری عصری دانش گاہیں بھی تقلید غرب کا شاہکار نمونہ ہیں، جہاں خیال پیدا کرنے کے بجائے خیال درآمد کرنے پر سارا زور ہے۔ ان کی معراج اگر کچھ ہے تو یہی کہ وہ مغرب کے علمی اداروں سے خود کو زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کرلیں۔ ابتدا ہی سے یہ ایک طرح کے catch-up syndrome میں مبتلا ہیں جس سے کم از کم اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرات قرآنی دائرۂ فکر کو مہمیز کرنے، اس کے چشمۂ صافی سے جرعۂ زندگانی پینے اور علوم کا آبشار اپنے اندرون سے بہانے کے بجائے صرف باہر سے آنے والی روشنی پر اکتفاء کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ اپنے عظیم ماضی اور صدیوں پر محیط علمی اور سائنسی روایت سے ناواقف ہیں، جس کی روشنی بنائے مغرب میں شامل رہی ہے اور جس کے سبب آج مغرب بقعۂ نور نظر آتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کی عصری دانش گاہوں میں بھی علومِ اسلامی کی پیوند کاری اب تک کوئی نتیجہ پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے اور شاید اسی لیے علی گڑھ کے قیام سے لے کر OIC کی قائم کردہ اسلامی یونیورسٹیوں میں بھی اسے دینیات کے شعبہ یا اسلامیات اور علوم وحی کی فیکلٹی تک محدود رکھا گیا ہے۔ جہاں اسلامی علوم سے مراد شرعی علوم کا ناقص تصور ہو وہاں یہ بات کیسے سوچی جاسکتی ہے کہ تاریخی اسلام سے ماوراء اور مروّجہ منہج فقہی کے علاوہ بھی دین اور تعبیر دین کا کوئی انقلاب انگیز اور زندگی افزا طریقۂ کار ہوسکتا ہے۔ سرسید جنھیں عصری علوم کی ترغیب کے حوالے سے اولیت اور سبقت حاصل ہے کسی حد تک اس بات سے تو آگاہ تھے کہ دین کا مروّجہ فہم اور مطالعہ اسلامی کا مقبولِ عام منہج رسالۂ محمدی سے مغائر ہے۔ سرسید نے اپنے تہذیبی ورثہ کے سلسلے میں تو تحلیل وتجزیہ اور نقد واعتراف کا صحت مند رویہ اختیار کیا جس سے کم از کم ایک نئے علم کلام یا ازسرنو غور وفکر کی امید پیدا ہو چلی، لیکن مغرب کے سلسلے میں ان کا رویہ معتقدانہ بلکہ مقلدانہ ہونے کے سبب وہ ایک نئی علمی روایت کی بناڈالنے میں ناکام رہے۔ انھوں نے

کیمبرج اور آکسفورڈ کو، جن کی اسلامی طرزِ تعمیر پر مبنی قدیم عمارتوں کو دیکھ کر وہ مبہوت ہو گئے تھے، کو اپنے لیے نمونہ قرار دیا لیکن وہ مغربی پروپیگنڈے کے زیرِ اثر اس بات کو فراموش کر گئے کہ اس روایت کی داغ بیل اور اس کے ارتقاء و فروغ میں ہمارا ہی رنگ و روغن شامل ہے۔ 'علوم عربیہ'، جو عہدِ وسطیٰ میں اکتشافی سائنسی علوم کے لیے مستعمل اصطلاح تھی، اگر مسلمانوں کے ہاتھوں یورپ کو منتقل نہ ہوئے ہوتے اور اگر صقلیہ اور اندلس کی مسلم دانش گاہوں میں عہدِ وسطیٰ کے یوروپی علماء کی تعلیم و تربیت کا انتظام نہ ہوا ہوتا، اگر گیارہویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک سائنس اور ٹیکنالوجی کی عربی کتابیں لاطینی اور دوسری مغربی زبانوں میں مسلسل ترجمہ نہ ہوتی رہتیں تو مغرب کی خیرہ کن سائنسی تہذیب جس سے سرسید مبہوت ہو گئے تھے، وجود میں نہ آ سکتی تھی۔ اپنے عہد کے دوسرے علماء کی طرح سرسید بھی بدقسمتی سے سفید فام انگریزوں کی نسلی، سیاسی اور تہذیبی برتری پر ایمان لے آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی تہذیبی روایت میں ایک نئے باب کے آغاز کے بجائے علی گڑھ نے پوری طرح مغرب کی علمی روایت کو بغیر کسی تحلیل و تجزیہ کے قبول کر لیا۔ انھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ بعض دیانت دار انگریزوں کو علی گڑھ میں مسلمانوں کی نئی نسل کو تہذیب سے مزین کرنے کی خدمت پر مامور کیا، لیکن اس پوری تگ و دو میں یہ بات نگاہوں سے اوجھل ہو گئی کہ علی گڑھ کو آکسفورڈ اور کیمبرج کا چربہ بنانے کی یہ کوشش چربہ دل و دماغ ہی پیدا کر سکتے تھے۔ طبع زاد اور قائدانہ دل و دماغ اس روایت میں تشکیل نہیں پاتے جو ہر لمحہ کسی catch-up syndrome میں مبتلا ہو۔ جلد ہی قدیم علمی روایت، اجتہاد و اصلاح کی غلغلہ انگیز بحثیں، روایتی علوم کے شعبوں میں جز و مہمل بن کر رہ گئیں۔ خود سرسید کی ذاتی فہم و بصیرت اور تفسیر و تعبیر کا عظیم الشان علمی منہج علی گڑھ کی مقلدانہ فضا میں کارِ لایعنی قرار پایا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ علی گڑھ اپنے بانی کی حریتِ فکری اور ان کی مجتہدانہ فکر و بصیرت سے مسلسل مزاحم ہوتا رہا ہے۔ علی گڑھ کی خدمات اپنی جگہ لیکن یہ سب کچھ اس بہت بڑی قیمت کے سبب ہے جو اس کے بانی کو اپنے اصل عزائم سے مصالحت کی شکل میں ادا کرنا پڑی۔

عبدہٗ کا ازہر ہو یا شبلی کا ندوہ یا اس قبیل کی تجدیدِ نصاب کی دوسری کوششیں، اس میں شبہ نہیں کہ سرسید کے مقابلے میں ان حضرات کو ایک جاری، گو کہ مضمحل، روایت کی بنیاد حاصل تھی لیکن یہ ایک منحرف روایت تھی جو وحی ربانی سے کہیں زیادہ قدمائے یونان کی قیل و قال کی پروردہ تھی۔ پھر قدیم و جدید کی کوئی کوشش کسی نئی اسلامی صبح کی ضمانت کیسے دے سکتی تھی۔ ازہر ہو یا ندوہ منہجِ تعبیر میں وہ اپنے حریفِ مقابل دیوبند سے کچھ مختلف نہ تھا بلکہ آگے چل کر جب ابوالاعلیٰ مودودی نے علی گڑھ کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ایک نئے نظامِ تعلیم کا خاکہ پیش کیا تو وہاں بھی ان کی نگاہیں مروّجہ علوم شرعی کی تدوین میں الجھ کر رہ گئیں۔ اکتشافی علوم ان کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ یہ تمام حضرات اصلاح و تجدید کے شدید داعیات کے باوجود اسلام کے متوارث فہم کو اس کا اصل الاصل قرار دے بیٹھے تھے۔ قرآن مجید سے راست اکتساب کے تمام تر دعاوی کے باوجود ائمہ اربعہ کے خیمے سے وابستگی کو جزوِ ایمان جانتے تھے۔ کلامی منہج کی مضرتوں

پر اپنی وقیع تنقید کے باوجود ایک نئے منہجِ علمی کا ڈول ڈالنا امرِ محال سمجھتے تھے کہ اس سے متوارث اسلام کی تاریخی بنیاد ہل جاتی تھی۔ ان میں سے کوئی سنی تھا اور کوئی سنی حنفی یا شافعی یا حنبلی۔ زندگی بھر کا مطالعۂ اسلامی انھیں ان تراشیدہ انسانی حوالوں سے آزاد نہ کر سکا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوتا کہ وہ ائمہ اربعہ سے ماورا، شیعہ سنی فرقہ بندیوں سے اوپر اٹھ کر اسلام کی اس متحدہ اور غیر محرف علمی روایت کی تشکیل کر پاتے جو حاملین کتاب کے ہاتھوں کتاب کائنات کے والہانہ مطالعہ سے عبارت ہے۔

ایک نئی ابتدا بالکل ہی نئے انقلابی اقدامات کی طالب ہے۔ غور وفکر کے پرانے سانچے جب تک نہیں ٹوٹتے ایک نئے شاکلے کی تشکیل نہیں ہوسکتی۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجیے کہ آج جب ہمارے علمی التباسات اور منہجی انحرافات پر کوئی ہزار سال کا عرصہ بیت چکا ہے نئے اقدامات کے لیے کم سے کم شرط ایک نئے دماغ کی تیاری ہے جو یقیناً پرانی کتابوں کے مطالعہ سے تیار نہیں ہوسکتا۔ یہ نیا دماغ تشریح وتعبیر کے گھسے پٹے طریقوں کے بجائے قرآن مجید کو ایک نشانِ ہدایت کے طور پر کچھ اس طرح برتنے کا اہل ہوگا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی شاہراہ وحی کی تجلّیوں سے جگمگا اٹھے۔ آیات احکام کے ساتھ ساتھ آیات اکتشاف بھی اس کی توجہ کا محور ہوگا، گویا پوری کتابِ ہدایت کو ایک وحدت رسالہ کے طور پر برتنے کی طرح ڈالی جائے گی اور اس طرح **جعلوا القرآن عضین** کی موجودہ صورت حال کا خاتمہ ہوسکے گا۔ ہمیں اولاً اس حقیقت کا ادراک کرنا ہوگا کہ آخری نبی کے متبعین کی حیثیت سے اب رہتی دنیا تک تاریخ کی کمان ہمارے ہاتھوں میں تھما دی گئی ہے۔ رسولؐ کے غیاب میں قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسے **حجة بعد الرسل** کی ہے جسے تمام اقوام عالم کے لیے منشورِ حیات کی حیثیت حاصل ہو۔ انسانی زندگی سے اس کی بے دخلی خواہ فکری ونظری التباسات کے سبب ہو یا تعبیر وتشریح، تاریخ وآثار اور کلامی وفقہی حیلوں سے اس کے مطالب پر پہرہ بٹھانے کی کوشش کی گئی ہو، ایسا کرنا صرف مسلمانوں کا ملّی نقصان نہیں بلکہ کاروانِ انسانی کی راہ گم کردینے کا موجب ہے۔ گزشتہ چند صدیوں سے، جب سے عالمی سیادت سے ہماری معطلی عمل میں آئی ہے، اس کے بھیانک نتائج مسلسل سامنے آرہے ہیں۔ ثانیاً ہمیں اس حقیقت کے اعتراف میں بھی کوئی تکلف نہ ہونا چاہئے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں دانش یونانی کے زیر اثر جس اجنبی کلامی منہج کی گونج سنائی دیتی تھی وہ بالآخر واصل کے اصول اربعہ سے جلا پا کر ایک مستند منہج علمی کے طور پر رائج ہوگئی۔ کلامی طریقۂ جرح وتعدیل سے نکلنے کی ہر کوشش مزید اسی عمل کا توسیعہ بنتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ وتعبیر کے کسی آزاد منہج کی تشکیل کے امکانات معدوم ہوتے چلے گئے۔ آنے والے دنوں میں مسلمانوں کے مختلف سیاسی فرقوں نے اس منہج کو اپنے گروہی مقاصد کے لیے استعمال کیا سو جو لوگ فلسفہ کے مخالف تھے انھیں بھی اپنے مخالفین کے مقابلے کے لیے کلام میں استعداد بہم پہنچانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس طرح دین کی تشریح وتعبیر ہمیشہ ہمیش کے لیے ایک اجنبی منہج کی تابع ہوکر رہ گئی۔ نئے دماغ کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اس مروّجہ منہج علمی کی مضرت رسانیوں سے نہ صرف یہ کہ آگاہ ہو بلکہ وہ کتاب وحکمت کی روشنی میں ایک نئے منہج علمی کے

قیام کا حوصلہ بھی رکھتا ہو۔ ثالثاً دانش یونانی نے رسالۂ محمدی کی مزاحمت میں منہج تعبیر وتفقہ کے علاوہ اکتشافی تحریک کا راستہ بھی روکنے کی کوشش کی تھی۔ یونانی علماء کی اکتشافی کتابوں کے ترجموں اور ان کی تقلیب واصلاح میں عہد اموی اور عہد عباسی پر مشتمل چند قیمتی صدیاں ضائع ہوگئیں۔ اکتشافی علوم کے یونانی التباسات کو تو مسلمانوں نے مشاہدے اور تجربے کی میزان پر مسترد کر دیا اور اس کی جگہ علوم کی ایک نئی دنیا آباد کر ڈالی، البتہ فقہ وتعبیر کے کلامی منہج سے انھیں آج تک رہائی نہ مل سکی۔ نئے دماغ کے لیے صدیوں کی تعبیری روایت کا محاکمہ یقیناً کچھ آسان نہیں، لیکن اس کے بغیر ہر نئی ابتدا دراصل قدیم فرسودہ عمل کا توسیعہ ہو کر رہ جائے گی۔ رابعاً نئے دماغ کے لیے لازم ہوگا کہ وہ کتاب ہدایت سے اکتساب کے عمل میں تاریخ وآثار سے کام تو ضرور لے البتہ اسے فہم متن کی کلید نہ قرار دے ڈالے۔ وحی کا یہ مقام نہیں کہ اسے تاریخ وآثار کا تابع بنا دیا جائے۔ ایک حتمی وثیقہ کو جس کے لفظ لفظ کی صحت شکوک وشبہات سے بالاتر ہو، ظنی ماخذ کے حوالے کر دینا دراصل اس کی معطلی کے مترادف ہے۔ تاریخ کو نہ تو متن کی کلید قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تاریخ کا یہ مقام ہے کہ وہ دین اور عقیدے کا سا اعتبار حاصل کر لے، جیسا کہ شیعہ، سنی، حنفی، شافعی اور زیدی، جعفری فرقوں کو دین کا مستند قالب قرار دینے کا سبب ہوا ہے۔ نیا مسلم دماغ جسے فی زمانہ کارِ رسالت کو پھر سے مہمیز کرنا ہے نہ تو شیعہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی سنی اور نہ ہی حنفی، شافعی جیسے غیر قرآنی حوالوں سے اسے متہم کیا جانا چاہیے۔ خامساً ایک نئی ابتدا کی ضرورت اس اعتراف حقیقت کا حامل ہے کہ قرآن مجید کی برپا کردہ علمی اور اکتشافی تحریک کے مطلوبہ نتائج برپا ہونا ابھی باقی ہیں۔ اجنبی منہج علمی کی سرایت اور اس کے نتیجہ میں آگے چل کر اکتشافی کے بجائے اساطیری طرز فکر کی مقبولیت نے بالآخر ہماری پیش قدمی پر روک لگا دی۔ تسخیر واکتشاف کے داعیوں نے خود اپنے ہی ہاتھوں ۱۵۸۰ء میں استنبول میں قائم کردہ دنیا کی سب سے بڑی رصد گاہ کو منہدم کر ڈالا۔ یہ وہی عہد ہے جب ٹائیکو براہے مغرب میں یورپ کی پہلی رصد گاہ کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ آگے چل کر، کوئی پون صدی بعد، ۱۶۷۵ء میں انگلینڈ میں واقع گرین وِچ کی پہاڑی پر برطانوی رصد گاہ کے قیام نے سیادت کی تبدیلی کا گویا اعلان کر ڈالا۔ گرین وچ مین ٹائم بہت جلد ساری دنیا کے لیے معیارِ وقت بن گیا۔ نئے مسلم ذہن کو اساطیری طرزِ فکر کو خیر باد کہتے ہوئے ایک بار پھر وقت اور تاریخ کی کمان کو اپنے ہاتھوں میں لینا ہوگا اور یہ تب ہی ممکن ہے جب اسے اس بات کا واقعی ادراک ہو کہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ امت مامور ہیں جن کے بغیر تاریخ کا سفر بے معنی ہو جاتا ہے۔

نئے دماغ کی تیاری اور متحدہ مسلم شخصیت کی تعمیر کے لیے ایک ایسی دانش گاہ کا قیام بڑے انقلابی نتائج کا حامل ہو سکتا ہے جہاں سب کچھ از سر نو کر دکھانے کا عزم پایا جاتا ہو۔ ایک ایسی تقلیبِ فکری جو ماضی کو عبرت کے لیے پڑھتی، حال کو تحلیل وتجزیہ کی میزان پر پرکھتی اور مستقبل کو بصیرت کی روشنی میں دیکھنے کی اہل ہو۔ فی زمانہ دنیا بھر میں دانش گاہوں کے جو نمونے ہمارے سامنے ہیں اور جن کے دم سے موجودہ تہذیب کی چمک دمک قائم ہے خواہ یہ شرق میں واقع ہوں یا غرب میں پائے جاتے ہوں ان سے اخذ واکتساب میں ہمیں کمال درجہ کی احتیاط برتنی ہوگی۔ مشرق میں اگر علم ثنویت کا

شکار ہے تو مغرب میں بھی خاص طور پر ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس کے قیام کے بعد ادب وفلسفہ وسائنس وٹیکنالوجی کے مابین خلیج مسلسل وسیع ہوتی رہی ہے۔ فلسفہ اور ادب کا طالب علم مغرب کے ٹکنالوجیکل تہذیب میں اجنبی اور تنہا ہوکر رہ گیا ہے۔ گویا علمی ثنویت اور شخصیت کی دولختی سے مغرب کی دانش گاہیں بھی محفوظ نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سوپر اسپیشلائزیشن نے روحِ جستجو کو کچھ اس طرح حصے بخرے کر دیا ہے کہ ایک عمومی ناآگہی ہمارا مقدر بن گئی ہے۔ ایسی صورت میں مغرب کی اعلیٰ دانش گاہوں کو جوں کا توں درآمد کر لینا ہمارے مسائل کا مداوا نہیں ہوسکتا۔ دانش گاہیں محض علم نہیں بانٹتیں اور نہ ہی کسی مجرد علم کا کوئی وجود ہے بلکہ یہ ایک تہذیبی شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں جو دراصل اس تصورِ حیات کی رہینِ منت ہوتی ہیں جن کی تاریخی، مذہبی اور تہذیبی روایت نے انھیں تشکیل دیا ہوتا ہے۔ یہ مغالطہ کم گمراہ کن نہیں کہ مغرب کی اعلیٰ دانش گاہوں کو عالمِ اسلام میں منتقل کر لینے یا ان کے کیمپس کے قیام سے ہم چشم زدن میں اپنے علمی افلاس کا سدِ باب کر سکیں گے۔ مغرب کی دانش گاہیں اپنی تمام تر جلالتِ علمی اور اعلیٰ تحقیقی معیار کے باوجود دراصل اہلِ مغرب کے تصورِ حیات کی پروردہ اور امین ہیں۔ ان سے مطلوبہ مسلم دماغ تو کجا ایک بے لوث آفاقی طرزِ فکر کی تعمیر کا امکان بھی کم ہے۔ خود مغرب کے ژرف بیں علماء ان دانش گاہوں کے زوال اور بے رحم سرمایہ کاروں کے ہاتھوں اس کی پامالی کا تذکرہ کرتے رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کے واقعی ادراک کے لیے لازم ہے کہ ان امراض کی خاص طور پر نشان دہی کر دی جائے جن میں عہدِ جدید کی اعلیٰ ترین دانش گاہیں مبتلا ہیں اور جن سے اجتناب کی ہمیں ہر ممکن تدبیر کرنی ہوگی۔

اس میں شبہ نہیں کہ مغرب میں یونیورسٹیوں کے قیام اور اس کے ارتقا کی تاریخ اسلامی مشرق کے اثرات واحسانات سے مملو ہے۔ نئی تاریخ نویسی نے گزشتہ چند برسوں میں اس بات کے وافر ثبوت فراہم کر دیے ہیں کہ پالرمو، بلوگنا، پیرس اور آکسفورڈ کی یونیورسٹی عرب اسلامی اثرات کے نتیجے میں قائم ہوئی اور کوئی پانچ چھ صدیوں تک علومِ عربیہ یعنی اکتشافی علوم کے لاطینی اور مقامی ترجمے ان دانش گاہوں میں داخلِ نصاب رہے، حتیٰ کہ ۱۶۱۹ء تک آکسفورڈ میں جیومیٹری اور فلکیات کے اساتذہ کے لیے عربی زبان سے واقفیت لازم خیال کی جاتی تھی۔ ابن سینا کے القانون فی الطب کا مغرب کی درس گاہوں میں متداول ہونا ہر خاص وعام کے علم میں ہے۔ ہم اس بات سے بھی ناآگاہ نہیں کہ فی نفسہٖ لفظ کالج کلیہ ہی کی مغرّب شدہ شکل ہے اور یہ کہ یونیورسٹیوں میں نہ صرف یہ کہ بیچلر، ماجستر اور ڈاکٹریٹ کی درجہ بندی اسلامی مشرق سے مستعار کردہ ہے بلکہ تقسیم اسناد کے موقع پر ہڈ اور گاؤن کا لباس فاخرہ آج بھی اس روایت کے اسلامی الاصل ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ اس اعتبار سے مغرب کی دانش گاہیں ہمارے اکتشافی مشن کا ہی توسیعہ ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی ہی پیدا کردہ اس عظیم الشان علمی روایت کے سلسلے میں اپنے دلوں میں تنگی محسوس کریں۔ اگر انیسویں صدی میں یورپ میں دانش گاہوں کی تقلیبِ فکری نہ ہوئی ہوتی اور اگر بعض سیاسی عوامل کے تحت انھوں نے اوہام اور پروپیگنڈے کو علم وآگہی کے منصب پر فائز نہ کیا ہوتا اور آگے چل کر خاص طور سے امریکی ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس کے وجود میں آجانے کے بعد

سرمایہ داروں نے اسے اپنے مذموم مقاصد کی آماجگاہ نہ بنایا ہوتا تو ہمیں اس علمی روایت کو اپنی ترقی یافتہ شکل میں درآمد کرنے میں کچھ تکلف نہ ہوتا، لیکن افسوس کہ انیسویں صدی میں مغرب کے استعمارانہ ذہن نے نہ صرف یہ کہ اپنے تفوق کے جواز کے لیے نئے اساطیر تراشے اور انھیں مستند تاریخ کا درجہ دے ڈالا بلکہ ایسے علوم بھی ایجاد کیے جن کا بنیادی مقصد سفید فام نسل کے نسلی، سیاسی، تاریخی اور ذہنی تفوق پر دلیل لانا تھا۔ تاریخ ہو یا جغرافیہ نویسی، عمرانی علوم ہوں یا سائنٹفک ریس ازم سے مملو نام نہاد معروضی مشاہدات، انیسویں صدی میں مغرب کے دانشوروں نے اپنے تعصّبات اور اوہام سے علم کی ہر شاخ کو پامال کر ڈالا۔ استعمار کی صدیوں میں جہاں اسلامی مشرق اپنی بقا کی جنگ میں مصروف تھا، ان غیر علمی نظریات کو چیلنج کون کرتا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب اپنے ہی پیدا کردہ تعصّبات کا قیدی بن کر رہ گیا اور اگلوں کے لیے مغربی علوم اور ان کی اتباع میں قائم ہونے والی دانش گاہیں دانشورانہ قید گاہیں بن گئیں۔ مثال کے طور پر فرائڈ کے سائکوانالسس کو لیجیے جس کا سکہ بیسویں صدی کے آخری ایام تک چلتا رہا ہے تا آنکہ نیوروسائنس کی جدید تحقیق اور برین میپنگ کے نئے آلات نے انسانی دل و دماغ کے سلسلے میں ایک بالکل ہی مختلف صورت حال کی خبر دی اور جس کے مطابق متصوفین کی کبریائی سے لے کر ڈپریشن کے مریضوں تک احساسات کی تبدیلی دراصل سیروٹونین میں سطح کی تبدیلی کے سبب بتائی جاتی ہے۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء جس نے بیسویں صدی میں ایک طرح کی سائنٹولوجی کو جنم دیا، آج DNA کی جدید تحقیقات کے سبب اپنا اعتبار کھوتا جا رہا ہے۔ اسی طرح انتھروپالوجی کی وہ تمام قیاس آرائیاں جو اہل مشرق کو غیر عقلی اور وجدانی قرار دیتی ہیں اور اس کے برعکس مغربی انسان کو ایک عقلی رویہ کا حامل بتاتی ہیں یا جو یہ بتاتی ہیں کہ سفید فام انسان کا دماغ دوسری اقوام سے نسبتاً بڑا ہوتا ہے، اب اپنا اعتبار کھوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ان جیسے دوسرے بہت سے گمراہ کن التباسات کی قلعی کھلنا ابھی باقی ہے۔ مارکس اور ویبر جیسے دو باہم مختلف تجزیہ نگار، جن کی فکری مداخلتوں نے مغربی ذہن کو مرصع کرنے میں اہم رول انجام دیا ہے، مشرق کے سلسلے میں ان کی گمراہ کن تاریخی بصیرت سے پردہ اٹھنا بھی ابھی باقی ہے۔ جب صورت حال یہ ہو کہ مغرب کے زیر اثر دنیا بھر کے اسکولوں میں رائج مرکیٹیر کا تیار کردہ خریطۂ عالم غیر حقیقی صورت حال کا عکاس ہونے کے سبب مشرق کی تحقیر اور مغرب کی کبریائی کا کام انجام دے رہا ہو، جہاں محض پروپیگنڈے کے زور پر جزائر یورپ کا مختصر سلسلہ براعظم قرار پایا ہو اور ہندو پاک جیسی وسیع سرزمین کو مشترکہ طور پر sub-continent کا رتبہ مل سکا ہو، جہاں گرین لینڈ کا مختصر خطہ جو رقبہ میں چین کا ایک چوتھائی ہونے کے باوجود چین کے مقابلہ میں دوگنا دکھائی دیتا ہو، جہاں اسکینڈے نیویا ہندوستان کے مقابلہ میں رقبہ میں ایک تہائی ہونے کے باوجود اس کے ہم پلہ دکھائی دیتا ہو اور اس مغرب زدہ گمراہ کن خریطۂ عالم کے اصلاح کی علمی کوشش یہ کہہ کر رد کر دی گئی ہو کہ اصل اسکیل پر نقشوں کی ترتیب نو ذوق لطیف کے خلاف ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ دنیا کا نقشہ نہ ہو بلکہ کسی نے بدہیئت، گیلے انڈرویئر لٹکا دیے ہوں، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغرب کی یہ جدید دانش گاہیں آزادانہ غور و فکر اور بے لاگ معروضی تجزیہ میں کتنی مدد و معاون ہو سکتی ہیں۔

یہ تو صرف ایک پہلو ہے اس دانشورانہ عقوبت گاہ کا جسے عرف عام میں آج یونیورسٹی کا نام دیا جاتا ہے ورنہ اصل صورت حال کہیں سنگین تر ہے۔ علم و تحقیق کی آزادانہ روایت کیسے قائم ہو جبکہ دل و دماغ پر تراشیدہ اوہام و اساطیر کے پہرے سخت ہوں۔ اب اگر ان دانش گاہوں کا نوحہ گاہے بہ گاہے خود ان ہی اداروں کے اندر سے سنائی دیتا ہے تو دراصل یہ وہ چند سعید، باغی اور بیدار مغز نفوس ہیں جنھوں نے مشکل ترین حالات میں بھی غور و فکر اور تنقید و محاکمہ کا کام جاری رکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مغرب کی اعلیٰ دانش گاہیں عالم نزع میں مبتلا ہیں۔ اب ان کی حیثیت ان منارۂ نور کی نہیں جن سے انسانیت رہنمائی حاصل کرے بلکہ تجارتی اداروں کی سروس انڈسٹری کی ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ اب صرف ڈزنی، ان ٹیل، مایکروسوفٹ اور ان جیسی دوسری کمپنیوں کے لیے ان کی فرمائش اور ضرورت کے مطابق افرادی قوت پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ بلکہ تحقیق و اکتشاف کا عمل بھی متمول سرمایہ کاروں کی خواہشات کا تابع ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسا اس لیے کہ تجارتی اداروں کی ایماء اور ان کی کفالت پر یونیورسٹیوں میں تحقیقی منصوبوں کی تعداد مسلسل بڑھتی جارہی ہے جس نے یونیورسٹی کے غایت و اہداف کو بڑی حد تک بے رحم سرمایہ داروں کی آرزوؤں کا تابع مہمل کر دیا ہے۔

اب جو لوگ یونیورسٹی کو اس کے اصل فریضۂ منصبی کے ساتھ پھر سے متصور کرنا چاہتے ہیں اور جو یہ چاہتے ہیں کہ اسے انیسویں صدی کے مغربی اوہام و تصورات سے نجات دلائیں، آزادانہ اور منصفانہ غور و فکر کی ریت پھر سے قائم ہو، ان کے لیے لازم ہوگا کہ وہ گزشتہ دو ڈھائی سو برسوں میں وجود میں آنے والے علوم کا کمالِ احتیاط اور عرق ریزی سے محاکمہ کریں۔ یہی وہ عہد ہے جب ہم سیادت کے منصب سے غائب رہے۔ مغرب جو صدیوں سے ہمارا متبع اور حریف چلا آتا تھا اس نے ہماری سیاسی مغلوبی سے فائدہ اٹھا کر تاریخ کو از سر نو لکھنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے تئیں بڑی ہوشیاری سے ہمیں اس تاریخ سے محروم کر دیا جو ہمیں ہماری اصل حیثیت پر مطلع کرتی اور آخری رسول کی امت کی حیثیت سے ہمارے تاریخی کلیدی رول کے سبب ہمیں ایک نا قابل شکست اعتماد سے معمور رکھتی۔ استعمارانہ عزائم کے جواز اور سفید فام اقوام کی عالم گیر لوٹ کھسوٹ کو اعتبار بخشنے کے لیے علوم کی صنعتیں کام پر لگا دی گئیں۔ اس عمل پر کوئی دو ڈھائی صدیاں گزرنے کے بعد آج مغرب اپنی ہی تعمیر کردہ دانشورانہ عقوبت گاہ میں محصور ہے۔ اس صورتِ حال کو بدل ڈالنے کے لیے اب تک گاہے بہ گاہے جو صدائے احتجاج سنائی دیتی رہی ہے، وہ بڑی مضمحل ہے۔ اب یہ ہم اہل مشرق کا فریضۂ منصبی ہے کہ علمی روایت کے تاریخی اور فطری امین ہونے کے سبب اور اس سبب کہ رہتی دنیا تک اقوامِ عالم کی رشد و ہدایت کا کام ہم سے لیا جانا ہے، ہم تاریخ کے اس نازک اور فیصلہ کن لمحے میں اس علمی روایت کی تطہیر کا کام اپنے ہاتھوں میں لیں۔

یاد رکھئے! جس فکری پیراڈائم نے مسائل کو جنم دیا ہو اس پیراڈائم میں یہ قوت نہیں ہوتی کہ وہ ان مسائل کا ازالہ بھی کر سکے۔ استعمارانہ عزائم اور بے رحم سرمایہ داری نے علوم اور ٹیکنالوجی کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا تا آنکہ غور

وفکر کے مغربی سانچے پامال اور پراگندہ ہوگئے۔ ساری دنیا پر سرمایہ داری کا مذموم شکنجہ سخت ہوتا گیا۔ ٹیکس کے جبری نظام میں فرد کی آزادی سلب ہو کر رہ گئی۔ ماحولیات کی تباہی اور اشیائے خورد ونوش کی حریصانہ تقلیب وتمسیخ کے سبب فرحت بخش غذا کا حصول مشکل ہوگیا۔ اب اس مسخ شدہ علمی ادارے سے یہ توقع کرنا کہ وہ ان مسائل کے حل میں ہماری مدد کرسکیں گے، پرلے درجہ کی سادہ لوحی ہوگی۔ ان کے پیش کردہ حل مزید مسائل کو جنم دیں گے۔ ہر حل دراصل ایک نئی مشکل کا آغاز ہوگا۔ ایسا اس لیے کہ یہ دانش گاہیں پرانے پیراڈائم سے باہر آکر سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ دینی اداروں یا مدرسہ کو مجہلہ قرار دینے کا فیشن تو عام ہے لیکن جدید دانش گاہوں کی بند دماغی اور ان کے برپا کردہ ماحولیاتی فساد، معاشی بحران اور سیاسی جبر کی طرف ہماری نگاہیں کم ہی اٹھتی ہیں۔ مدرسوں پر اگر تقلید یونان اور تقلید آباء کا ماحول طاری ہے تو مشرق کی جدید یونیورسٹیاں بھی مغرب سے آنے والی ہر آواز کو بمنزلہ وحی سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اوّل الذکر جدید دنیا سے بے تعلق اور عضو معطل ہو کر رہ گئے ہیں تو ثانی الذکر کی چہل پہل کارپوریٹ کی فدویانہ خدمات کے دم سے قائم ہے۔ ایک نئی صبح کے قیام کے لیے لازم ہے کہ ہم قدیم وجدید سے ماوراء اور شرق وغرب کے تعصّبات سے دامن بچاتے ہوئے ایک ایسی دانش گاہ کا ڈول ڈالیں جو مروّجہ فکری پیراڈائم کے استرداد پر قائم ہوئی ہو اور جہاں ایک نئی شروعات کے لیے سیاسی، نفسیاتی، جغرافیائی، نسلی اور قومی مزاحم انتہائی کم پائے جاتے ہوں۔

ذرا غور کیجیے! عالمی سیادت سے مسلمانوں کے مؤثر انخلاء پر ابھی دو ڈھائی صدیاں گزری ہیں اور علامتی عثمانی خلافت کے غیاب پر ایک صدی بھی مکمل نہیں ہوئی ہے لیکن اس مختصر عرصہ میں انسانوں پر کون سی افتاد ہے جو نہ گزری ہو۔ جب سے اقوام یورپ کو سیادت کے مرکزی اسٹیج پر مؤثر رول ادا کرنے کا موقع ملا ہے چہار دانگ عالم میں ظلم واستبداد کے سایے مسلسل گہرے ہوتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کولمبس جس کے بحری سفر کا رومانوی تذکرہ ہم بڑے شوق سے سنتے آئے ہیں، اس کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھی کہ صلیبی طالع آزماؤں نے وسائل کے حصول میں صرف پچاس سالوں کے اندر نئی دنیا امریکہ کی اسّی ملین کی مقامی آبادی میں سے ستر ملین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ سولہویں صدی میں میکسیکو کی آبادی پچیس ملین نفوس پر مشتمل تھی جو اس صدی کے اختتام تک صرف ایک ملین ہو کر رہ گئی۔ ان نوآبادیات میں جبراً مزدوری کے لیے سیاہ فام افریقی باشندوں کو غلام بنایا گیا۔ دنیا کے مختلف حصوں میں سفید فام یوروپی اقوام نے تہذیب کی اشاعت کے نام پر عمومی لوٹ کھسوٹ کا وہ بازار گرم کیا اور اتنے بڑے پیمانے پر تہذیب و معاشرت کو تلف کیا کہ منظم نسل کشی کی ایسی تصویر انسانی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ مصیبت یہ ہوئی کہ مہذب دنیا کا کوئی قابل ذکر خطہ اس جارحیت سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اب تک انسانی تہذیب نے فرحت بخش زندگی جینے اور بقائے باہم کے جن امکانات کی تشکیل وتزئین کی تھی اور جس کے سبب جاوا، سماترا سے لے کر مراکش کے ساحلوں تک بحر اوسط کے دونوں طرف اور خود جزیرہ ہائے یورپ میں تہذیب کا جو مشترکہ قالب تشکیل پایا تھا، استعمارانہ کاسہ لیسیوں نے وہ سب کچھ

تباہ کر ڈالا۔ لہلہاتے کھیتوں اور سرسبز و شاداب علاقوں کے حصول کے لیے انسانوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کا کچھ اس منظم طریقے سے شکار کیا کہ بعض نسلیں صفحۂ ہستی سے معدوم ہوگئیں۔ اتنے بڑے پیمانے پر تہذیب کی تاراجی کے خلاف بجا طور پر توقع کی جاتی تھی کہ مغرب کے باضمیر انسانوں کی طرف سے اس صورت حال پر ایک عمومی بغاوت کی کیفیت جنم لے گی، مگر مصیبت یہ تھی کہ جن لوگوں نے جنگ و غارت گری کو مسلسل تجارت کی شکل دے رکھی تھی انھوں نے کمالِ عیاری کے ساتھ علمی اور تحقیقی اداروں کی موثر تقلیبِ فکری کر ڈالی تھی۔ اور جیسا کہ ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں مغرب کی جامعات کا بنیادی فریضہ اب اس رزمیہ کی تشکیل اور اس کی تقدیس کا نغمہ گانا تھا جس کے مطابق اقوام مغرب سیادتِ عالم کے فطری سزاوار بتائے گئے تھے۔ مغرب میں یونیورسٹی کی یہ تقلیبِ فکری نہ صرف یہ کہ اس منارۂ نور کی تباہی کا سبب ہوئی جو نازک بحرانی لمحات میں اقوامِ مغرب کی گمرہی کا مداوا کرسکتی تھی بلکہ مسلمانوں کے عالمی افق سے غیاب کے سبب پوری دنیا پر ایک نئے عہد ظلمت کے طلوع کا سبب بھی بن گئی۔

نئی ابتدا کے لیے لازم ہے کہ ہم اس نکتہ سے پوری طرح آگاہ ہوں کہ یونیورسٹی کا فریضہ محض تعلیم و تعلّم یا تحقیق و اکتشاف نہیں بلکہ اس تصورِ حیات کو زندہ و تابندہ رکھنا بھی ہے جس میں تمام اقوامِ عالم کی یکساں فلاح و بہبود کے امکانات پائے جاتے ہوں۔ یونیورسٹی کی حیثیت ایک ایسے نشان راہ کی ہے جو ہمیں اس بات پر مسلسل مطلع کرتی رہتی ہے کہ آگے تاریخ کا سفر کن سمتوں میں طے پانا ہے۔ قرآنی دائرۂ فکر کی حامل یونیورسٹیاں ضروری نہیں کہ صرف مسلم معاشروں میں پائی جائیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ آج یہ ممکن ہوسکا ہے کہ مغربی اور سرمایہ دارانہ تصورِ حیات کی حامل جامعات مسلم معاشروں میں متحرک رہیں اور ان کی نظری اجنبیت کا کسی کو احساس بھی نہ ہو۔ عہد وسطیٰ کے یورپ میں جہاں تعلیم و تعلّم کا نظم اور کتاب کائنات پر غور و فکر کی قرآنی روایت نے یورپ کی یونیورسٹیوں کے قیام اور استحکام میں کلیدی رول انجام دیا تھا وہاں کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ تحقیق و اکتشاف کی یہ روایت دراصل مسلمانوں کی علمی ثقافت کا توسیعہ ہے اور یہ کہ اس کی جڑیں وحی ربانی کے صفحات میں پائی جاتی ہیں۔ آج بھی جو لوگ ایک نئی یونیورسٹی کا ڈول ڈالیں گے انھیں اس بات کا خاص طور پر التزام کرنا ہوگا کہ یونیورسٹی کی بنیاد اس تصورِ حیات پر رکھی گئی ہو جس سے قرآن کی دعوتِ تسخیر و اکتشاف عبارت ہے۔ ایک آفاقی، الہامی اور زندگی بخش تصورِ حیات کے بغیر قائم کی جانے والی ہر دانش گاہ خواہ وہ اپنے مظاہر میں کتنی ہی خیرہ کن کیوں نہ ہو اور وسائل کی بہتات نے اس پر زندگی کا کتنا ہی دبیز ملمع کیوں نہ چڑھا دیا ہو ان کی اصل حیثیت روح سے خالی نالج انڈسٹری سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ شرقِ اوسط کی بیشتر دانش گاہیں جو اس معصوم اور موہوم توقع کے ساتھ قائم کی گئی ہیں کہ شاید اس طرح چشم زدن میں علوم کی کھیتی لہلہا اٹھے اور ایک بار پھر عالم اسلام اپنے سابقہ علمی تفوق کے عہد میں واپس آجائے، اگر روزِ اوّل سے ایک طرح کی بے نشاطی میں مبتلا ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں یونیورسٹی کے تمام لوازم کے ساتھ مغربی ذہن اور مغربی تصورِ حیات بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر درآمد کر لیے گئے ہیں۔ کہیں

شوقِ سیادت اور کہیں جوشِ اصلاح میں یہ نکتہ یکسر نظر انداز ہو گیا ہے کہ ہر شخص بنیادی طور پر ایک تاریخی اور ثقافتی شخصیت بھی ہوتا ہے۔ تصورِ حیات کی تبدیلی کے ساتھ ہمارے خواب بھی بدل جاتے ہیں۔ ایک مہذب شخص کی فطرت ثانیہ اس تہذیب سے تشکیل پاتی ہے جس کا وہ پروردہ ہوتا ہے، گویا فرد کے خواب کا یونیورسٹی سے رشتہ بہت گہرا ہے اور اس بات میں کچھ حرج بھی نہیں کہ بے رحم امریکی ثقافت اور جابر سرمایہ دارانہ نظام کے پروردہ امریکی دانشور کا خواب مسلمان عالم سے یقیناً مختلف ہونا چاہئے۔ ہمیں یہ بات بھی سمجھنی ہوگی کہ علمی روایت خریدی نہیں جاتی اور نہ ہی کرایے کے مشیر کسی قوم کو سیادت جیسے منصب عظیم کے لیے تیار کر سکتے ہیں، بلکہ اندیشہ ہے مبادا مغرب کی دانش گاہوں کو جوں کا توں برآمد کر لینا خود ہمارے خواب کی تبدیلی کا سبب نہ بن جائے۔

دائرۂ فکر اگر محفوظ و مامون ہو اور اہدافِ زندگی اگر واضح ہوں تو تحقیق و اکتشاف کی نئی دنیا آباد ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ ماضی میں ہماری دانش گاہوں نے تمام التباسِ فکر و نظر کے باوجود اگر تہذیب انسانی کے سفر کو آگے بڑھانے میں مؤثر رول ادا کیا ہے تو اس کا سبب یہی تھا کہ ہم اپنے نظری اور دینی فریضۂ منصبی کی رفعتوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ آج بھی اگر ہمارے خواب ہمیں واپس مل جائیں تو ہماری دانش گاہیں شوقِ جستجو کی نئی آماجگاہ بن سکتی ہیں، پھر ہمیں مروّجہ نظامِ تعلیم کو جوں کا توں برآمد کرنے، علوم کو خانوں میں تقسیم کرنے اور طالب علموں کے دماغوں کو مغربی اقدار اور ان کی ہیبت علمی سے مملو کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ ہمیں اس حقیقت کا ادراک جتنا جلد ہو جائے بہتر ہے کہ یونیورسٹی کا موجودہ نظام جہاں علوم کی زمرہ بندی اور تقسیم یک رخے علما کو جنم دینے کا باعث بنی ہے وہیں داخلے اور امتحانات کے مروجہ میکانیکی نظام میں غیر معمولی اور عبقری صلاحیتیوں کے نمو پانے کا امکان معدوم ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ سارا نظام ایک طرح کی mediocrity کے لیے تشکیل دیا گیا ہے جو فارغین کو سرمایہ دارانہ نظام کے میکانیکی کل پرزوں سے کچھ زیادہ تسلیم نہیں کرتا۔ پھر یہاں ایسے لوگوں کے لیے گنجائش کیسے نکل سکتی ہے جو اس تعلیمی نظام کی خامیوں کے اعلان کے ساتھ ہی اس کی بساط لپیٹنے کا عملی اقدام بھی کر سکیں۔ نئی مجوزہ دانش گاہ کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک ایسا تعلیمی نظام وضع کرے جہاں عبقری دماغ اور شوقِ جستجو سے معمور و مضطرب طلباء اپنے غایت و اہداف کے حصول کا وافر امکان پائیں۔

دائرۂ فکر کی حفاظت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نئی یونیورسٹی کسی مولویانہ معتقدات کی حامل ہو، جیسا کہ مسالک کی دانش گاہیں اپنے اساتذہ اور طلباء سے خاص مسلکی فکر کے فروغ و استحکام کی توقع کرتی ہیں یا جیسا کہ کیتھولک یونیورسٹی کے مؤسسین ایک طرح کی moralizing کو فریضۂ منصبی جانتے ہیں۔ بلکہ اس سے مراد ایک ایسے صحت مند ماحول کی تشکیل ہے جہاں طالب علم خود اپنی زندگی کے غایت و اہداف کو طے کرنے کے لیے آزاد ہو۔ خدا کی کائنات میں امین کائنات کی حیثیت سے وہ اپنے لیے کس رول کو پسند کرتا ہے یہ طے کرنا خود اس کا کام ہے بلکہ اسے اس بات کی بھی اجازت ہونی چاہئے کہ وہ قرآنی تحریک اکتشاف کے غایت و اہداف کی از سر نو تعبیر کر سکے۔ گویا تعبیرات کے محاکمہ کا کام مسلسل ایک عمل

ہو۔ یہی طریقہ ہے دائرۂ فکر کی حفاظت کا اور زندگی کو نئی رفعتوں سے مسلسل آراستہ کیے رکھنے کا۔

علم جب تک میکانیکی درس گاہوں کی دست و برد سے محفوظ تھا، مسجد سے رصدگاہ تک اور کتّاب سے فقہاء و محدثین اور قصاص کی مجلسوں تک ایک ہی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو مرصع کرنے کا عمل جاری رہتا۔ طبیب اور ادیب، فقہاء و سائنس داں، قسمت آشنا اور فلک شناس سبھوں پر قرآن مجید کے بنیادی مطالب اور معاشرے کے غایت و اہداف واضح ہوتے۔ آیاتِ کائنات جملہ علوم کی روشنی میں مطالعہ کی میز پر ہوتی۔ تب علم کا حصول ایک طرح کی طمانیت قلبی عطا کرتی۔ **انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء** کی یہ عمومی فضا علوم کی وحدت کی پیدا کردہ تھی۔ یہ کہنا کہ وہ عبقری شخصیات کا زمانہ تھا جب یونان سے لے کر سولہویں صدی تک کے عالم اسلام میں ایک ہی شخص طبیب بھی ہوتا تھا اور فلسفی بھی، فقیہ بھی ہوتا تھا اور کیمیا گر بھی، موقیت بھی ہوتا تھا اور ماہر فلکیات بھی، دراصل عہد حاضر کے انسانوں کی تحقیرِ بے دلیل ہے۔ کانٹ کی اصطلاحِ مستعار میں اسے 'self-imposed immaturity' میں مبتلا کرنا ہے اور شاید یہ سب کچھ اس لیے کہ وہ اپنی اصل حیثیت اور امکانی صلاحیت سے ناواقف سرمایہ دارانہ نظام کے کل پرزے کی حیثیت سے کام پر لگا رہے۔ نئی مجوزہ یونیورسٹی کو موجودہ یونیورسٹیوں میں پائی جانے والی ناآگہی کی اس فضا کو ختم کرنے کے لیے مؤثر منصوبہ بندی کرنی ہوگی، جبھی یہ ممکن ہے کہ ہماری دانش گاہوں سے ذہنی نابالغوں کی فوج ظفر موج نکلنے کے بجائے ایسے عبقریوں کی نسل نکل سکے جو فکر و فن کی دولت سے آراستہ ہوں، جو قائدانہ اعتماد سے سرشار دنیا کو بدل ڈالنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ پیشہ ورانہ کورسز کے فارغین جو ناآگہی اور ذہنی نابالغی کے سبب زندگی کے اعلیٰ غایت و اہداف کا ادراک نہیں رکھتے اور جو حقیر منفعت کے عوض اپنی زندگیوں کو بین الملکی کمپنیوں کے ہاتھوں بیچنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں، ان کے مقابلے میں وہ لوگ جو اس مکروہ نظام کی مکاریوں سے واقف ہوں اور جنھیں اپنی زندگی کی اصل قیمت اور بے پناہ امکانات کا احساس ہو وہ یقیناً اس صورت حال کو ٹھنڈے پیٹوں نہیں برداشت کرسکتے۔ نئی دانش گاہ کو ایسے علماء تیار کرنے ہوں گے جو صحیح معنوں میں polymath یعنی شیخ الکل ہوں۔ ایک ایسا نصاب تعلیم وضع کرنا ہوگا جو طلباء کو زوال پذیر سرمایہ دارانہ نظام کا آلہ کار بنانے کے بجائے انھیں نئی تبدیلیوں کے لیے مرصع (empower) کرسکے۔

مجوزہ یونیورسٹی کو مستقبل شناس اور زندگی آشنا ہونا چاہئے۔ اس کی حیثیت ایک منارۂ نور یا قبلہ نما کی تو ضرور ہو، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کے فارغین اخلاقی وعظ و نصائح تک خود کو محدود رکھیں یا آگہی کا زعم انھیں بسم اللہ کے گنبد میں محصور کردے۔ ہم کوئی عالمِ خیال قائم کرنے نہیں اٹھے ہیں اور نہ ہی ہمارا کام کسی غیر عملی utopia کی تشکیل ہے۔ ہم تو اس دائرۂ فکر کی ازسرنو تشکیل کے لیے کوشاں ہیں جس نے نزول قرآن کے بعد ایک علمی اکتشافی تحریک کو جنم دیا تھا اور جس کے سبب متبعین محمدؐ کے ہاتھوں میں تاریخ کی لگام تھما دی گئی تھی۔ قرآنی دائرۂ فکر میں ایک نئی یونیورسٹی کا قیام عہد وسطیٰ کے ماحول کو پھر سے متصور کرنا ہرگز نہیں بلکہ نئی بدلی ہوئی صورت حال میں اقوامِ عالم کو نشاط انگیز زندگی سے آشنا کرنا ہے اور یہ

تب ہی ممکن ہے کہ جب مجوزہ یونیورسٹی اپنے اطلاقی اور عملی ہونے کا احساس دلا سکے۔ مثال کے طور پر کھانا، کپڑا اور مکان کی بنیادی ضرورتوں کو لیجیے۔ فرحت بخش غذا جسے اب organic food کا نام دیا گیا ہے اور جو اب عام انسانوں کی دسترس سے باہر ہے، اس کی عمومی دستیابی کے امکان کو تحقیق و تجزیہ کا موضوع بنانا ہوگا۔ اب تک قدیم، فرسودہ، زوال زدہ سرمایہ دارانہ تہذیب کے انجینئر بلند بالا عمارتوں اور فلک بوس ٹاوروں کی تعمیر کو اپنے فن کی معراج سمجھتے رہے ہیں۔ انھیں اس بات کا چنداں اندازہ نہیں کہ آنے والے دنوں میں جب توانائی کی فراہمی مشکل ہوتی جائے گی اور جب توانائی کا کثرتِ استعمال ماحولیات کی تباہی پر منتج ہوگا اور بالآخر ہم توانائی کے بے مہابا استعمال سے خود کو روکنے پر مجبور پائیں گے، اس وقت یہ متروک فلک بوس عمارتیں آثار قدیمہ کا منظر پیش کریں گی۔ جو لوگ آج بھی اسی طرز تعمیر کے تعلیم و تعلّم میں مصروف ہیں وہ یقیناً ایک فرسودہ طرز فکر کے نقیب ہیں۔ اس کے برعکس مستقبل آشنا منصوبہ سازوں کی تمام تر توجہ اس امر پر ہونی چاہیے کہ توانائی کے کم سے کم استعمال اور ماحولیات کی آلودگی کے بغیر ایسے رہائشی منصوبے کیسے تشکیل دیے جائیں جو فطرت سے اپنی ہم آہنگی کے سبب جنت ارضی کا سماں پیش کرتے ہوں۔ مستقبل کی نشاط انگیز زندگی کا یہ نقشہ اس وقت تک ترتیب نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ ماحولیات، انجینئرنگ، علم الارض، آرکیٹیکچر، الیکٹرانکس، ایگریکلچر اور عمرانیات کے علماء یا مخزن العلم (Polymath) شخصیتیں اس منصوبے میں مشترکہ حصہ نہ لیں۔ ازمنۂ قدیم سے ہم فطری توانائی کے مختلف ذرائع استعمال کرتے آئے ہیں۔ ونڈمل، واٹرمل ماحولیاتی ہم آہنگی کے باوجود ہماری ضرورتوں کی کفالت نہیں کر سکتے۔ اٹامک انرجی کے بعد اب فیوجن انرجی کے حصول کی جدوجہد جاری ہے۔ یہ بات طے ہے کہ مستقبل میں جو توانائی کے ماخذ کو کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں ہوگا اسے یہ اختیار بھی حاصل ہوگا کہ وہ اقوامِ عالم کی ترجیحات کو متعین کر سکے۔ مجوزہ یونیورسٹی کو اس قسم کے علمی چیلنج کو قبول کرنا ہوگا تاکہ وہ جدید دنیا میں ہونے والی مختلف تحقیقات کے مالہ و ماعلیہ کا قرار واقعی جائزہ لے کر قائدانہ اقدامات کر سکے۔ ہم کسی متبادل military-industrial-complex کے قیام کے لیے نہیں اٹھے ہیں لیکن ہم اس نکتہ سے ناآگاہ بھی نہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں جن لوگوں نے اقوامِ عالم کی قیادت کی ہے ان پر اس آیت قرآنی **وانزلنا الحدید فیها بأس شدید** کا مفہوم خوب واضح تھا۔ ہم جب تک بی-۵۲ بمبار طیاروں، ڈرون حملوں اور ان جیسی دوسری حربی ٹیکنالوجی کے مؤثر دفاع کا سامان نہیں کرتے یا ان کے متبادل اور مقابل اسلحوں کی ایجاد پر قادر نہیں ہوتے، سیاسی محکومی اور ذہنی غلامی ہمارا مقدر رہے گی۔ کرایے کے دانشور اور تنخواہ دار علمی مشیر ہمیں زیادہ سے زیادہ جا لینے (catch-up) کی نفسیات میں مبتلا رکھ سکتے ہیں۔ یہاں معاملہ ان تک پہنچنے کا نہیں بلکہ ان پر سبقت لے جانے کا ہے۔ اس عمل میں وہ ہرگز ہمارے معاون نہیں ہو سکتے، اس کے لیے تو ہمیں از خود اقدامات کرنا ہوں گے۔